February
2026

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

5 فروری
یومِ یکجہتی کشمیر

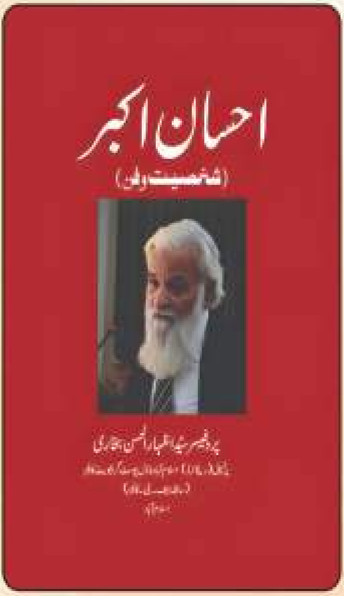
احسان اکبر
(شخصیت و فن)
پروفیسر سید اظہار الحسن بخاری

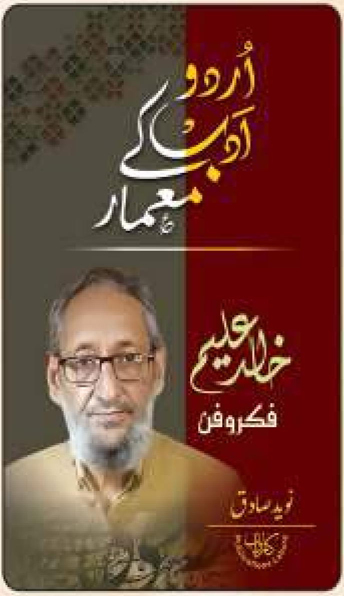
اُردو ادب کے معمار
خالد علیم
فکروفن
نوید صادق

تیرے شہرِ وصال میں
افضال نوید

کویت میں اُردو

دریوزہ

باسطِ رزقِ گدایانِ رضا سے مانگا
ہم نے جو مانگا فقط اپنے خدا سے مانگا

ہر نفس ولولۂ و حوصلۂ مدحِ رسول
رافعِ تذکرۂ خیر ورا سے مانگا

قاسمِ بحر و بر و ارض و سما کے صدقے
مالکِ بحر و بر و ارض و سما سے مانگا

دستکیں دی ہیں درِ کعبہ سے تا بابِ ندیم
لہجہ لیکن سببِ صوت و صدا سے مانگا

جاں حقِ نور و نمِ ارض و سما سے مانگی
دل حقِ آیۂ لولاک لما سے مانگا

نور تک تیرگیِ گوشۂ گمنامی میں
واسعِ روزنِ زندانِ انا سے مانگا

لاج رکھتا ہے، وہ پھیلے ہوئے ہاتھوں کی سدا
جب بھی مانگا ولیِ اہلِ حیا سے مانگا

ضامنِ مغفرتِ مادرِ خالد احمد
دیکھئے کیا؟ سببِ آلِ عباؑ سے مانگا

ہاتھ دیکھا تو وہ، ہیں جن میں ہوا کی باگیں
ہاتھ مانگا، مگر ادبار کشا سے مانگا

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL | Freight Forwarding | Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 37083901-9
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5252311 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 34 - فروری 2026 - شمارہ نمبر: 2

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: بیثم عمران
کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: یوم یکجہتی کشمیر
قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700
فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517
Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر و پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر زعفرانیہ ٹاؤن اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سرور حسین نقشبندی	7
2	نعت	محمد یٰسین قمر، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، اکرم ناصر، نورین طلعت عروبہ، نبیل احمد نبیل، سرور حسین نقشبندی، صغیر احمد صغیر	8 تا 15
3	عقیدت	محمد انیس انصاری، فیض رسول فیضان، مرزا آصف رسول، دلشاد احمد	16 تا 19
4	رباعیات	محمد نصیر زندہ، سعید اشعر	20 تا 21
5	افسانے	حامد یزدانی، سید تحسین گیلانی، رانا محمد شاہد، بابر ایمن ابر، عمار نعیمی، غضنفر مہدی، ارم شہزادی، لائبہ خلیل، خالد نذیر، محمد علی راحیل خان، ناز اکاوڑی، نعمان منظور	22 تا 66
6	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، نسیم سحر، سید ریاض حسین زیدی، محمد انیس انصاری، راحت سرحدی، گلزار بخاری، شریف ساجد، قیوم طاہر، سعد اللہ شاہ، یعقوب پرواز، رضا اللہ حیدر، اکرم ناصر، افتخار شاہد، احمد جلیل، عقیل رحمانی، اقبال ناظر، عاصم بخاری، رانا سعید دوشی، رخشندہ نوید، شوکت محمود شوکت، نبیل احمد نبیل، فیض رسول فیضان	67 تا 122

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
6	غزلیں	خالدہ انور، محمد افضال انجم، منظر اعجاز، آصف خیال افتخار الحق، اصغر علی بلوچ، ظہور چوہان، افضل ہزاروی محمد نوید مرزا، نبیل قیصر، سرور فرحان، اکرم جاذب محمد اشفاق بیگ، راجہ عبدالقیوم، بشیر احمد حبیب، محمد کلیم رانا دلشاد، علمدار حسین، شاہ روم خان ولی، اسد رضا سحر سید تیمور کاظمی، کوکی گل، احمد ساقی، نائلہ راٹھور، نوید عاجز عزیز عادل، عبدالروف زین، جیا قریشی، خالق آرزو ایم اے کاظم، مسکان گل، غضنفر مہدی	67 تا 122
7	مضامین	جلیل عالی، نسیم سحر، اسلام عظمی، محمد حمید شاہد، سلمیٰ اعوان بشیر سیفی، جمیل احمد عدیل، غلام زادہ نعمان صابری، مسعود احمد وحید احمد، ایس ایم معین قریشی، ہارون الرشید تبسم، طارق کامران اسحاق وردگ، پروین سجل، محمد نوید مرزا، علی حسن اویس نعمان حیدر حامی، طاہر عباس ملک، ساجد فراز شاہجہانی، نوید صادق	123 تا 208
8	طنز و مزاح خاکہ	نور کمال شاہ، سیدہ آمنہ ریاض، اعجاز رضوی	209 تا 219
9	نظمیں	خالد احمد، جلیل عالی، سید افسر ساجد، گلزار بخاری محمد انیس انصاری، حامد یزدانی، مسعود احمد، فیاض تحسین علمدار حسین، سید فرخ رضا ترمذی، سمیع اللہ عرفی، خالق آرزو نائلہ راٹھور، بشریٰ شیریں، شبیر آکاش، انوار انجم ایم اے کاظم، محمد عبداللہ ، نعمان منظور	220 تا 241

حمد

پریشاں نبیؐ کی ہے امت زیادہ
ہمیں ہے کرم کی ضرورت زیادہ

تیرا نام پلّو میں باندھا ہوا تھا
لگی ہر جگہ میری قیمت زیادہ

ہمیشہ رہی تیری بندہ نوازی
ہمیشہ ملی ہے محبت زیادہ

بنیں غیب سے کوئی اسباب ایسے
ملے حاضری کی اجازت زیادہ

میں جوں جوں حرم کے قریب آ رہا ہوں
مجھے ہو رہی ہے ندامت زیادہ

تیرے نام لیوا پسے جا رہے ہیں
انہیں بخش دے عزم و ہمت زیادہ

مجھے بولنے کا سلیقہ نہیں ہے
زباں میں مری بھی ہے لکنت زیادہ

فزوں تر ہو شوق عبادت الٰہی
بڑھے ذوق و تقلید سنت زیادہ

زمانے کی ہر ایک نعمت سے بڑھ کر
تیرا ذکر دیتا ہے راحت زیادہ

تیری یاد ہوتی ہے جب ساتھ میرے
سکوں مجھ کو دیتی ہے خلوت زیادہ

ہر اک سانس تیرے کرم سے رواں ہے
نہیں اس سے بڑھ کر حقیقت زیادہ

عطا مجھ کو ہوتی ہے جب حمد سرور
نکھرتا ہے رنگِ طبیعت زیادہ

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

دل کو حفظ و امان میں رکھا
شہرِ محبوبؐ دھیان میں رکھا

آئے ٹھنڈی ہوا مدینے سے
ایک روزن مکان میں رکھا

اسمِ احمد کو اک دیے کی طرح
خانۂ قلب و جان میں رکھا

اُن سے منسوب کائنات مری
ورنہ کیا ہے جہان میں رکھا

جانِ عالم کی نسبتیں دے کر
ذرّے کو آسمان میں رکھا

بخت نے میری دستگیری کی
نعت کے کاروان میں رکھا

اُنؐ کی پیہم عنایتوں نے مجھے
رحمتِ بے گمان میں رکھا

اس عنایت کے دل فدا جس نے
دیدۂ مہربان میں رکھا

مجھ کو آقا نے ہر تمازت میں
لطف کے سائبان میں رکھا

کہہ کے ''خیر الامور اوسطہا''
ہر عمل کو میان میں رکھا

رب نے توصیفِ مصطفیٰؐ کے لیے
نور لفظ و بیان میں رکھا

اُن پہ ایماں کو ربِّ عالم نے
فطرتِ انس و جان میں رکھا

خاک ہو جائیں اُن کی راہوں کی
کیا قمر ہے اڑان میں رکھا

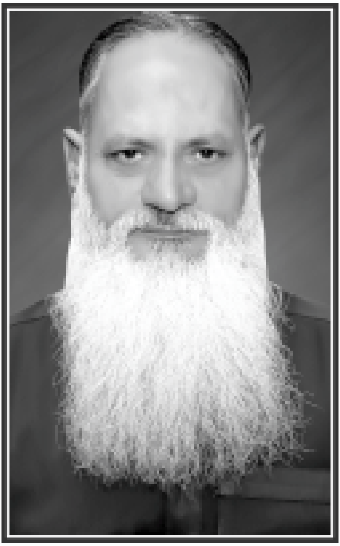

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

شہ ابرار سے الفت خدا سے آشنائی ہے
یہ ترتیبِ مراتب بھی خدا کے ہاں سے آئی ہے

گلستاں کا نظارہ رشکِ جنت کیوں نہ ہو جائے
درودِ پاک پڑھ کر ہر کلی جو مسکرائی ہے

اندھیرا تھا بہت گھمبیر خاموشی کی بستی کا
شہِ لولاک کے صدقے میں یہ منظر کشائی ہے

نگاہِ مصطفیٰؐ کے فیض نے دنیا بدل ڈالی
لگائی ماسوا کو آگ، رب سے لو لگائی ہے

ہوئی ہے منقلب دنیا یہاں پتھر نژادوں کی
یہیں تو سنگ ریزوں نے نرالی شان پائی ہے

نہیں کوئی کمالِ صدق کی خوش تر مثال ایسی
خدا سے جو سنی ہے آپؐ نے سچ سچ بتائی ہے

بفیضِ نعت دیکھا ہے زمیں کا آسماں ہونا
شکستہ خاطر و بے حال نے قسمت بنائی ہے

عقیدت ہو تو پھر لفظوں کو بھی مفہوم ملتا ہے
سطورِ مدح کی خوشبو مرے دل میں سمائی ہے

خدا کے فضل کا حق دار ٹھہرا ہے ریاض ایسا
کمالِ نعت گوئی اس کی جو اعلیٰ کمائی ہے

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

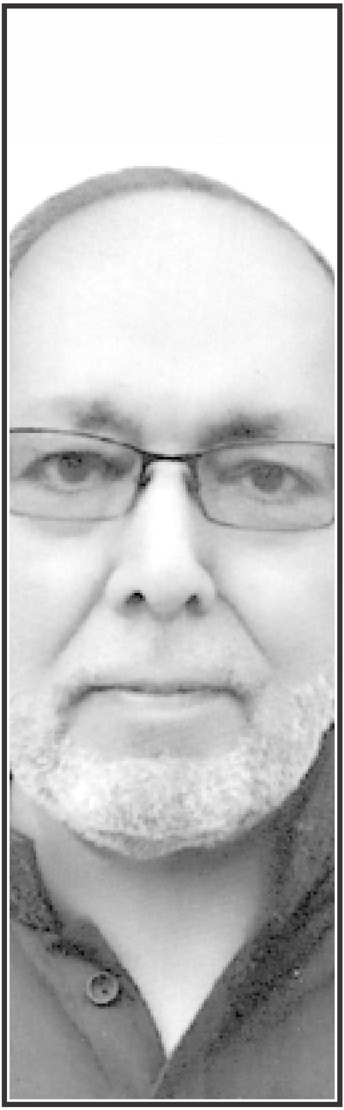

اَور جو کچھ بھی ہے، رکھتا ہوں وہ کم پیشِ نظر
ہر نفس رہتا ہے بس اُنؐ کا کرم پیشِ نظر

کیوں ہو پھر کوئی بھی غم اور اَلم پیشِ نظر
رکھ لیا جب کرمِ شاہِؐ اُمم پیشِ نظر

جو بھی لکھے، وہ فقط آپؐ کی مِدحت میں لکھے
یہی رہتا ہے سرِ نوکِ قلم پیشِ نظر

کیسے چھُو سکتی ہے سورج کی تمازت مُجھ کو؟
دھوپ میں رکھتا ہوں وہ ابرِ کرم پیشِ نظر

تیرگی میری طرف آئے تو کیسے آئے !
مَیں سدا رکھتا ہوں انوارِ حرم پیشِ نظر

ایک ہی پل میں مری چادرِ عصیاں دُھل جائے
آپؐ رکھ لیں جو مری آنکھوں کا نم پیشِ نظر

حاضری دے کے جو آیا ہوں درِ آقاؐ پر
اب نہ ہے فکر کوئی اور نہ غم پیشِ نظر

شہرِ طیبہ میں گزار آیا ہوں کچھ دن جو نسیمؔ
اُنؐ کے ہی رہتے ہیں اب نقشِ قدم پیشِ نظر

نسیمِ سحر

نعتؐ

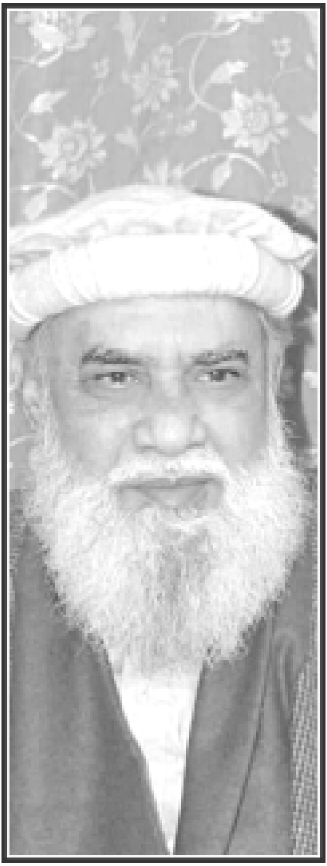

اکرم ناصر

ملیں کبھی تو میں پوچھوں کسی صحابی سے
نوازتے ہیں وہ کب شرف باریابی سے

حضور خواب میں کل انگلیوں کا لمس ملا
وہ انگلیاں تھیں کہ کچھ پھول تھے گلابی سے

پیوں وہ گھونٹ کہ جو آپ کے گلاس میں ہو
لگاؤں لقمہ کبھی آپ کی رکابی سے

حضور دل میں یہی آرزو دھڑکتی ہے
مدینہ پاک پہنچ جاؤں میں شتابی سے

مرے نصیب میں ہو آپ کا اگر پلو
تو پل صراط سے گزروں میں کامیابی سے

کسی حضور کے پیرو سے پوچھنا ہے مجھے
کہ چند مسلکے اکرم ہیں ہم نصابی سے

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

تیرے اوصاف فقط تجھ سے بیاں ہوتے ہیں
نعت خود لکھی ، بہ پیرایۂ سیرت لکھی

نعتؐ

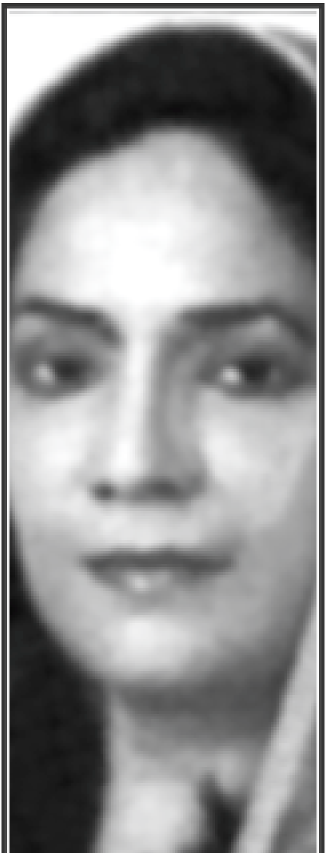

نورین طلعت عروبہ

اور کچھ دن رہے یہ ٹھکانہ مرا
خلدِ طیبہ میں ہو آب و دانہ مرا

گنبدِ سبز سے دم ہے الفاظ میں
یہ بتاتا ہے لہجہ یگانہ مرا

لُولُوئے نعت روضے پہ لے کے چلوں
ساتھ رکھوں دُرُودی خزانہ مرا

آپ کا وصف ہے آپ کی نعت میں
اس لیے رنگ ہے عاجزانہ مرا

یہ کرم مجھ اکیلی پہ تھوڑی ہوا
آپ پر ہے تصدق گھرانہ مرا

میں کہوں جب مدینہ ہے جنت مری
دِل کبوتر کہے آشیانہ مرا

ہر صدی نُور ہے آپ سے اس لئے
فخر میں جی رہا ہے زمانہ مرا

نعتؐ

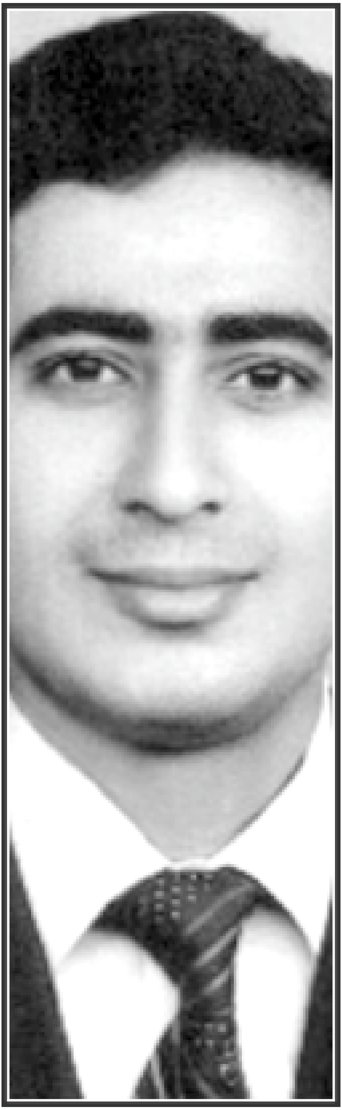

نبیل احمد نبیل

دیتی ہے سہارا مجھے ہر دم تری سیرت
کرتی ہے شبِ غم کو منور تری سیرت

آتی ہے مدد کے لیے رنج ہائے سفر میں
بھٹکے ہوئے راہی کی ہے رہبر تری سیرت

آسودۂ خاطر مجھے رکھتی ہے جہاں میں
ہر لمحہ ہر اک گام برابر تری سیرت

سینہ تری صورت سے درخشاں ہے مسلسل
رہتی ہے مرے دل میں اُجاگر تری سیرت

پھوٹے ہیں ترے ذکر سے اِکرام کے چشمے
دریا ترا کردار ، سمندر تری سیرت

لگتی ہے مجھے جب بھی رہِ درد میں ٹھوکر
دیتی ہے سہارا مجھے اکثر تری سیرت

چلتا ہے نبیل آج اگر سر کو اُٹھا کر
ہے اِس کی تمناؤں کا محور تری سیرت

نعت ؐ

نظر کے روبرو ان کی گلی ہے
جہان رنگ و بو ان کی گلی ہے

انھیں رب کی رضا مل کر رہے گی
وہ جن کی آرزو ان کی گلی ہے

تکے جاتے ہیں اس کو آنے والے
ارم سے خوبرو ان کی گلی ہے

یہاں کا ذرہ ذرہ ماہتابی
جبھی تو ماہ رو ان کی گلی ہے

ہمارا دھیان ہے اسکی ہی جانب
ہمارے چارسو ان کی گلی ہے

کریں گے جستجو ان کی زمانے
وہ جن کی جستجو ان کی گلی ہے

ہمارا فخر ہے اس در پہ آنا
ہماری آبرو ان کی گلی ہے

سبھی کا مدعا ان کا نگر ہے
سبھی کی آرزو ان کی گلی ہے

یہیں عالم کو بٹتے ہیں خزینے
کرم کی آب جو ان کی گلی ہے

پہنچ کر خلد میں عاشق کہیں گے
ارے یہ ہو بہو ان کی گلی ہے

ادب کی انتہا لازم ہے سرور
جہاں پہنچا ہے تو ان کی گلی ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

ایک مدت جو پنہاں رہی روشنی
آپ آئے تو روشن ہوئی روشنی

جس کا تورات و انجیل میں ذکر تھا
جس نے دیکھا کہا ہے وہی روشنی

صرف قوسین کا فاصلہ رہ گیا
اس طرح روشنی سے ملی روشنی

ان کی آمد پہ آتش کدے بجھ گئے
مرحبا جا بہ جا ہو گئی روشنی

جو تھیں بیمار آنکھیں وہ چندھیا گئیں
جب حرا کی طرف سے پڑی روشنی

جس کا صدیوں زمانہ رہا منتظر
آخرش آ گئی آخری روشنی

والضحیٰ آپ یاسین و بدر الدجیٰ
کہکشاں کہکشاں آپ کی روشنی

صغیر احمد صغیر

عقیدت

بہ فیضِ حمد، مجھے کامیاب ہونا ہے
یہی عمل مرا کارِ ثواب ہونا ہے

سوائے عفو و ندامت کے، اور میرے پاس
ترے سوالوں کا واں کیا جواب ہونا ہے

ترے اشارے سے ہوتی ہے شاخِ جاں سرسبز
بُجھا بُجھا ہوا چہرہ، گلاب ہونا ہے

میں اِک درودوں کی تھیلی اُٹھائے پھرتا ہوں
خدایا! کیا مجھے پھر بھی عذاب ہونا ہے؟

میں جب سناؤں گا یہ مختصر کتاب تجھے
اِک ایک حمد کو پوری کتاب ہونا ہے

میں خوش گمان ہوں مولا! درود پڑھتے ہوئے
بروزِ حشر، مرا کیا حساب ہونا ہے

درود ایسی عبادت ہے، رد نہیں ہوتی
درودِ پاک ہی میرا نصاب ہونا ہے

خدایا! سُنتے ہیں، جب ہاتھ پاؤں بولیں گے
بروزِ حشر کڑا احتساب ہونا ہے

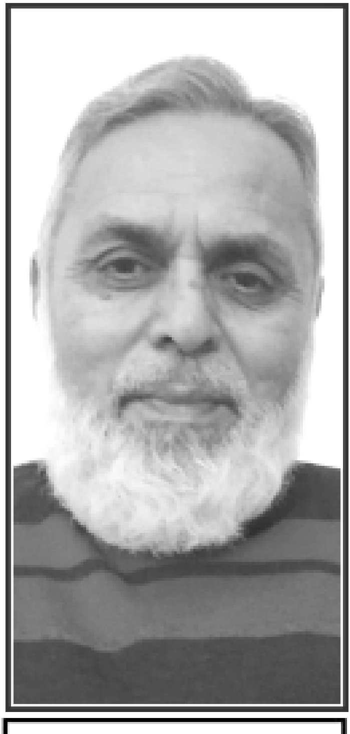

محمد انیس انصاری

عقیدت

اللہ اللہ! مرحبا ، صلِّ علیٰ!
آنسوؤں کے یہ دیئے اِک رات میں

کاتبِ تقدیر ، سرگرمِ عمل
دو جہاں کے فیصلے اِک رات میں

بخششوں کی بارشیں مخلوق پر
جنتوں کے سلسلے اِک رات میں

نارِ دوزخ سے نجاتِ دائمی
مغفرت کے رتجگے اِک رات میں

اُمّتِ مرحوم پر اتنا کرم!
سارے عصیاں دُھل گئے اِک رات میں

ساری راتیں رشک سے تکتی ہوئی
قُدسیاں اُترے ہوئے اِک رات میں

کرب و ذلّت سے بری ہونے کی رات
آبرو کے زمزمے اِک رات میں

رحمتیں ہی رحمتیں ہی رحمتیں
سب درِ جنّت کُھلے اِک رات میں

سال بھر آسودگی ، بالیدگی
صدقِ دل سے جاگئے اِک رات میں

ساعتیں فیضانؔ صدیوں پر محیط
اَن گنت عُقدے کُھلے اِک رات میں

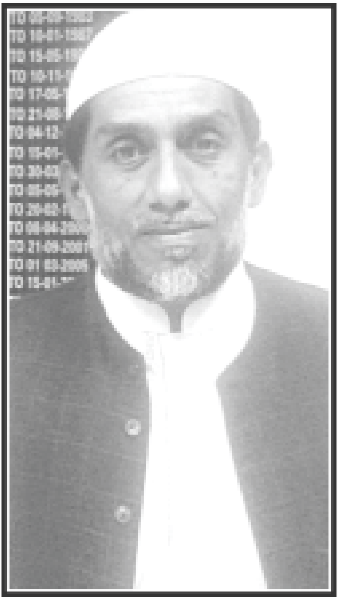

فیض رسول فیضان

شمس الضحیٰ

کریم و قاسم و کہف الوریٰ محمد ہیں
جمالِ جود و کمالِ سخا محمد ہیں

ہم اُس حمید کے حامد ہوں تو ہے وہ محمود
پہ جس کی حمد ہے وہ کر رہا محمد ہیں

وقار عدل و مساوات اُن پہ نازاں ہے
حوالہ عظمتِ انسان کا محمد ہیں

وہ عشق جس سے ثباتِ دل و عمل ہے یہاں
وہ عشق جس نے ہے رہنا سدا محمد ہیں

ہے دل سے پڑھنا جسے لوحِ جاں پہ لکھ لکھ کر
سبق وہ تا بہ ابد عشق کا محمد ہیں

اک آنے والے کی دی ہر پیامبر نے نوید
وہ عہد جو سبھی قوموں سے تھا، محمد ہیں

کتابِ حق میں ہے جسم و جانِ علم و عمل
نصابِ راستی و تزکیہ محمد ہیں

ہے کون حاضر و ناظر؟ خرد نہ دیکھ سکے
نظر ہو عشق تو پھر ہر جگہ محمد ہیں

گواہی دیتے ہیں اغیار بھی کہ سب کے لیے
امینِ صادقِ عہد و وفا محمد ہیں

کسی نظر پہ ہو کیوں رونما؟ وہ حسنِ ازل
کہ جس کا تا بہ ابد آئینہ محمد ہیں

چراغ ظلمتِ شب میں جلے گئے، آصف
پہ عہدِ رُشد کے شمس الضحیٰ محمد ہیں

مرزا آصف رسول

عقیدت

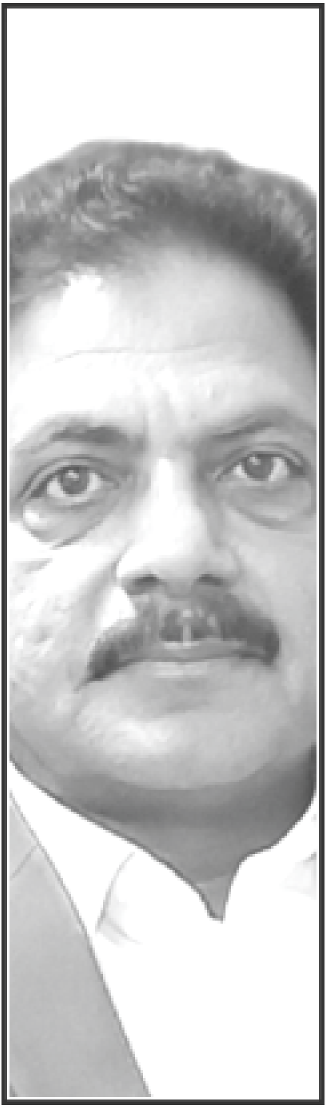

لمحے جو قربِ روضۂ اطہر میں کٹ گئے
سمجھو وہی حیات کی کایا پلٹ گئے

شہرِ حیات تجھ سے بچھڑتے ہوئے ہمیں
ایسے لگا کہ اپنے ہی محور سے ہٹ گئے

دونوں طرف صدائیں تھیں لبیک یا رسول
دونوں ہی ایک دوجے کے ہاتھوں سے کٹ گئے

اک پل کو میری آنکھ میں طیبہ سما گیا
اک پل میں سارے درد کے منظر الٹ گئے

اک بار لب سے اسمِ محمد ادا ہوا
دو بار میرے ہونٹ خوشی سے لپٹ گئے

صلِ علیٰ کے ورد سے تسکینِ جاں ہوئی
بادل تھے جتنے غم کے وہ اک پل میں چھٹ گئے

دلشاد زندگی تو بس اُتنے دنوں کی ہے
جتنے بھی دن حضور کی مدحت میں کٹ گئے

دلشاد احمد

رباعیات

الفاظ سے معنی ہوئے عالی پیدا
ہوتی نہیں اک ہاتھ سے تالی پیدا
افلاسِ تخیل سے اللہ بچائے
ہوتا ہے سخن روح سے خالی پیدا

ہوتی ہے روح کی ہلاکت پیدا
لالچ سے نہیں ہوتی فراست پیدا
جس علم کا مقصود ہو دولت کا حصول
اس علم سے ہوتی ہے جہالت پیدا

کشکولِ شاعر آرزو یاب نہیں
مزدورِ قلم کی آنکھ میں خواب نہیں
لائیں ترے حسن کے برابر کوئی شعر
یہ فن میں مجال علم میں تاب نہیں

چھن جاتا ہے عقل و بصیرت سے شعور
مل جاتا ہے مٹی میں عبادت کا غرور
دولت کا رعب ہو کہ عالم کا جلال
سب ہیچ ہیں تیرے اک تبسم کے حضور

میں خود سے ذرا ہاتھ ملا لوں تو چلوں
گھر سے باہر قدم نکالوں تو چلوں
مطلوب ہے دریا کی روانی مجھ کو
منزل کو میں جادہ بنا لوں تو چلوں

شہنائی کا درد کی صدا ہو جانا
یعنی شادی کا غم ادا ہو جانا
ہوتی ہے جدائی پھول سے خوشبو کی
بیٹی کا باپ سے جدا ہو جانا

دل خفیہ زمانوں کی خبر دیتا ہے
بے موت جہانوں کی خبر دیتا ہے
امید کے زندان میں ہر قیدی خواب
ناگفتہ فسانوں کی خبر دیتا ہے

میں سایہ نوا خامشی کا شور تو بھی
میں خاک نصیب زندہ در گور تو بھی
ابلیس کے لشکری ہیں فاقوں کے کفیل
ایندھن ہیں کسی جنگ کا میں اور تو بھی

محمد نصیر زندہ

رباعیات

ہاتھوں میں دعاؤں کے علاوہ کیا ہے
اطراف صداؤں کے علاوہ کیا ہے
ہر سمت ہوا گھومتی ہے بے مقصد
مجھ میں بھی خلاؤں کے علاوہ کیا ہے

اچھا اچھا بول کے دلجوئی کرو
میٹھا شربت گھول کے دلجوئی کرو
فرقت سے پہلے کسی صورت اس کی
اک بار تو دل کھول کے دلجوئی کرو

بھوکے ہوں تو لوگوں کو برا لگتا ہے
خوش حالی میں غیروں کو برا لگتا ہے
جیسے بھی ہوں حالات ہمارے اب تو
ہر حال میں اپنوں کو برا لگتا ہے

اس بزم میں جانے کی گزارش کی تھی
اک جام پلانے کی گزارش کی تھی
مستی میں گزاریں کبھی ہم بھی کچھ وقت
حوروں سے ملانے کی گزارش کی تھی

گلشن میں ہر سو جاری رہے پھولوں کا رقص
ہوتا رہے میلے میں بھی لوگوں کا رقص
بیزار ہیں فرقت زدہ حالات سے ہم
بے فیض ہمارے لیے حوروں کا رقص

دکھ درد سناتی ہیں پرانی باتیں
جیون کو جلاتی ہیں پرانی باتیں
اکثر مری تنہائی میں ، میں نے دیکھا
اپنوں کو بلاتی ہیں پرانی باتیں

گرمی ہے ابھی تھوڑی سی کھڑکی کھولو
محفل ہے جمی ، تھوڑی سی کھڑکی کھولو
گو شور زیادہ ہے ہمارا اس وقت
خالی ہے گلی ، تھوڑی سی کھڑکی کھولو

ہر بات کو چھوڑو ذرا آنکھیں کھولو
دو لفظ ہی بولو ذرا آنکھیں کھولو
لگتا ہے بہت مجھ سے خفا ہو اشعر
یوں منہ تو نہ موڑو ذرا آنکھیں کھولو

سعید اشعر

دھواں بازی

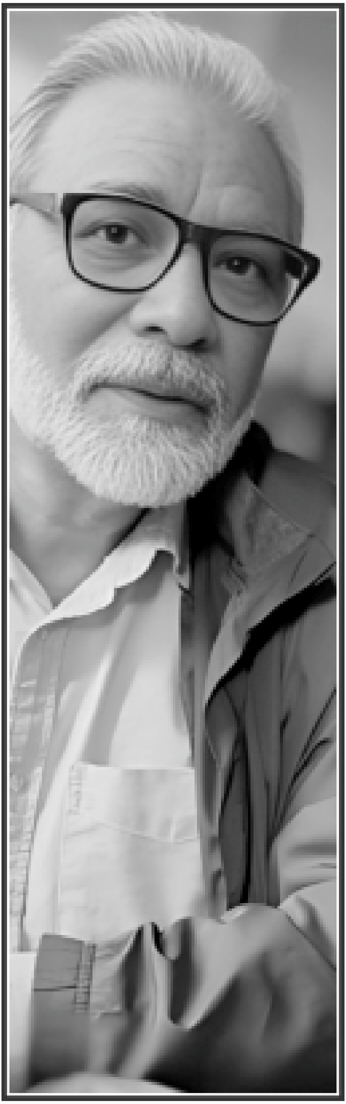

حامد یزدانی

جیسے ہی سبز اور سفید رنگ کی دومنزلہ سرکاری گو ٹرین برلنگٹن کے ایلڈرشاٹ سٹیشن سے ٹورانٹو کے لیے روانہ ہوئی، ڈیوڈ اور ملک اپنی اپنی سیٹ پر جا بیٹھے تھے۔ وہ دونوں ہیملٹن کی میک ماسٹر یونی ورسٹی میں پڑھتے تھے اور ان کی عمریں بیس بائیس برس سے زیادہ نہ رہی ہوں گی۔ ایلڈرشاٹ ریلوے سٹیشن جغرافیائی اور سرکاری طور پر تو شہر برلنگٹن کا حصہ ہے مگر شہر ہیملٹن کے نواحی قصبہ واٹرڈاؤن سے قربت کے باعث اکثر لوگ اسے واٹر ڈاؤن ہی سے منسوب کر دیتے ہیں۔ ہیملٹن کے مغربی کنارے پر واقع میک ماسٹر یونی ورسٹی سے قریب ترین گو ٹرین سٹیشن شاید جان سٹریٹ والا ہی ہے جو شہر کے ڈاؤن ٹاؤن میں واقع ہے اور اچھی بات یہ کہ وہیں قریب سے گو بس بھی مل جاتی ہے مگر ڈیوڈ اور ملک نے ٹورانٹو جانے کے لیے جان بوجھ کر طویل راستہ اختیار کیا تھا۔ ایک تو انھیں ٹورانٹو پہنچنے کی کوئی جلدی نہ تھی اور دوسرے وہ حسبِ عادت چھٹی کے دن کی آوارہ گردی سے لطف اٹھانا چاہتے تھے۔

درجہ حرارت تو اس وقت برا لیکن کم نہ تھا مگر مطلع بھی صاف نہ تھا۔ مطلب یہ کہ دن ویسا

روشن اور شفاف نہ تھا جیسا عام طور سے ہوا کرتا تھا۔ فضا میں دھوئیں اور دھند نے مل کر ایک مہین سی سرمئی چادر تان رکھی تھی۔
یونی ورسٹی سے وہ پیدل ہی ویسٹ ڈیل ولیج پہنچے تھے جہاں اپنی پسند کے ایک ایرانی ریستوران میں انھوں نے لنچ کیا تھا۔ ریستوران کے ساتھ ہی دو مصروف کیفیز میں سے انھوں نے ہر بار کی طرح مقامی کیفے کو مشروبات کے لیے منتخب کیا تھا۔ حالاں کہ دوسرا کیفے جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی ملکیت تھا مقامی کیفے سے کہیں زیادہ مشہور تھا اور کینیڈا اور امریکا کیا دنیا کے لگ بھگ ہر ملک کے بڑے شہر میں اس کی فرنچائزڈ شاخوں پر لوگوں کا ہجوم رہتا تھا مگر وہ دونوں چھوٹے اور مقامی کاروباروں کی حوصلہ افزائی ضروری سمجھتے تھے۔ ملک نے کیفے سے درمیانے سائز کی ٹھنڈی فریج وینلا حاصل کی تھی جب کہ ڈیوڈ نے بڑے سائز کی اس آرگینک ڈی۔ کیف (کافی) کا انتخاب کیا تھا جس کی فروخت سے حاصل شدہ آمدنی میں اس کے کاشت کاروں کو برابر کا حصہ دیا جاتا تھا۔ یہ کمپنیاں 'کارپوریشن' کے بجائے 'کوآپریشن' کی بنیاد پر کاروبار کرتی ہیں۔
اپنے اپنے مشروب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ کیفے سے نکلے تھے اور پیدل ہی جیکسن سکوائر پہنچ گئے تھے جہاں سے انھیں برلنگٹن اور واٹرڈاؤن کے لیے بس مل گئی تھی۔
ان دونوں نے اپنی اپنی جیب سے کارڈ نکال کر خاتون ڈرائیور کے پاس ایستادہ سکرین پر ٹیپ کیا تھا جس پر ڈرائیور نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ انھیں 'تھینک یو' کہا تھا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ بس میں حسبِ توقع زیادہ سواریاں نہ تھیں۔ دھوپ کا چشمہ پہنے خاتون ڈرائیور نے شیشے میں سے ایک نظر بس کی اندرونی صورت حال کا جائزہ لیا تھا اور ڈیش بورڈ پر آویزاں ایک بٹن دبا کر بس کے دونوں خودکار دروازے بند کر دیے تھے۔ پھر باہر کی ٹریفک پر نظر ڈالتے ہوئے بس کو مرکزی سڑک پر ڈال دیا تھا۔ بس فن کاروں کی سڑک یعنی جیمس سٹریٹ سے ہوتی ہوئی کینن اور وہاں سے پارک سٹریٹ کی جانب رواں دواں ہو گئی تھی۔
ہیملٹن شہر اپنے تاریخی دھات کے کارخانوں اور گوروی کے علاوہ اپنی یک طرفہ ٹریفک کے لیے بھی مشہور ہے۔ اس کی ہر دوسری سڑک ون وے ہے۔ ان کی بس پارک سٹریٹ پر دوڑ رہی تھی اور وہ دونوں بھی اکثر دیگر سواریوں کی طرح اپنے اپنے فونز پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ بس کبھی ایک آدھ لمحے کو سر اٹھا کر دائیں بائیں دیکھ لیتے تھے۔ اُن کے دائیں جانب سفید براق تاریخی محل 'ڈنڈرن کیسل' اور بائیں طرف گلابی پھولوں میں گھرا شہر کا قدیم اور وسیع

قبرستان پیچھے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ پھر بس نے اونٹاریو جھیل کی گودی کا پل پار کیا اور تب بس کے دونوں جانب رائل بوٹینیکل گارڈنز کے منفرد پودوں اور رنگا رنگ پھولوں سے لدے باغات ان کی نظروں کے سامنے تھے مگر وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ سموگ نے اردگرد پھیلے منظروں کو کچھ دھندلا سا دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پارک سٹریٹ پلیژر روڈ میں تبدیل ہوگئی اور لاسیل پارک والی سڑک سے بائیں مڑتے ہوئے وہ ایلڈرشاٹ ٹرین سٹیشن پہنچ گئے تھے۔

وہاں ٹرین کا انتظار انھیں زیادہ دیر نہ کرنا پڑا تھا۔ ٹرین پہنچی تو وہ ٹہلتے ہوئے سوچے سمجھے بغیر اس کے پانچویں ڈبے میں سوار ہو گئے تھے حالاں کہ اگلے چار اور پچھلے پانچ ڈبوں میں بھی خال خال ہی کوئی سواری دکھائی دے رہی تھی۔ ڈبے کی نچلی منزل پر طائرانہ سی نگاہ ڈالتے ہوئے وہ اوپر کی منزل پر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے تھے۔ ٹرین کے ڈبے کی بالائی منزل پر ان کے علاوہ چار اور مسافر بیٹھے تھے۔ ایک مرد اور عورت دائیں جانب کی سیٹوں پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے جب کہ ایک ادھیڑ عمر کا مرد اور ایک لڑکی ایک دوسرے سے دور واقع سیٹوں پر براجمان تھے۔ ڈیوڈ اور ملک نے اپنے لیے دائیں جانب کی سیٹیں چنیں اور بیٹھتے ہی پھر سے اپنے اپنے سیل فون کی جانب متوجہ ہو گئے۔

عام طور سے وہ سفر کرتے ہوئے باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے مگر آج باہر دیکھتے بھی تو کیا؟

ٹرین چلنے پر پیچھے کو بھاگتے سرسبز درختوں اور رنگا رنگ خود رو جھاڑیوں کے دل کش مناظر جو انھیں کھڑکی سے باہر دعوت نظارہ دیا کرتے تھے آج دھوئیں اور کہرے میں چھپے ہوئے تھے۔

دھند ڈیوڈ کو تو خاص پسند نہ تھی مگر ملک کو اچھی لگتی تھی۔ دھند میں چھپتے، ابھرتے مناظر اس کے اندر عجب جوش پیدا کر دیتے تھے جیسے بچے کسی جادوگر کے کمالات پر حیرت زدہ ہوتے ہیں مگر یہ وہ دھند نہ تھی، یہ وہ کہرا نہ تھا کیوں کہ سیاہ دھوئیں کی آمیزش نے اسے سُرمئی سا بنا دیا تھا۔ میلی دھند کا پھیلاؤ تھا چار سُو۔ یہ انھیں اپنی یونی ورسٹی اور ویسٹ ڈیل ولیج میں تو اس قدر محسوس نہ ہوا تھا مگر جیسے جیسے ٹرین ٹورانٹو کی جانب بڑھ رہی تھی باہر کی فضا میں کثافت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اب تک خاموش بیٹھے تھے۔ سیل فونز سے مکالمہ جاری تھا۔

ٹرین اوک وِل کے سٹیشن سے آگے بڑھی تو ملک نے اپنا فون بند کر دیا اور قدرے تشویش اور اداسی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

”ڈیوڈ یار، دیکھ رہے ہو نا تم؟ دُور بھڑکتی جنگلوں کی آگ کے دھوئیں کے اثرات یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ ہماری فضا بھی مکدر

ہو کر رہ گئی ہے۔ میرا تو اس آلودگی کو دیکھ دیکھ کر ہی دم گھٹتا ہے۔ اس میں سانس لینا کتنا بُرا ہوگا!'' پاکستان سے ماحولیاتی سائنس پڑھنے کو آئے ملک نے باہر کی آلودہ فضا کی طرف دیکھتے ہوئے صاف ستھری انگریزی میں کہا تھا۔ پاکستان میں ماحولیات کی بگڑتی ہوئی صورت حال کا اسے پورا ادراک تھا اسی لیے اس نے اعلیٰ تعلیم کے لیے اسی مضمون کو منتخب کیا تھا۔ اس کے ملک میں سیلاب اور زلزلے کی تباہ کاریوں میں اضافے کے خدشات مسلسل بڑھ رہے تھے اور وہ ماحولیاتی تبدیلیوں ہی کو ان سانحات کا ذمہ دار سمجھتا تھا اور ان کے سدِباب کے لیے بھی کچھ کرنا چاہتا تھا۔

اُس کی بات سُن کر ٹورانٹو میں پلے بڑھے ڈیوڈ نے بس اپنا سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ ڈیوڈ پیدائشی 'ٹورانٹونین' تھا۔ اپنے شہر کو ٹورنٹو یا ٹورانٹو کے بجائے 'ٹورانو' کہتا تھا اور بات بات میں انگریزی کا 'لائیک، لائیک' استعمال کرتا اور کبھی کبھار 'ایف' لفظ کا ایک ہی جملہ میں دو ایک بار اضافہ اسے معیوب نہ لگتا تھا۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے ملک کی تائید میں کہا تھا: ''یقین نہیں آتا کہ ہمارے منظر دیکھتے ہی دیکھتے کیسے دھندلا گئے ہیں۔ یہ گدلی دھند، یہ دھواں ہماری صحت کے لیے قطعی اچھا نہیں۔ یہ تو موت ہے --- سراسر موت۔ میری آنکھیں تو باہر دیکھنے ہی سے جلنے لگتی ہیں۔ اب کیا بتاؤں تمھیں!''

ملک نے اُس کی بات خاموشی سے سُنی تھی اور اپنی نشست کی پشت پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ ''مانا کہ میں ماہرِ ماحولیات نہیں، بس ایک سٹوڈنٹ ہوں اس مضمون کا مگر یہ بات خوب جانتا ہوں کہ جنگلوں میں آگ کا بھڑک اٹھنا کوئی نئی یا اَن ہونی بات نہیں۔ گرمیوں میں ایسا ہو ہی جاتا ہے مگر امریکا کی ریاستوں میں یا پھر اُدھر ہمارے صوبوں برٹش کولمبیا اور البرٹا میں اور وہ بھی محدود پیمانے پر مگر اس بار تو حد ہو گئی۔ اب اس کے اثرات براہِ راست ہمارے صوبہ تک پہنچ گئے ہیں اور ہماری زندگیاں بھی اجیرن بنا رہے ہیں۔'' ملک نے ٹھہرے ٹھہرے، تشویش بھرے لہجہ میں کہا تھا۔

''کیا کہتے ہو؟ کتنے شہروں کی فضا ہے آگ اور دھوئیں کی لپیٹ میں؟ کچھ اندازہ؟'' ڈیوڈ نے استفسار کیا تھا۔

جواب دینے سے پہلے ملک نے جلدی سے اپنے سیل فون کی سکرین پر انگلیاں گھمائیں اور اعداد و شمار گوگل کیے اور بولا: ''تو ہمارے گوگل صاحب بھی ٹھیک ٹھیک تعداد نہیں بتا پا رہے۔ فرماتے ہیں کہ کینیڈا کے متعدد شہر اس وقت فضائی آلودگی کی زد میں ہیں اور فضائی آلودگی کی ایسی گمبھیر صورت پہلے کبھی

پیدا نہیں ہوئی۔ تشویش ناک سطح پر ہے آلودگی کا پیمانہ ان دنوں۔ ہمارے شہر ٹورانٹو بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تمھارے شہر ٹورانٹو سمیت کینیڈا کے کئی اور شہروں کو اس وقت دنیا کے آلودہ ترین شہروں میں شمار کیا جا رہا ہے۔'' ملک نے کسی ریڈیو نیوز کاسٹر کی نقل اتارتے ہوئے کہا تھا۔

یہ سُن کر ڈیوڈ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر آہستہ سے بولا: ''یہ دھواں، لگتا ہے کہ اس بار ہماری کینیڈا ڈے کی تقریبات کے جوش و خروش کو بھی لے بیٹھے گا۔ ایسے میں جھیل کے کنارے آتش بازی دیکھنے جانا صحت کے لیے مضر ہو سکتا ہے۔۔۔ اس آفت سے چھٹکارا پانے کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔''

''میں نے کہا نا کہ جنگلات میں آگ کا بھڑک اٹھنا کوئی نئی بات نہیں۔ شدید موسم کے تناظر میں اسے قدرتی امر بھی کہا جا سکتا ہے مگر ہمارے صنعتی کچرے اور کوئلے کے وسیع پیمانے پر استعمال نے صورت حال زیادہ ہی خراب کر دی ہے۔ اب یہ سب مل کر حملہ آور ہوئے ہیں۔ موسمیاتی تبدیلیاں اور انسان کی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں ہی ذمہ دار ہیں صورت حال کی اس خرابی کی۔ میں تو یہی کہوں گا۔'' ملک نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔

''اُدھر دیکھو ذرا کھڑکی سے باہر، کھیت میں اُس احمق شخص کو، وہ کر کیا رہا ہے؟ خشک گھاس کو جلا رہا ہے؟ ہے نا!'' ڈیوڈ نے کھیت کی جانب اشارہ کیا تھا۔

''ہاں، وہ مچھروں کو بھگانے کے لیے دھواں۔۔۔''

''مچھروں کو بھگانے کے لیے یا ہوا کو اور بھی آلودہ بنانے کے لیے؟'' ڈیوڈ نے ملک کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

ڈیوڈ کے فوری ردعمل پر پہلے تو ملک مسکرا دیا لیکن پھر کچھ سوچ کر سنجیدہ ہو گیا۔ اُس کے ذہن کے پردے پر پاکستانی اور بھارتی پنجاب میں تیزی سے پھیلتی فضائی آلودگی کے مناظر ابھرنے لگے تھے۔ دو پڑوسی ملک جن میں انسانوں اور تجارتی ساز و سامان کے آنے جانے پر تو پابندیاں لگتی رہتی ہیں مگر آلودہ ہوا کو یہاں سے وہاں سفر کی پوری آزادی ہے۔ لاہور ہو یا دہلی، امرتسر ہو یا گوجرانوالہ سبھی کا آسمان اپنی شفاف نیلاہٹ کھو چکا ہے اور صورت حال بدلنے کی کوئی۔۔

''تم کس سوچ میں ڈوب گئے؟'' ڈیوڈ کی آواز نے ملک کی سوچ کا تانا بانا بکھیر دیا تھا۔

''میں اپنے خطے کی سیر کو چلا گیا تھا۔ وہاں بھی بڑھتی ہوئی ٹریفک، بے سمت صنعت کاری اور کھیتوں میں آتش زنی نے ہوا کو مسموم بنا کر رکھ دیا ہے حالاں کہ کھیتوں اور فصلوں کے لیے محدود پیمانے پر آگ لگانا یعنی ''کنٹرولڈ فائرز'' کا اہتمام کرنا ضروری بھی ہوتا ہے مگر اس کی حد بندی بھی لازم ہے۔ خیر، جانے دو، یہ اتنی سیدھی بات نہیں۔ ہاں، میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ اکا دکا

انسان کے کسی انفرادی اقدام کا نتیجہ نہیں۔ یہ بڑے پیمانے پر انڈسٹریل ویسٹ کے سبب ہے۔ صنعتی آلودگی ہی اس فضائی آفت کی ذمہ دار ہے۔ غیر ذمہ دار صنعت کاری---!" ملک نے اس بار گویا لیکچر ہی دے ڈالا تھا۔

"تمھاری بات میں وزن ہے لیکن ہم اپنی روزمرہ کی زندگی اور معمولات میں تبدیلی لا کر بھی فضائی آلودگی میں کمی لا سکتے ہیں۔ اب دیکھو، آس پاس بھی کہیں جانا ہو تو ہم کار استعمال کرتے ہیں حتیٰ کہ سامنے کے سٹور سے گھر کا سودا سلف لانے کے لیے پیدل نہیں جاتے۔ کار چلے گی تو دھواں بھی خارج ہوگا اور دھواں خارج ہوگا تو آلودگی بھی ہوگی۔ ہمارے اکثر ٹرک تو اب تک ڈیزل استعمال کر رہے ہیں۔ تم جانتے ہی ہو ڈیزل سے خارج ہونے والی زہریلی گیس کے اثرات --- تو صرف بڑی صنعتیں ہی نہیں ہم سب ذمہ دار ہیں اس صورت حال کے لیے۔" ڈیوڈ نے وضاحت کی تھی۔

"دیکھو، ڈیوڈ پیارے - ہر کوئی گروسری پیدل نہیں کر سکتا۔ ہر شہر میں محفوظ فٹ پاتھ نہیں، پھر سٹورز بھی گھروں سے دُور واقع ہو سکتے ہیں۔ بسوں پر سفر ہر کسی کے لیے آسان نہیں ہوتا اور پھر کام دھندا اگر گھر سے فاصلے پر ہے تو وہاں کار کے بغیر جائیں گے کیسے؟ اور کام نہیں کریں گے تو گزارا کیسے ہوگا؟--- مجھے تو لگتا ہے کہ سارا نظام ہی سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہے؛ محض کارپوریشنوں اور بڑے اداروں کے منافع کو سامنے رکھتے ہوئے--- نہ کہ عام فرد کی سہولت اور ماحول کی بہتری کو۔" ملک نے اپنے ہاتھ میں تھامے فون کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا تھا اور بظاہر ڈیوڈ بھی اس سے متفق ہی دکھائی دے رہا تھا۔

ان دو دوستوں کی گفت گو سے بے نیاز GO ٹرین مختلف سٹاپوں، سڑکوں اور قصبوں سے گزرتی ہوئی ٹورانٹو کی طرف رواں دواں تھی اور اس کی پٹڑی کے آس پاس ہی سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گاڑیوں میں ایندھن جلنے سے پیدا ہونے والا دھواں پہلے سے مکدر فضا کو اور بھی خراب کر رہا تھا۔ ڈیوڈ اور ملک بھی ٹرین کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے یہ سب دیکھ رہے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ--- الیکٹرک کاریں ہی اس مسئلہ کا بہترین حل ہیں۔ نہ پیٹرول جلے گا اور نہ ہوا آلودہ ہوگی۔ میں تو اب اسی نتیجے پر پہنچا ہوں سوچ سوچ کر۔" ڈیوڈ نے اظہار رائے کیا تھا۔

ملک نے ڈیوڈ کی بات سُن لی تھی مگر جواب دینے کے بجائے اسے چیونگم کا ایک ٹکڑا پیش کیا تھا جسے ڈیوڈ نے شکریہ کہہ کر قبول کر لیا تھا۔

ملک شاید چیونگم کے ذریعہ ماحول پر چھائی اس فکر مندی کو کم کرنا چاہتا تھا جو ان کی گفت گو کے نتیجہ میں گہری ہوتی چلی جارہی تھی۔

ڈیوڈ نے چیونگم کو منہ میں رکھ لیا تو ملک گویا ہوا: ''اس سے بھی فرق تو ضرور پڑے گا مگر یہ واحد حل نہیں اس مسئلے کا۔ اس کے مستقل حل کے لیے ہمیں چوکھی جنگ لڑنا ہوگی۔ اپنی انفرادی عادتیں بھی بدلنا ہوں گی اور اجتماعی کوششوں کو بھی تیز کرنا ہوگا۔ صرف برقی گاڑیاں عام ہو جانے سے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ ہمیں کوئلہ کا استعمال کم کرنا ہوگا، صنعتی اور کیمیاوی کچرے کو کم سے کم کرنا ہو گا، توانائی کے متبادل ذرائع اور وسائل تلاش کرنا ہوں گے۔'' ملک کہتا چلا گیا۔

''تم نے وہ خبر تو دیکھی ہے نا کہ کیوبک میں موٹھورنسی فالز سے بے سینٹ پال تک ہائیڈروجن سے چلنے والی ٹرین کا کام یاب تجربہ ہوا ہے۔ یہ صاف ٹیکنالوجی کی جانب ایک اور قدم ہے۔ نہیں کیا؟'' ڈیوڈ نے قدرے جوش سے کہا تھا۔

ہاں، بالکل ہے۔۔۔ لیکن اس کے لیے ہمیں یورپ کا شکر گزار ہونا چاہیے کیوں کہ یہ منصوبہ بنیادی طور پر فرانس نے تیار کیا تھا اور ایسی ٹرینیں جرمنی اور یورپ کے دوسرے کئی ممالک میں پہلے ہی چل رہی ہیں''۔ ملک نے تبصرہ کیا تھا۔

''گویا ماحولیاتی سوچ میں ہم یورپ سے کافی پیچھے ہیں!'' ڈیوڈ نے تاسف سے کہا تھا۔

''یا یورپ ہم سے آگے ہے! ویسے مجھے تمھاری 'ماحولیاتی سوچ' بڑی اچھی لگی۔'' ملک نے ڈیوڈ کی اصطلاح پر مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا تھا۔ وہ شاید اس سے اس کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

اتنے میں ٹرین اگلے سٹیشن پر رکنے لگی تھی۔

وہاں انھیں باہر ایک دل چسپ منظر دکھائی دیا۔ سڑک کے کنارے ٹریفک کے ہجوم سے لاتعلق ایک بوڑھا شخص اپنے دونوں بازو فضا میں بلند کیے کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں موٹے گتے کا ایک چوکور تختہ اٹھا رکھا تھا جس پر سبز مارکر سے جلی حروف میں لکھا تھا:

''ہم مل جل کر اس دھواں بھری فضا کو صاف کر سکتے ہیں۔''

یہ دیکھ کر ملک سے رہا نہیں گیا اور بول پڑا:

''ڈیوڈ، مانا کہ ہمارے پاس ہر سوال کا جواب نہیں ہے مگر دیکھو، ہمارے درمیان ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی سی کوشش پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ اپنے حصے کا کام کرنے پر کمر بستہ ہیں۔ اس اکیلے شخص کا عزم تو دیکھو ذرا۔ کیا بات ہے! اس کا یہ اقدام ہمیں باتوں سے آگے بڑھ کر کچھ عملی قدم اٹھانے کی ترغیب دے رہا ہے۔ مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے۔ ہر کوئی اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کرے تبھی اچھے نتائج نکلیں گے۔ وہ کہتے ہیں نا 'قطرہ قطرہ مل کر ہی دریا بنتا

ہے--- بالکل اسی طرح۔“
یہ سن کر ڈیوڈ مسکرایا، اس کی آنکھوں میں بھی امید کی کرن روشن تھی۔
”ہاں، پیارے دوست۔ بدترین حالات میں بھی ہمارے عملی قدم ہی فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم سوچ سمجھ کر فیصلے کر کے اور دوسروں کو بھی اس جانب راغب کر کے ماحول کو بہتر بنانے میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔“
”ہمارے دین میں تو صفائی کو نصف ایمان کہا گیا ہے۔“ ملک کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا تھا جس پر ڈیوڈ نے فوراً کہا تھا:
”تم تو جانتے ہی ہو ملک کہ میں مذہبی آدمی نہیں ہوں۔ میں بس انسان دوست ہوں اور انسان دوست ہونے کے ناتے میں تمھاری رائے کا احترام کرتا ہوں۔“
”ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اسلام سراسر انسانیت پسند مذہب ہے۔“ ملک نے زور دے کر کہا۔
”مجھے یاد ہے ہم اس موضوع پر پہلے بھی بات کر چکے ہیں اور مجھے پھر سے بات کرنے پر بھی اعتراض نہیں مگر اس وقت موڈ نہیں۔ ہاں، میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہمارے یہاں کے قدیم باشندے، ہماری فرسٹ نیشنز کے لوگ انسان، کائنات اور ماحولیات کو جس یک جائی سے دیکھتے ہیں وہ بھی توجہ کے لائق ہے۔ مجھے ان کی طرزِ فکر بہت پسند ہے۔ ان کا بظاہر کوئی باقاعدہ الہامی مذہب نہیں مگر وہ کائنات کے تمام عناصر میں ہم آہنگی ہی کو کائنات کی بقا کی ضمانت سمجھتے ہیں۔ انھوں نے مظاہرِ فطرت سے ایسے ہی رشتہ جوڑ رکھا ہے جیسے ہم خون کے رشتوں میں قائم کرتے ہیں۔ یہ چاند، سورج، بادل، پیڑ، پانی، ہوا، پرندے سب کو وہ اپنے سگے رشتہ دار سمجھتے ہیں۔ ہے نا دل چسپ بات؟“ اس بار ڈیوڈ نے پھر جوش میں آ کر کہا تھا۔
”میں تو کسی کے عقائد کے خلاف کچھ نہیں کہہ رہا--- میں تو بس اپنا احساس بیان کر رہا تھا۔ تمھاری دل آزاری مجھے بھی مقصود نہ تھی۔“ ملک نے ہاتھ میں تھاما چیونگم کا پیکٹ اپنی پتلون کی جیب میں رکھتے ہوئے آرام سے کہا تھا۔
”میں نے بُرا نہیں مانا تمھاری بات کا۔ بس وضاحت ضروری سمجھی۔“ ڈیوڈ نے بھی سکون سے کہا۔
اُسی وقت ٹرین کے ٹورانٹو کے یونین سٹیشن پر پہنچنے کا اعلان ہونے لگا۔
ٹرین سے اترتے ہی ڈیوڈ نے گویا اعلانیہ انداز میں کہا: ”تو طے ہوا کہ ہم اپنی ہوا کو، اپنی فضا کو صاف رکھنے کے لیے ہر ممکن اقدام کریں گے۔ اپنے معمولات میں تبدیلی لائیں گے، اپنے کاربن فٹ پرنٹ کم سے کم کر دیں گے اور فضا کو صاف رکھنے کی کوششوں کی حمایت کریں گے۔“

''بہت خوب۔ یہ تو گویا 'نورانشو اعلامیہ' جاری کردیا تم نے۔ ویسے بات ٹھیک ہے میرے دوست، جو بھی ہمارے بس میں ہے ہم ضرور کریں گے اس تشویش ناک صورت حال سے نکلنے کے لیے اور تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے--- سب کچھ کریں گے مگر فی الحال مجھے اس تناؤ کے احساس سے نکلنا ہے جو ہماری باتوں اور حالات نے میرے اندر پیدا کردیا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے ملک نے جلدی سے جیب سے ایک سگریٹ نکالا تھا اور ایک ننھے سے نیلے لائٹر سے اسے سلگانے لگا تھا۔ جب بھی پریشان ہوتا وہ ایسا ہی کرتا تھا۔

ملک نے سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لیا اور سٹیشن کے بیرونی گیٹ کی جانب بڑھنے لگا تھا۔ ڈیوڈ اس کی طرف دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

''--- تو کیا کہو گے تم ڈیزل سے بھی مضر اس دھوئیں کے بارے میں جو باہر کی فضا کو بھی مکدر کر رہا ہے اور اندر کی فضا کو بھی--- اس کے بارے میں کیا کہو گے تم؟''

ملک سمجھ گیا تھا کہ ڈیوڈ کا اشارہ اس کے سگریٹ کے دھوئیں کی جانب ہے مگر وہ انجان بن کر بولا: ''بھئی واہ۔ تمھارا جملہ اچھا ہے۔ اگر میں لکھاری ہوتا تو ضرور کسی افسانہ میں استعمال کرتا۔ تمھاری زبان کی داد دینا پڑے گی مجھے۔ اصل آلودگی واقعی اندر کی ہوتی ہے۔ سوچ کی آلودگی! کاش ہم اسے بھی صاف کرنے کا سوچیں کبھی۔ میں تو کہتا ہوں کہ اچھا سوچنے لگیں تو اچھا ہی ہونے لگتا ہے---''

''تم شاید ازرہ تفنن کہہ رہے ہو یہ مگر میں نے حال ہی میں چینی لکھاری چین چوفین کی کہانی پڑھی تھی ''دی سموگ سوسائٹی'' اس میں یہی کہتا ہے وہ لکھاری۔ وقت ملے تو ضرور پڑھنا۔ تمھیں اچھی لگے گی۔'' ڈیوڈ نے قدرے جوش سے کہا تھا۔

''یقیناً اچھی لگے گی مگر سر دست تو مجھے بھوک لگ رہی ہے، یار۔'' ملک نے ادھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے کہا تھا۔

''اس کے لیے جیرارڈ سٹریٹ جانا پڑے گا۔ تم اپنی یہ دھواں بازی بند کرو تو سٹریٹ کار پکڑیں ہم۔'' ڈیوڈ نے شریر آنکھوں سے ملک کے سگریٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''دھواں بازی---! یہ بھی خوب کہی تم نے۔ واہ۔ واہ۔ واہ'' ۔ ملک نے کہا تھا۔

اور پھر دھوئیں کے ساتھ ایک مشترکہ دوستانہ قہقہہ بھی فضا میں بلند ہوا تھا۔

اُدھر ان دونوں کی دوستانہ نوک جھونک سے بے نیاز 'گو' ٹرین سیٹی بجا کر یونین سٹیشن سے واپس واٹرڈاؤن کی جانب اپنے سفر کا اعلان کر رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

آنکھوں سے جھانکتی روح

وہ جب پہلی بار آئینے کے سامنے رکا تو اسے اپنا چہرہ اجنبی محسوس نہیں ہوا، اجنبیت صرف آنکھوں میں تھی۔ جیسے آنکھیں چہرے کا حصہ نہ ہوں بل کہ کسی اور ہی سمت کھلنے والی دو کھڑکیاں ہوں، جن کے پیچھے کوئی اور موسم سانس لے رہا ہو۔ وہ پلکیں جھپکاتا تو آنکھیں دیر سے بند ہوتیں، جیسے اندر کوئی ضدی شے ہو جو اندھیرے میں واپس جانا ہی نہ چاہتی ہو۔

شہر اس دن معمول سے زیادہ خاموش تھا۔ سڑکیں چلتی تھیں، لوگ رکتے تھے، آوازیں پیدا ہوتیں مگر کسی شے سے ٹکراتی نہیں تھیں۔ ہر آواز اپنی پیدائش کے فوراً بعد یتیم ہو جاتی۔ وہ چلتا رہا اور محسوس کرتا رہا کہ اس کے قدم زمین پر نہیں بلکہ کسی یاد کی سطح پر پڑ رہے ہیں، جہاں ہر نشان فوراً مٹ جاتا ہے۔ ایک بوڑھا شخص اسے دیکھ کر مسکرایا، مگر مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نہیں، آنکھوں کے اندر ابھری اور وہیں تحلیل ہو گئی۔

اسے اچانک یاد آیا کہ بچپن میں اس کی ماں کہا کرتی تھی: ''روح آنکھوں سے باہر جھانکتی ہے، اگر تم نے زیادہ دیر کسی کی آنکھوں میں دیکھا تو اپنی روح کھو دو گے۔'' وہ اس بات پر ہنستا تھا، مگر آج ہنسی آنکھوں تک پہنچنے سے پہلے ہی کہیں راستہ بھول گئی۔ اسے لگا جیسے اس کی اپنی روح اس کی آنکھوں کے پیچھے کھڑی ہے اور کسی اور زندگی کو تاک رہی ہے، جس میں شاید وہ خود شامل نہیں۔

ایک گلی میں اسے ایک عورت نظر آئی جس کا سایہ اس کے سامنے چل رہا تھا اور جسم پیچھے۔ وہ عورت رکتی تو سایہ آگے بڑھ جاتا، جیسے اندھیرا روشنی سے بے تاب ہو۔ اس نے عورت کی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں اپنا عکس نہیں دیکھا، بل کہ ایک خالی کمرا نظر آیا، جس کی دیواروں پر وقت کیلوں کی طرح ٹھکا ہوا تھا۔ اس کمرے میں کوئی سانس نہیں تھی، صرف دیکھنے کی عادت تھی۔

وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا، مگر زمین نے اس

سید تحسین گیلانی

کے قدم قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے لگا وہ اب ایک ایسی جگہ کھڑا ہے جہاں واپسی کا تصور محض ایک لفظ ہے، راستہ نہیں۔ تب اس نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں سے کوئی ہلکی سی روشنی باہر بہہ رہی ہے، جیسے خاموشی کا سیلاب۔ لوگ گزرتے گئے اور اس روشنی میں اپنی آنکھیں دھوتے رہے، پھر خالی ہو کر آگے بڑھ گئے۔

شام ڈھلتے ہی شہر نے اپنی پلکیں بند کر لیں۔ عمارتیں سو گئیں، سڑکیں اونگھ گئیں، مگر وہ جاگتا رہا۔ اب آئینہ اس کے سامنے نہیں تھا، مگر اسے ہر سطح آئینہ لگنے لگی۔ شیشے، پانی، حتیٰ کہ ہوا بھی۔ ہر جگہ اس کی آنکھیں پہلے نظر آتیں، باقی جسم بعد میں۔

آخرکار وہ تھک گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرنا چاہیں مگر آنکھیں اس کی نہیں رہ گئی تھیں۔ وہ کسی اور کی تلاش میں کھلی رہیں۔ تب اس نے ایک فیصلہ کیا، جو شاید اس کا اپنا بھی نہیں تھا۔ اس نے خود کو دیکھنا چھوڑ دیا۔

اگلی صبح شہر نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کی آنکھیں معمولی تھیں، بالکل عام، جیسے سب کی ہوتی ہیں۔ مگر شہر کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ روح اب کہاں ہے۔ شاید وہ اب بھی آنکھوں سے جھانک رہی ہے، مگر کسی اور کی۔ مگر کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی۔ جو روح اس کی آنکھوں سے نکل کر بے گھر ہوئی تھی، اس نے شہر کے اندر کسی ایک جسم کا انتخاب نہیں کیا، بل کہ ہر اُس آنکھ میں ٹھہر گئی جو خالی تھی۔ اب جب لوگ آئینے میں خود کو دیکھتے ہیں تو لمحہ بھر کو یوں محسوس کرتے ہیں کہ انھیں کوئی اور دیکھ رہا ہے۔ پلکوں کے پیچھے ایک اجنبی سانس لیتا ہے، یادیں بے ترتیب ہو کر تیرنے لگتی ہیں، اور دل پر ایک ایسا سوال دستک دیتا ہے جس کا کوئی جملہ نہیں بنتا۔ شہر کو اب معلوم ہو چکا ہے کہ آنکھیں محض دیکھنے کا آلہ نہیں رہیں، وہ دروازے بن چکی ہیں، اور روح اب کسی ایک وجود کی قید میں نہیں، بلکہ دیکھے جانے کے ہر عمل میں زندہ ہے۔ اچانک ایک دن شہر کی تمام آنکھوں نے بیک وقت پلک جھپکنا چھوڑ دیا۔ گھڑیاں رک گئیں، سائے دیواروں سے الگ ہو کر کھڑے ہو گئے، اور آئینوں میں عکس پیچھے ہٹ گئے جیسے دیکھے جانے سے انکار کر رہے ہوں۔ اسی لمحے وہ روح، جو اب تک بے نام آنکھوں میں بکھری ہوئی تھی، ایک چیخ بن کر نہیں بل کہ ایک سوال بن کر ابھری: دیکھنے والا کون ہے؟ تب لوگوں نے محسوس کیا کہ آنکھیں ان کی نہیں رہیں، بلکہ وہ خود آنکھوں کے اندر قید ہیں۔ شہر نے پہلی بار خود کو دیکھا، ایک وسیع، دھڑکتا ہوا مردمک۔۔۔!!!!! اور اگلے ہی لمحے سب کچھ معمول پر آ گیا۔ لوگ چلنے لگے، وقت بہنے لگا، مگر تب سے ہر آنکھ کے پیچھے ایک ہلکی سی دراڑ ہے، جہاں سے روح نہیں، پورا وجود جھانک رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

تم واقعی منٹو نہیں ہو

گورنمنٹ کالج کا کتب خانہ (لائبریری) ہمیشہ سے ایک پُراسرار خاموشی کا مسکن رہا ہے، جہاں پرانی کتابوں کی بو اور علم کی پیاس ایک عجیب سا ماحول پیدا کرتی۔ عنبرین، جو، بی ایس اُردو کی لیکچرار تھی، لائبریری سے چند حوالے کی کتابیں لے کر نکلی تو برآمدے کے آخری سرے پر لگے بنچ پر رضوان جمیل کو دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔ رضوان جمیل، جو اُردو ڈپارٹمنٹ کے سنجیدہ ترین اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، اس وقت اخبار ہاتھ میں تھامے ہوئے تھے مگر ان کی نظریں اخبار کی سرخیوں پر نہیں بل کہ کسی نقطے پر مرکوز تھیں۔

”کیا بات ہے رضوان صاحب! آپ تو ڈرامے کبھی بھی اتنے شوق سے نہیں دیکھتے تھے۔ آج کل 'میں منٹو نہیں ہوں' تسلسل سے دیکھا جا رہا ہے۔ یہ تبدیلی کیسے اور کیونکر ہوئی؟“ عنبرین نے ان کے قریب پہنچ کر شرارتی لہجے میں سوال کیا۔

رضوان جمیل نے چونک کر اوپر دیکھا۔ ان کے ماتھے پر پسینے کی ہلکی سی بوندیں نمودار ہوئیں جنھیں انھوں نے فوراً رومال سے صاف کیا۔ ”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں عنبرین صاحبہ۔“ انھوں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

”مطلب تو آپ خوب جانتے ہیں۔ آپ کی اس مسکراہٹ کے پیچھے ہی تو سارا مطلب چھپا ہے، جسے آپ اخبار کے ورق میں چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ عنبرین نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ وہ رضوان صاحب کی خاموش طبیعت سے واقف تھی مگر پچھلے کچھ ہفتوں سے ان کے رویے میں آنے والی بے چینی اس سے چھپی نہ تھی۔

رضوان جمیل نے محسوس کیا کہ برآمدے سے گزرتے ہوئے طلبہ ان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اخبار تہہ کیا اور کھڑے ہو کر سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ”آئیے کینٹین چلتے ہیں اور چائے کے ساتھ کے وہ راز جاننے کی کوشش کرتے ہیں، جو آپ کے خیال میں میری مسکراہٹ کے پیچھے ہے۔“

دونوں کالج کینٹین کی طرف چل دیے۔ راستے میں پیپل کے گھنے درختوں تلے سے

رانا محمد شاہد

گزرتے ہوئے عنبرین نے محسوس کیا کہ رضوان صاحب کے قدموں میں وہ اعتماد نہیں تھا جو دو سال پہلے اس کے کالج جوائن کرنے کے وقت تھا۔ عنبرین کو یہاں آئے دو سال ہو چکے تھے جبکہ رضوان جمیل ان سے محض ایک سال سینئر تھے۔ اس مختصر عرصے میں ان کے درمیان ایسی ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو چکی تھی جہاں وہ ایک دوسرے کے موڈ کو بھانپ لیتے تھے۔

کینٹین میں رش تھا۔ طلبہ کے قہقہے اور چمچوں کی کھنکھناہٹ فضا میں گونج رہی تھی۔ ایک کونے کی میز پر بیٹھتے ہی عنبرین نے موضوع وہیں سے شروع کیا جہاں چھوڑا تھا۔

''رضوان صاحب! میں منٹو نہیں ہوں، تو ایک ادھیڑ عمر پروفیسر اور اس کی نوجوان شاگرد کی محبت کی کہانی ہے۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ جیسا سنجیدہ انسان، جو کلاس میں میر اور غالب کے فلسفوں سے نیچے بات نہیں کرتا، اس ڈرامے میں کیا ڈھونڈ رہا ہے؟'' عنبرین نے چائے کا سپ لیتے ہوئے سوالیہ نشان ان کے سامنے رکھ دیا۔

رضوان جمیل نے چائے کے کپ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، جیسے وہ اس کی گرمائش سے اپنے اندر کی ٹھنڈک ختم کرنا چاہتے ہوں۔

''ڈرامے میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے مس عنبرین۔ انسانی نفسیات، خاندانی دشمنیاں، معاشرتی جبر اور وہ سچائیاں جنھیں ہم ماننے سے کتراتے ہیں۔ بس ایسے ہی مجھے ڈرامہ اچھا لگا اور۔۔۔''

''اور ایسے ہی دیکھنا شروع کر دیا؟'' عنبرین نے ان کا ادھورا جملہ مکمل کیا اور ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ ''آپ نے ابھی کہا، وہ سچائیاں جنھیں ہم ماننے سے کتراتے ہیں رضوان صاحب، کیا نہ ماننے سے وہ ختم ہو جاتی ہیں''۔ یہ کہنے کے بعد وہ ایک دم رکی۔ رضوان جمیل کو مکمل خاموش دیکھ کر ایک دم بولیں۔

''آپ صنوبر سے محبت کرتے ہیں۔''

یہ جملہ کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ رضوان جمیل کے ہاتھ کانپنے لگے اور چائے کی چند بوندیں میز پر گر گئیں۔ انھوں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ''کیسی باتیں کر رہی ہیں مس عنبرین! وہ میری سٹوڈنٹ ہے۔ بی ایس فورتھ سمیسٹر کی طالبہ۔ میں ایسا کیسے سوچ سکتا ہوں؟ میرا منصب، میرا پیشہ، میری عزت۔۔۔''

رضوان جمیل کی آنکھوں کے سامنے اچانک گزشتہ ماہ کا ایک منظر لہرانے لگا۔ جب وہ کلاس میں ''منٹو کی افسانہ نگاری'' پر لیکچر دے رہے تھے۔ صنوبر، جو ہمیشہ پہلی نشست پر بیٹھتی تھی، آج کچھ زیادہ ہی غور سے انھیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ستائش کے ساتھ ایک عجیب سی بے باکی تھی۔

لیکچر ختم ہونے کے بعد جب سب طلبہ چلے گئے تو صنوبر اپنی ڈائری لیے ان کی کرسی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''سر! کیا سچ ہمیشہ اتنا ہی کڑوا ہوتا ہے جتنا

منٹو کے افسانوں میں ہے؟"۔اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

رضوان جمیل نے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"ہاں ایسا ہی ہے۔ سچ کڑوا ہوتا ہے مگر وہی انسان کو آزاد بھی کرتا ہے۔"

صنوبر نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔"تو سر! آپ آزاد کیوں نہیں ہوتے؟ آپ کے لفظوں میں جو تڑپ ہے، وہ آپ کی خاموشی سے لڑتی کیوں نہیں؟"۔

اس دن رضوان جمیل اپنی ہی ایک ہونہار شاگردہ کے جملے سے لاجواب ہو گئے تھے۔ وہ اس خاموش پیغام کو اس محبت کو پڑھ چکے تھے مگر ان کے اندر کا 'پروفیسر' آڑے آ گیا تھا۔

مس عنبرین نے ان کی سوچوں کا تسلسل توڑا۔"کوئی رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے۔ آپ کے لفظوں اور لہجے کی تھرتھراہٹ آپ کے دل کا حال سنا رہی ہے رضوان صاحب۔"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" رضوان جمیل نے لہجے میں مصنوعی سختی لانے کی کوشش کی۔

"یہی کہ سٹوڈنٹ سے محبت کوئی جرم نہیں ہے۔" مس عنبرین نے سکون سے جواب دیا۔"آپ اسے گناہ سمجھ رہے ہیں جبکہ یہ ایک انسانی جذبہ ہے۔"

"وہ میری شاگرد ہے عنبرین! اس رشتے میں ایک تقدس ہے۔ اس سے محبت میرے لیے جائز نہیں ہے۔ معاشرہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا اور صنوبر... وہ تو ابھی زندگی کے نشیب و فراز سے واقف ہی نہیں ہے۔" رضوان جمیل کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔

عنبرین نے میز پر تھوڑا آگے جھکتے ہوئے کہا۔"آپ صرف میرے ساتھ ہی نہیں۔ بلکہ اپنے آپ سے بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ صنوبر کی اسائنمنٹس کو بار بار پڑھتے ہیں، اس کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے آپ کے لہجے کی چاشنی بدل جاتی ہے۔ یہ مہربانی باقی سٹوڈنٹس پر کیوں نہیں"۔ رضوان جمیل خاموش تھے۔

مس عنبرین نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"یاد رکھیے! جس منٹو کو ہم پڑھتے ہیں یا جس کے ڈرامے ہم دیکھتے ہیں۔ وہ منٹو جیسا تھا، ویسا ہی نظر آتا تھا۔ وہ معاشرے کی خوبصورتی ہو یا گندگی اسے کارپٹ کے نیچے نہیں چھپاتا تھا۔ وہ اسے سامنے لاتا تھا۔ دل کے معاملات ہوں یا معاشرے کے تلخ حقائق اس نے کبھی مصلحت سے کام نہیں لیا مگر آپ؟ آپ تو محبت جیسے پاکیزہ جذبے کو ہی چھپانے لگے۔ کوئی مذہب، اخلاق یا قانون یہ نہیں کہتا کہ اپنی سٹوڈنٹ سے محبت جائز نہیں۔ عمروں کا فرق معنی نہیں رکھتا اگر دو روحیں ایک دوسرے کو قبول کر لیں۔"

رضوان جمیل کی نظریں چائے کے خالی کپ پر گڑی تھیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ وہ مس عنبرین کے ان سوالوں کا آخر کیا جواب دیں، جو انھوں نے اپنی نظروں سے بارہا پوچھا تھا۔ کیا وہ واقعی منٹو بن سکتے تھے؟ کیا ان میں اتنی ہمت تھی کہ وہ اس کالج، اس شہر

اور اس نظام کے سامنے کھڑے ہو کر یہ کہہ سکیں کہ وہ اپنی شاگرد کے عشق میں مبتلا ہیں؟۔
''میں منٹو نہیں بن سکتا مس عنبرین۔۔۔'' انھوں نے بالآخر اعتراف کیا۔
''منٹو بننے کے لیے اپنی کھال اتروانی پڑتی ہے۔ میں ایک مڈل کلاس استاد ہوں، جو صرف کتابوں میں انقلاب لاتا ہے۔ اپنی زندگی میں تو میں ایک ڈرپوک انسان ہوں جو صنوبر کی ایک مسکراہٹ پر کانپ جاتا ہے۔''
عنبرین کی آنکھوں میں ہمدردی تھی۔ ''تو پھر یہ تماشہ ختم کیجیے رضوان صاحب یا تو منٹو بن کر اپنی محبت کا علم بلند کیجیے یا پھر اس ڈرامے کو دیکھنا چھوڑ دیجیے جو آپ کو آپ کی کمزوری کا احساس دلاتا رہے۔''
اسی لمحے کینٹین کے دروازے پر صنوبر نمودار ہوئی۔ اس نے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور بالوں میں لگی ایک چھوٹی سی پن چمک رہی تھی۔ اس کی نظریں سیدھی رضوان جمیل پر پڑیں تو اس کے چہرے پر یک دم بہار آ گئی۔ وہ تذبذب میں ان کی طرف بڑھی۔
''سر! وہ۔۔۔ لائبریری میں آپ کی ایک کتاب رہ گئی تھی، میں نے سوچا آپ کو دے آؤں۔'' اس نے منٹو کے افسانوں کا مجموعہ ''خالی بوتلیں، خالی ڈبے'' میز پر رکھا۔ اس کی انگلیاں ایک لمحے کے لیے رضوان صاحب کے ہاتھ سے لمس کر گئیں۔
رضوان صاحب کی زبان گنگ ہو گئی۔ عنبرین نے مسکرا کر صنوبر کو دیکھا اور پھر رضوان جمیل کو، جو نظریں جھکائے چائے کے خالی کپ کو دیکھے جا رہے تھے۔ صنوبر کی آنکھوں میں وہی سوال تھا، وہی سچائی جسے رضوان جمیل چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔
''شکریہ صنوبر۔۔۔'' رضوان صاحب بمشکل اتنا ہی کہہ پائے۔ صنوبر ایک معنی خیز نظر ڈال کر واپس مڑی، مگر جاتے جاتے اس نے مڑ کر دیکھا، جیسے اسے امید ہو کہ آج پروفیسر صاحب اسے پکار لیں گے مگر وہ خاموش رہے۔
جب صنوبر نظروں سے اوجھل ہو گئی تو مس عنبرین نے گہرا سانس لیا۔ ''دیکھ لیا آپ نے؟ وہ لڑکی آپ کے ایک لفظ کی منتظر ہے مگر آپ خاموش ہیں۔ واقعی رضوان صاحب۔۔۔ آپ منٹو نہیں ہو سکتے۔ منٹو تو وہ تھا جو گناہگاروں کے ماتھے پر بھی سچائی کا ٹیکا لگا دیتا تھا۔ آپ تو ایک سچی محبت کو بھی 'جائز اور ناجائز' کے ترازو میں تول رہے ہیں۔''
رضوان جمیل نے ایک نظر چائے کے خالی کپ پر ڈالی اور ''خالی ڈبے، خالی لوگ'' نامی کتاب کو سینے سے لگا لیا۔ انہیں لگا جیسے وہ خود بھی خالی ہو چکے ہیں۔ پھر بغیر کچھ کہے اٹھے اور واپس لائبریری کی طرف چل دیے۔ ان کے قدموں میں اب پہلے جیسی لغزش نہیں تھی بلکہ ایک بوجھل پن تھا۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کا بوجھ کہ وہ ایک عظیم افسانہ نگار کے کرداروں کی طرح نڈر نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف ایک ''ریڈر'' تھے یا صرف ایک ''ناظر''، ''منٹو'' نہیں۔ وہ محبت کر تو سکتے تھے۔ بتا سکتے تھے اور نہ ہی نبھا سکتے تھے۔

☆☆☆☆☆

سوکھی ٹہنیوں کا روگ

عبدالغفور عرف غفورا اپنے گھر کے صحن میں لگے آم کے بڑے پیڑ کے نیچے چارپائی پر دراز تھا۔ آم کا یہ پیڑ اب اپنی خستہ حالی سے بھی کوسوں آگے بڑھ چکا تھا۔ اس کی ٹہنیاں سوکھ چکی تھیں۔ ایک ہی ٹہنی باقی تھی جو قدرے سبز تھی۔ اس پر بھی صرف ایک ہی پتا لگا ہوا تھا۔ غفورے کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ غفورا بھی یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اس کا خون نچوڑ لیا ہو بالکل آم کے پیڑ کی مانند جیسے اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کا بھی رس نچوڑ لیا گیا ہے۔

یہ گھر اور آم کا پیڑ کبھی خوشیوں اور قلقاریوں کا گہوارا ہوا کرتا تھا۔ اس پر جھولے لیے جاتے تھے۔ اس کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے گرمیوں میں لسی سے خوب حظ اٹھایا جاتا تھا۔ اس کے پھلوں سے جی بھر کر سیر ہوا جاتا تھا۔

آم کے پیڑ کی مانند غفورے کا گھر بھی پھل سے بھرپور تھا۔ یعنی غفورے کی آل اولاد تھی۔ دم بھرنے والی بیوی تھی۔ غفورے کے چھ بیٹے تھے۔ چھ کے چھ بیٹوں کو اس نے پڑھایا لکھایا تھا۔ ان چھ بیٹوں میں سے پانچ اپنی اپنی نوکریوں پر لگ کر گاؤں سے کوچ کر چکے تھے۔ سب سے چھوٹا بیٹا بھی ابھی حال میں ہی نوکری لگ گیا تھا۔ غفورے نے اس کی بھی شادی کر دی تھی۔ بیٹے اپنی اپنی گھر گرہستی میں مصروف ہو چکے تھے۔ غفورا اور اس کی بیوی اب اس گھر میں رہتے تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے کا سہارا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کا جی بھرتے تھے۔ ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کی غمگسار اور ہمدرد بھی داعئ اجل کو لبیک کہہ کر اس کی زندگی ویران کرنے کے ساتھ ساتھ اسے آخری دم تک کے لیے نہ ختم ہونے والا روگ بھی دے گئی۔ اس کے جانے کے بعد جیسے یہ روگ غفورے کے ساتھ ساتھ آم کے پیڑ میں بھی اتر آیا۔ وہ بھی غفورے کے ساتھ ہی

بابر امین ابر

سوکھنا شروع ہو گیا۔ گاؤں والے لوگ اکثر کہا کرتے تھے کہ آم کے پیڑ کو روگ لگ گیا ہے۔ اس لیے یہ سوکھتا جا رہا ہے۔ غفورے کی جانب کسی کی توجہ نہیں ہوتی تھی۔ اس کا روگ کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔

کبھی اس درخت پر پرندے بسیرا کیا کرتے تھے۔ اب کبھی کبھار کوئی کوا آتا اور ان دونوں کی حالت پر کچھ دیر نوحہ کنائی کرتا اور چلا جاتا۔

ایک دن اس کا چھوٹا بیٹا آیا اور اس سے رخصت لے کر چلتا بنا کہ وہ اچھے مستقبل کے حصول کے لیے بیرونِ ملک ایک طویل عرصے کے لیے بیوی کے ساتھ جا رہا ہے۔ غفورا بس آم کے پیڑ کے نیچے لیٹا اس کی اکلوتی بچنے والی شاخ اور پتے کو گھورتا ہی رہ گیا۔ بیٹے کے جانے کے بعد ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اکلوتی ٹہنی کو توڑ کر غفورے کے سینے پر گرا گیا جبکہ اس کا پتا پہلے ہی ساتھ چھوڑ گیا تھا جیسے غفورے کا بیٹا۔ دو موٹے موٹے آنسو غفورے کی آنکھوں سے بہہ گئے۔

”میں سمجھ گیا تیرے دکھ کو بھی۔ میرے دیرینہ دوست! میں سمجھ گیا۔“ غفورے کے حلق سے ایک دردانگیز صدا بلند ہو کر فضا کی گود میں چھپتی چلی گئی۔ اس نے خود پہ گری شاخ کو سینے میں دبالیا اور آنکھیں موند گیا۔

دوسرے دن گاؤں کے افراد نے غفورے کو سینے میں ایک شاخ دبائے مردہ حالت میں پایا۔ اس کے بیٹوں کو بھی اطلاع نہیں دے پایا کوئی۔ کیوں کہ ان کا رابطہ گاؤں میں اور کسی کے ساتھ نہیں تھا۔ گاؤں والوں نے ہی مل کر غفورے کا کفن، دفن کر دیا۔ کافی عرصہ گزرنے کے بعد غفورے کا بڑا بیٹا آیا اور اسے گاؤں والوں کی زبانی معلوم ہوا کہ باپ تو کب کا راہیٔ ملکِ عدم ہو چکا تھا۔ افسوس کا ایک لمحاتی تاثر اس کے چہرے پر ابھرا۔ وہ قبرستان گیا اور باپ کی قبر پر فاتحہ خوانی کر کے اپنے تئیں فرض ادا کر آیا تھا۔

اب وہ گھر کے باہر کھڑا آم کے پیڑ کے گرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ کیوں کہ لوگوں نے اسے بتایا تھا کہ اسے ٹہنیاں سوکھنے کا روگ لگ گیا ہے۔ مزدور زور و شور سے ان کے سوکھے درخت پر آریاں چلائے جا رہے تھے۔ آم بھی بس اب گرنے اور اپنے آخری دموں پر تھا۔ غفورے کے بیٹے نے آم کے پیڑ کے دام جیب میں ڈال لیے تھے۔ اور گھر وہ پہلے ہی بیچ چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

سودا

عدالت کے کمرے میں سناٹا نہیں تھا بل کہ ایک ایسی گھٹن تھی جو انسانی کھال کے مساموں میں اُتر کر دم گھونٹ دیتی ہے۔ یہ وہ سناٹا تھا جو طوفان کے بعد نہیں بل کہ ضمیر کی موت کے بعد چھا جاتا ہے۔ کمرے کی چھت پر لگا قدیم پنکھا ایک سست اور بیزار ردھم کے ساتھ چل رہا تھا جیسے وقت کی نبض ڈوب رہی ہو۔

زاویار نے اپنی کالی واسکٹ کے کالر کو درست کیا۔ اس کی آنکھوں میں وہ تھکن تھی جو صدیوں سے جاگنے والے پہرے داروں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ اس کے سامنے میز پر نوٹوں کی گڈیاں رکھی جا رہی تھیں۔ ایک، دو، دس، پچاس --- نارنجی اور نیلے نوٹوں کے انبار۔ ان نوٹوں کی سرسراہٹ کسی زہریلے سانپ کے رینگنے کی آواز سے زیادہ کریہہ تھی۔ یہ کاغذ کے ٹکڑے نہیں تھے یہ ایک بیس سالہ نوجوان، حماد کا خون تھا جسے نہایت نفاست سے کرنسی میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

”وکیل صاحب! گن لیں۔ پورے پانچ کروڑ ہیں۔“ سامنے بیٹھے سیٹھ غفار کے منشی نے پان کی پیک حلق میں روکتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں ایک فاتحانہ تحقیر تھی۔

زاویار نے میز پر پڑے نوٹوں کو نہیں دیکھا۔ اس نے اپنی کرسی پر بیٹھے، سکڑے ہوئے وجود کی طرف دیکھا۔ بابا رحیم! مقتول کا باپ۔ جس کی کمر بیٹے کی لاش اٹھا کر نہیں، بل کہ انصاف کی چوکھٹ پر بار بار جھکنے سے دہری ہو چکی تھی۔ بابا رحیم کی آنکھیں خشک تھیں جیسے صحرا جہاں کبھی بارش کی امید بھی نہیں ہوتی۔

”دستخط کر دیجیے بابا جی!“ سیٹھ غفار کے وکیل، بیرسٹر کمال نے نرم، ریشمی لہجے میں کہا۔ ”اللہ کی رضا اسی میں ہے۔ معاف کرنے والا اللہ کو پسند ہے۔ اور پھر--- گھر میں تین بیٹیاں بھی تو ہیں۔ ان کی شادی، ان کا مستقبل--- حماد تو چلا گیا، اب زندوں کا سوچیں۔“

یہ جملہ زاویار کے سینے میں تیر کی طرح پیوست ہوا۔ اس نے زور سے میز پر ہاتھ مارا۔ ”اعتراض ہے، مائی لارڈ!“

جج نے چونک کر زاویار کی طرف دیکھا۔ ”مسٹر زاویار، اب کیا اعتراض ہے؟ فریقین میں صلح ہو رہی ہے، شریعت اس کی اجازت دیتی ہے، قانون راستہ دیتا ہے۔ آپ کیوں عدالت کا وقت ضائع کر رہے ہیں؟“ زاویار اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا قد چھ فٹ تھا لیکن اس وقت وہ اس بوسیدہ عدالتی نظام کے سامنے تنہا اور دیو قامت لگ رہا تھا۔

عمار نعیمی

''مائی لارڈ! یہ صلح نہیں ہے، یہ سودا ہے اور میں اس سودے کے خلاف ہوں۔'' زاویار کی آواز میں گرج تھی لیکن اس میں ایک دردناک لرزہ بھی تھا۔ ''یہ قانون، جس کے تحت آج ایک قاتل کو بری کیا جا رہا ہے، یہ انصاف کی توہین ہے۔''

بیرسٹر کمال نے حقارت سے مسکراتے ہوئے کہا: ''مائی لارڈ! میرے فاضل دوست جذباتی ہو رہے ہیں۔ یہ دیت کا قانون ہے، قصاص اور دیت ہمارے عقائد کا حصہ ہیں۔ کیا یہ مذہب کو چیلنج کر رہے ہیں؟''

زاویار نے کمال کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ کوئی حقیر کیڑا ہو۔ ''میں مذہب کو نہیں، میں اس تشریح کو چیلنج کر رہا ہوں جو امیر کو قتل کا لائسنس دیتی ہے۔ کمال صاحب! آپ جانتے ہیں اس قانون کا عملی مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ اگر آپ کی جیب میں پانچ کروڑ ہیں، تو آپ سڑک پر چلتے کسی بھی انسان کو کچل سکتے ہیں، گولی مار سکتے ہیں اور پھر اپنی چیک بک نکال کر اس کے یتیموں کے منہ پر مار کر گھر جا کر پرسکون نیند سو سکتے ہیں۔''

کمرے میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ زاویار رکا نہیں، وہ روسٹرم کی طرف بڑھا۔

''جناب عالی! ایک مہذب ریاست اور ایک قبائلی معاشرے میں یہی فرق ہوتا ہے۔ سیکولر اور جدید ریاستوں میں، قتل کسی فرد کے خلاف جرم نہیں ہوتا، وہ ریاست کے خلاف جرم (Statetheagainst Crime) سمجھا جاتا ہے۔ جانتے ہیں کیوں؟'' زاویار نے جج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ''کیونکہ جب ایک انسان قتل ہوتا ہے، تو معاشرے کا امن قتل ہوتا ہے۔ قاتل صرف مقتول کا دشمن نہیں ہوتا، وہ پورے سماج کے لیے خطرہ ہوتا ہے۔ ریاست مدعی بنتی ہے تاکہ اس درندے کو معاشرے سے الگ کیا جا سکے، اسے عبرت کا نشان بنایا جا سکے، چاہے مقتول کے ورثا معاف ہی کیوں نہ کر دیں۔''

جج نے عینک کے شیشے صاف کیے۔ ''لیکن مسٹر زاویار، اگر ورثا خود راضی ہیں، انھیں مالی امداد مل رہی ہے جس سے ان کی زندگی سنور سکتی ہے تو ریاست کیوں انتقام لے؟''

''انتقام؟'' زاویار تلخی سے ہنسا۔ ''مائی لارڈ! آپ اسے انتقام کہتے ہیں؟ میں اسے ڈیٹرنس (Deterrence) یا خوف کہتا ہوں۔ قانون کا مقصد کیا ہے؟ جرم کو روکنا۔ جب سیٹھ غفار کے بیٹے، شہریار کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ نشے میں دھت اپنی لینڈ کروزر سے کسی غریب کو کچل دے گا اور اس کا باپ نوٹوں کی بوریاں لے کر ورثا کا منہ بند کر دے گا تو اسے کس بات کا ڈر ہوگا؟ قانون کا؟ پھانسی کا؟ جیل کا؟ نہیں! اسے صرف اس بات کا ڈر ہوگا کہ ڈیڈی کا بینک بیلنس تھوڑا کم ہو جائے گا۔''

زاویار نے سانس لیا اور بابا رحیم کی طرف اشارہ کیا۔ ''دیکھیے اس شخص کو۔ یہ معاف نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں، میں نے اس کی آنکھوں میں وہ آگ دیکھی ہے جو قاتل کو

پھانسی کے پھندے پر دیکھنا چاہتی ہے- لیکن یہ مجبور ہے- اس کی غربت نے اسے مجبور کر دیا ہے- آپ کا یہ قانون ایک غریب کے لیے 'انصاف' نہیں، 'جبر' ہے- امیر قتل کرتا ہے اور پھر اپنی دولت کے زور پر مقتول کے خاندان کی بھوک خرید لیتا ہے- یہ کیسا انصاف ہے جہاں امیر کی گردن ناپنے کے لیے دولت کا پیمانہ ہے اور غریب کی گردن ناپنے کے لیے رسی؟"
بیرسٹر کمال نے مداخلت کی- "یہ فلسفیانہ بحثیں سیمینارز میں اچھی لگتی ہیں زاویار صاحب- یہاں قانون کی بات کریں- سیکشن 302 کے تحت دیت ایک قانونی حق ہے- ہم زبردستی نہیں کر رہے، بابا رحیم خود دستخط کر رہے ہیں-"
زاویار نے تڑپ کر کہا: "یہی تو المیہ ہے! آپ نے حالات ہی ایسے پیدا کر دیے ہیں کہ وہ دستخط کرنے پر مجبور ہے- کیا ایک سیکولر ریاست میں یہ ممکن ہوتا؟ نہیں! وہاں ریاست کہتی ہے کہ بابا رحیم چاہے معاف کر دے، لیکن شہریار نے قانون توڑا ہے، ایک جان لی ہے، وہ معاشرے کے لیے کینسر ہے، اس لیے اسے سزا ملے گی- ریاست غریب کی بھوک کا فائدہ اٹھا کر قاتل کو سڑکوں پر کھلا نہیں چھوڑتی-"
عدالت میں خاموشی چھا گئی- زاویار کے دلائل منطق کی بھٹی میں تپے ہوئے تھے-
"مائی لارڈ! سوچیے، اگر کل کوئی کرائے کا قاتل پکڑا جائے اور وہ کہے کہ میں نے جس کو مارا ہے، اس کے ورثا کو میں دیت دینے کو تیار ہوں تو کیا ہم اسے چھوڑ دیں گے؟ تاکہ وہ کل پھر کسی کو مارے؟ دیت کا تصور شاید قبائلی دور میں مؤثر تھا جہاں ریاست کا وجود نہیں تھا اور قبیلے آپس میں لڑ کر ختم ہو جاتے تھے، وہاں 'خون بہا' جنگ روکنے کا ذریعہ تھا- لیکن آج؟ آج ہم ایک آئینی ریاست میں رہتے ہیں- جب ہم قتل کو 'نجی معاملہ' (Private Dispute) بنا دیتے ہیں تو ہم دراصل ریاست کی رٹ کو ختم کر دیتے ہیں- ہم یہ پیغام دیتے ہیں کہ انسان کی جان کی کوئی حرمت نہیں، بس اس کی ایک 'مارکیٹ پرائس' ہے- جس کی بولی لگ سکتی ہے، وہ بک سکتا ہے-"
جج نے ایک لمحے کے لیے قلم روک لیا- زاویار کی باتوں میں وزن تھا- وہ جانتا تھا کہ معاشرے میں یہ ناسور پھیل چکا ہے- امیر زادے گاڑیاں چڑھاتے ہیں، گولیاں چلاتے ہیں اور پھر 'صلح نامے' عدالتوں میں پیش کر دیے جاتے ہیں-
زاویار نے اپنی فائل بند کی- اس کا لہجہ اب دھیما لیکن انتہائی سنجیدہ تھا-
"جج صاحب! آج اگر آپ نے اس صلح نامے پر مہر لگائی، تو یاد رکھیے گا، آپ صرف شہریار کو بری نہیں کر رہے، آپ اس شہر کے ہر امیر بگڑے ہوئے رئیس زادے کو لائسنس جاری کر رہے ہیں کہ 'جاؤ، مارو، کچلو، اور خریدو'- انصاف اندھا ہوتا ہے لیکن اسے بکاؤ نہیں ہونا چاہیے- مہذب دنیا ہم پر ہنستی ہے کہ ہم نے قتل جیسے گھناؤنے جرم کو بھی

"کاروباری لین دین بنا دیا ہے۔"

بیرسٹر کمال نے بے صبری سے گھڑی دیکھی۔ "فیصلہ سنائیں جناب۔ وقت بہت ہو چکا ہے۔"

جج نے بابا رحیم کی طرف دیکھا۔ "رحیم بخش! کیا آپ بنا کسی دباؤ کے، اپنی مرضی سے اللہ واسطے یہ دیت قبول کر کے ملزم کو معاف کر رہے ہیں؟"

بابا رحیم نے کانپتے ہاتھوں سے قلم تھاما۔ اس نے ایک نظر زاویار کی طرف دیکھا۔ زاویار کی آنکھوں میں التجا تھی۔ مت کرو بابا، مت بیچو اپنے بیٹے کا لہو۔ لیکن بابا رحیم کو زاویار نہیں، اپنی تین جوان بیٹیوں کے پیلے چہرے اور گھر میں فاقوں کا منظر نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک آہ بھری جو شاید آسمان تک گئی ہو، اور کانپتے ہاتھوں سے دستخط کر دیے۔

"جی سرکار۔۔۔ معاف کیا۔"

زاویار وہیں کرسی پر ڈھے گیا۔ قلم کے چلنے کی آواز کسی ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر لگی۔ فیصلہ ہو گیا۔ پانچ کروڑ ادھر، آزادی ادھر۔ انصاف کی دیوی نے ترازو میں سونا رکھ کر پلڑا جھکا دیا تھا۔

شہریار، جواب تک کٹہرے میں لاپرواہی سے کھڑا چیونگم چبا رہا تھا، مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ سیٹھ غفار نے فاتحانہ انداز میں زاویار کو دیکھا اور منشی کو اشارہ کیا۔ نوٹوں کے بیگ بابا رحیم کے حوالے کیے گئے۔

زاویار کو لگا جیسے وہ کمرہ عدالت میں نہیں، کسی قصائی کی دکان میں کھڑا ہے جہاں انسانی گوشت کا سودا ہو چکا ہے۔ وہ تیزی سے باہر نکلا۔ بارش ہو رہی تھی۔ آسمان بھی شاید اس سودے پر رو رہا تھا۔

باہر برآمدے میں سیٹھ غفار نے اسے روک لیا۔

"وکیل صاحب! بہت جوش ہے آپ میں۔" سیٹھ نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ "لیکن یاد رکھنا، ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ بکرا عید پر بھی تو جانور کی قیمت لگتی ہے نا؟ یہ دنیا ہے، یہاں طاقت ور جیتا ہے۔ تمہارے یہ اصول، یہ منطق، یہ سیکولر ریاست کے خواب۔۔۔ یہ سب کتابوں میں اچھے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میری جیب بھاری ہے، اس لیے میرا بیٹا آزاد ہے۔"

زاویار نے نفرت سے اسے دیکھا۔ "سیٹھ! جس معاشرے میں انصاف خریدا جا سکتا ہو، وہاں کوئی بھی محفوظ نہیں ہوتا۔ تم بھی نہیں۔ آج تم نے قانون کو لونڈی بنایا ہے، کل یہی لاقانونیت تمہیں بھی ڈس لے گی۔"

"چل، چل، فلسفی!" سیٹھ نے قہقہہ لگایا اور اپنی بلٹ پروف گاڑی میں بیٹھ گیا۔

زاویار اپنی پرانی گاڑی میں بیٹھا اور سٹیئرنگ وہیل پر سر رکھ دیا۔ اسے اپنی شکست کا اتنا دکھ نہیں تھا جتنا اس نظام کی بے حسی کا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی مذہب کا منشا یہ تھا؟ یا یہ صرف طاقتوروں کی تشریح تھی؟ عقل کہتی تھی کہ جو قانون امیر اور غریب میں فرق کرے، وہ الٰہی نہیں ہو سکتا، وہ محض اشرافیہ کا ہتھیار ہے۔

دن گزرتے گئے۔ زاویار اور زیادہ تلخ ہو گیا۔ اس نے ایسے کیسز لینا چھوڑ دیے۔ وہ صرف کارپوریٹ لا کی طرف چلا گیا، جہاں کم از کم پیسوں کی ہوس کھلے عام تھی، اسے ''انصاف'' یا ''رحم'' کا لبادہ نہیں اوڑھا گیا تھا۔

چھ ماہ بعد۔

شہر کی ایک مصروف شاہراہ پر ٹریفک جام تھا۔ زاویار اپنی گاڑی میں بیٹھا سگنل کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ریڈیو پر خبریں چل رہی تھیں۔ وہی پرانی خبریں، مہنگائی، سیاست، اور کہیں کوئی قتل۔ اچانک پیچھے سے ایک تیز رفتار گاڑی کے ہارن نے اسے چونکا دیا۔ کوئی مسلسل ہارن دے رہا تھا۔

زاویار نے شیشے سے دیکھا۔ ایک سیاہ رنگ کی ایس یو وی (SUV) دیوانہ وار راستہ مانگ رہی تھی، حالانکہ آگے جگہ نہیں تھی۔ گاڑی کے شیشے کالے تھے اور اس کے بمپر پر وہی نمبر پلیٹ تھی جو اس کے حافظے میں نقش تھی۔ ''786'' یہ سیٹھ غفار کے بیٹے شہریار کی گاڑی تھی۔

زاویار کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہی قاتل، جسے اس نے جیل بھیجنے کی کوشش کی تھی، آج پھر سڑک پر دندناتا پھر رہا تھا۔ سگنل کھلا، اور زاویار نے گاڑی آگے بڑھائی۔ ایس یو وی نے اسے بائیں سے اوورٹیک کرنے کی کوشش کی اور زاویار کی گاڑی کو ٹکر مار دی۔

زاویار کا غصہ قابو سے باہر ہو گیا۔ یہ صرف ٹکر نہیں تھی، یہ اس کی شکست کی یاد دہانی تھی۔

اس نے گاڑی روکی اور نیچے اترا۔ ایس یو وی بھی رک گئی۔

شہریار نشے میں دھت باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھی۔

''اوئے! اندھے ہو گیا؟ میری گاڑی کو ٹچ کیا تم نے؟'' شہریار چلایا۔ اس نے زاویار کو پہچانا نہیں۔ نشے اور طاقت نے اس کی یادداشت دھندلا دی تھی۔

''تم؟'' زاویار نے اسے دیکھا۔ ''تم ابھی تک سدھرے نہیں؟ تم نے ایک جان لی تھی، تمہیں ابھی جیل میں ہونا چاہیے تھا۔''

شہریار نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ ''اوہ! تم وہ وکیل ہو۔۔۔ ہاہاہا! دیکھا؟ میں یہیں ہوں۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں نے اس ڈرائیور کے باپ کو خریدا تھا، میں تجھے بھی خرید لوں گا۔ تیری قیمت کیا ہے؟ دس لاکھ؟ بیس لاکھ؟''

زاویار نے قدم آگے بڑھایا۔ ''ہر چیز بکاؤ نہیں ہوتی شہریار۔ میری جان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔''

''ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے!'' شہریار نے چیخ کر کہا اور پستول کا گھوڑا دبا دیا۔

گولی کی آواز سے پورا چوک گونج اٹھا۔ زاویار کے سینے میں جلن محسوس ہوئی۔ وہ لڑکھڑایا۔ سڑک کی سخت تارکول اس کے گھٹنوں سے ٹکرائی۔ خون۔۔۔ سرخ، گرم خون اس کی سفید قمیض پر پھیلنے لگا۔ وہ سڑک پر گر گیا۔

لوگ جمع ہو گئے۔ شور مچ گیا۔ شہریار نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، پھر گاڑی میں بیٹھا اور فرار

ہو گیا۔

زاویار کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ آخری خیال جو اس کے ذہن میں آیا وہ یہ تھا: شاید اب۔۔۔ اب ریاست جاگے گی۔ اب ایک وکیل کا قتل ہوا ہے۔ اب قانون حرکت میں آئے گا۔ اب دیت کا ڈراما نہیں چلے گا۔

تین ماہ بعد۔

عدالت کا وہی کمرہ۔ وہی سست پنکھا۔ وہی گھٹن۔

لیکن اس بار کرسی پر بابا رحیم نہیں بیٹھے تھے۔

اس بار وہاں زاویار کا بڑا بھائی، جنید بیٹھا تھا۔ جنید، جو ایک مذہبی جماعت کا سرگرم رکن تھا اور ہمیشہ زاویار کے "لبرل" خیالات سے نالاں رہتا تھا۔

میز پر پھر سے نوٹوں کے انبار لگے تھے۔ اس بار رقم دس کروڑ تھی۔ ایک وکیل کی جان، ایک ڈرائیور کے بیٹے سے دگنی مہنگی تھی۔

بیرسٹر کمال نے مسکراتے ہوئے کاغذات جنید کی طرف بڑھائے۔

"جنید صاحب! زاویار تو چلا گیا۔ جذباتی آدمی تھا۔ اللہ مغفرت کرے۔ لیکن آپ تو سمجھدار ہیں، دین دار آدمی ہیں۔ قصاص لینے سے زاویار واپس تو نہیں آئے گا۔ اور شہریار تو جوان ہے، غلطی ہو گئی، شیطان غالب آ گیا تھا۔ اس کے والدین بھی پریشان ہیں۔ آپ معاف کر دیں، اللہ پاک آپ کے درجات بلند کرے گا۔ اور یہ رقم۔۔۔ یہ آپ کے مدرسے کی تعمیر میں کام آئے گی۔ زاویار کے نام پر صدقہ جاریہ ہو جائے گا۔"

جنید نے نوٹوں کی گڈیوں کی طرف دیکھا۔ ان کی چمک میں اسے اپنے مدرسے کی بلند عمارت نظر آئی۔ اس نے سوچا کہ زاویار ساری زندگی جن اصولوں کے لیے لڑتا رہا، وہ اصول اسے روٹی نہیں دے سکے، لیکن اس کی موت آج پورے خاندان کو مالا مال کر رہی ہے۔

"بے شک، عفو و درگزر اللہ کو پسند ہے۔" جنید نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "ہم نے اللہ کی رضا کے لیے معاف کیا۔"

اس نے قلم اٹھایا اور اسی جگہ دستخط کر دیے جہاں تین ماہ پہلے بابا رحیم نے کیے تھے۔

عدالت کے باہر، آسمان صاف تھا لیکن ہوا میں ایک عجیب سی بو تھی۔ شاید یہ انصاف کے گلنے سڑنے کی بو تھی۔ زاویار، جو ساری عمر یہ ثابت کرنے میں لگا رہا کہ جان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور قتل ریاست کے خلاف جرم ہے، اس کی اپنی موت محض ایک "نجی تنازعہ" قرار دے کر دس کروڑ میں سیٹل کر دی گئی تھی۔

اس کا نظریہ، اس کے دلائل، اس کی منطق۔۔۔ سب کچھ دیت کے قانون کی ایک ہی ضرب سے ملیا میٹ ہو گیا تھا۔ قاتل پھر سے آزاد تھا، اگلی بولی لگانے کے لیے، اگلی لاش خریدنے کے لیے۔ اور قبرستان کے ایک ویران کونے میں، زاویار کی قبر پر لگا کتبہ خاموشی سے چیخ رہا تھا:

"یہاں وہ شخص دفن ہے جسے اس کے اپنے ہی قاتل نے خرید لیا۔"

☆☆☆☆☆

مقتولِ محبت......!

غضنفر مہدی

"میں نے آپ کو کتنے میسجز کیے، کالز کیں، آپ کوئی جواب نہیں دیتے۔" زوہا نے جون کا راستہ روکتے ہوئے پوچھا۔

"بس ویسے" جون نے بے رخی سے جواب دیا۔

"کیا بس ویسے؟ کیا میں اچھی نہیں لگتی؟" زوہا کی آواز بھرا گئی۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے" جون نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"تو پھر آخر کیا بات ہے، کیوں مجھ سے دور رہتے ہیں؟ آپ سے اور کچھ نہیں چاہیے، آپ کا ساتھ اور پیار چاہیے، میں آپ سے محبت کرتی ہوں، میرا اب اس دل پر اختیار نہیں رہا۔ اگر میں آپ کو اتنی ہی بری لگتی ہوں تو صاف کہہ دیں آج کے بعد کبھی سامنے نہیں آؤں گی اور کوئی میسج، کال نہیں کروں گی"۔ زوہا اپنے ڈوپٹے سے آنسو صاف کرتے ہوئے جانے لگی۔

"میں تمھیں کیسے سمجھاؤں؟ جیسے تم سوچ رہی ہو ویسا کچھ نہیں، تم میرے بارے میں جانتی ہی کیا ہو؟" جون کے لہجے میں کچھ نرمی آئی۔

"سب جانتی ہوں آپ کے بارے میں اور مزید کچھ جاننے کی ضرورت نہیں ہے، محبت

جان کر نہیں کی جاتی، یہ تو بس ہو جاتی ہے، اور مجھے آپ سے ہو گئی ہے اور بہت ہو گئی ہے، میں نے بس آپ کے ساتھ زندگی سوچی ہے۔'' زوہا نے فیصلہ کن انداز میں بات ختم کی۔

''ابھی تم کچھ نہیں جانتی۔۔''

''تاں - - کیا نہیں جانتی میں، بتائیں ذرا۔۔''

''دیکھو! میں ایک تھکا ہارا انسان ہوں، بند گلیوں کا مسافر ہوں، جس کی کوئی منزل نہیں، زندگی سے بیزار ہوں، مسائل سے گھرا ہوں، میں کسی کو خوشی نہیں دے پاتا، محبت نہیں کر پاتا، وقت نہیں دے پاتا، اس لیے محبت سے دور رہتا ہوں''۔

''جون! آپ میری بات سنیں، محبت کچھ سوچ کر نہیں کی جاتی، اور پھر جس سے محبت ہو جائے تو اسے تمام تر خوبیوں خامیوں سے قبول کیا جاتا ہے، آپ جو ہیں جیسے ہیں مجھے قبول ہیں، آپ کو آپ کے مسائل سمیت قبول کر لیا ہے، آپ سے محبت ہے آپ کو پانے کے لیے بہت دعائیں کی ہیں، بہت روئی ہوں، اب اور ہمت نہیں مجھ میں، پلیز اب مجھے اگنور مت کرنا، میں آپ کی محبت میں شاید بہت آگے تک جا چکی ہوں، واپس پلٹنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے''۔

''زوہا! تمھاری محبت پر شک نہیں لیکن میرا مذہب---''!!

(بات کاٹتے ہوئے)''لیکن ویکن کچھ نہیں، اور مجھے نہیں کوئی مسئلہ آپ کے مذہب سے۔اب اور کچھ نہیں سوچیں گے، آپ میرے اور میرے ہیں بس۔۔''!

☆

''زوہا! میرے دل میں پیار کی جوت تم نے جگائی ہے، تمھاری محبت نے مجھ جیسے پتھر کو موم کیا ہے، زندگی کی جس رنگینی اور چاشنی سے میں بے خبر تھا وہ تمھارے آنے سے ملی ہے، اب تمھارے ساتھ کی ایسی عادت ہوئی کہ ایک پل بھی تمھارے بنا رہنا دوبھر ہے، اب یوں لگتا ہے تم نہ ملی تو مر جاؤں گا، مجھے اس محبت میں لا کر کبھی چھوڑ مت دینا۔'' جون نے زوہا کا ہاتھ تھاما۔

''میں آپ کو کیوں چھوڑوں گی، مجھے بھی آپ سے بہت محبت ہے، آپ کے بنا ایک پل بھی جینے کا تصور نہیں کر سکتی، شاید الفاظ میں بیان نہ کر سکوں کہ آپ کتنے ضروری ہیں میرے لیے، مجھے ہر حال میں آپ چاہیے بس۔! چاہے اس کے لیے مجھے کوئی قدم بھی اٹھانا پڑے، یہ میرا وعدہ ہے ہر حال میں ساتھ نبھاؤں گی'' زوہا نے جون کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر دباتے ہوئے کہا۔

''مجھے تم پر کوئی شک نہیں ہے لیکن یہ دنیا اور یہ میرے حالات---''!

(بات کاٹتے ہوئے)''یہ کیا آپ حالات

کی بات کرتے رہتے ہیں، میں نے پہلے بھی کہا کہ مجھے کچھ نہیں چاہیے دولت سے کوئی سروکار نہیں، آپ کے ساتھ زندگی میں نے گزارنی ہے دنیا نے نہیں، ہم کب سے ساتھ ہیں، سب جانتی ہوں آپ کے بارے، مجھے نہیں کوئی مسئلہ آپ کے ساتھ، بس زندگی کا سکون آپ کے ساتھ ہے باقی جو مسائل ہیں دونوں مل کے حل کر لیں گے، دونوں مل کر زندگی سنوار لیں گے، اور پلیز یہ حالات کی بات نہ کیا کریں۔" زوہا نے دلاسے کے انداز میں کہا۔

"اور تمھارے والدین---؟؟"

"کیا والدین--؟ میں منالوں گی اور اگر نہ مانے تو پھر بھی شادی آپ سے ہی کروں گی۔اب اس بات پہ بات نہیں کریں گے آپ پلیز"۔

☆

"جون! مجھے آپ سے شادی کر کے تمام عمر آپ کے ساتھ گزارنی ہے، کسی قیمت پر آپ کو کھونا نہیں چاہتی اور آپ کو پانے کے لیے کسی حد تک جا سکتی ہوں، ہمارے مستقبل کے بارے سوچ کر پریشان ہو جاتی ہوں"۔زوہا نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں نے کب انکار کیا؟ مجھے بھی تمھارے ساتھ جینا اور مرنا ہے، اور پریشان کس وجہ سے ہو، مجھ پر یقین نہیں کیا؟؟" جون نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بات نہیں ہے--اصل میں--" زوہا کچھ کہتے کہتے خاموش ہو جاتی ہے۔

"کیا اصل میں؟؟ کیا ہوا؟؟ بولو---"

جون تشویش بھرے انداز میں--

"وہ ناں---آپ کا---مذہب؟؟؟؟"

"کیا میرا مذہب---"

"دیکھیں---آپ--ہمارے مذہب پہ آجائیں، تاکہ میں گھر والوں سے کہہ سکوں، ان کو منا سکوں، مجھے تو کوئی ایشو نہیں ہے، مجھے آپ ہر حال میں قبول ہیں، لیکن میرے والدین---!" زوہا چپ کر گئی اور آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

جون: (کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد)

"زوہا! میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ہمارا ملنا ممکن نہیں، تمھارے والدین نہیں مانیں گے لیکن تب تم نے نہیں مانی اور کہا میں سب کر لوں گی، اور اب---!

"تمھیں میرا سب پتا تھا کہ کون ہوں، کیا ہوں، لیکن اس وقت تو کہا محبت میں سب قبول ہے، اور اب میرا مذہب---؟

"میں نے کبھی تم سے نہیں کہا مذہب کے بارے، کیوں کہ مجھے تم سے واسطہ ہے بس--!"

جون! مجھے کوئی ایشو نہیں ہے لیکن میرے امی ابو نہیں مانیں گے، وہ روایتی قسم کے ہیں، پلیز جون میری خاطر۔ میں نہیں رہ سکتی

آپ کے بنا-- پلیز-" زوہا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے اور کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

جون: (اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے) "تم پریشان نہ ہو، تمھارے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں، یہ بھی کرگزروں گا، اگر تمھارے ملنے کی یہی شرط ہے تو یہ بھی قبول--!"

"جون! آپ کا بہت شکریہ، مجھے زندگی دینے کے لیے، میرا مان رکھنے کے لیے، میں بھی دور نہیں ہونا چاہتی، میرا سہارا آپ ہیں اور جون پلیز پیسا کمائیں، اسٹیٹس بنائیں، تاکہ آپ کے حالات اچھے ہو جائیں اور پھر میرے والدین کو کوئی اعتراض نہ ہوسکے۔

"صحیح ہے---اب میری غربت بھی محسوس ہونے لگی ہے۔"

"پلیز جون! میرا یہ مطلب نہیں ہے، آپ غلط نہ سمجھیں، بس آپ کو کھونا نہیں چاہتی--" زوہا سمجھانے کے انداز میں بولی۔

"ٹھیک ہے، میں سب کرلوں گا ڈونٹ وری، ریلکس رہو تم-- تمھارے لیے کچھ بھی---" جون کسی سوچ میں پڑ جاتا۔

☆

"زوہا! میں تمھارے مذہب پر ہوں، اب میرا نام فواز احمد ہے۔"

"ہیں--سچ---؟ صدقے جاؤں--اب ہمیں ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا-- میں بتا نہیں سکتی آپ نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی ہے، آئی لو یو--فواز !!

"زوہا! مذہب چھوڑنے پر گھر والوں نے مجھ سے تعلق توڑ لیا ہے، اب میں اپنے گھر والوں کے ساتھ نہیں رہتا--ایک کرائے کے مکان میں رہتا ہوں - -اب میرا تمھارے سوا کوئی نہیں یہاں--"

آپ پریشان نہ ہوں، آپ اکیلے نہیں ہیں، میں آپ کے ساتھ ہوں اور کبھی اکیلا نہیں ہونے دوں گی، یہ میرا وعدہ ہے ساری زندگی ساتھ نبھاؤں گی۔" زوہا نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تم میرے لیے کیا کرسکتی ہو؟؟"

"میں سب کچھ کرلوں آپ کے لیے"

"کیا میرے لیے اپنے ماں باپ کو چھوڑ سکتی ہیں؟"

"ہاں ! اور میں آپ کے لیے ساری دنیا چھوڑ سکتی ہوں"

"سوچ لو۔"

"محبت کی تو سوچنا کیا؟ آپ کا ساتھ مل جائے یہی بہت ہے میرے لیے"

"زوہا! تم میرے ساتھ ہو تو مجھے لگا ساری دنیا میرے ساتھ ہے"۔

"میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوں، آج آپ نے جو خوشی مجھے دی وہ میں لفظوں میں کبھی بیان نہ کرسکوں---"

☆

''فواز! میں آج آپ سے آخری بار ملنے آئی ہوں۔'' نظریں جھکائے بیٹھی اپنے ہاتھوں کو مسل رہی تھی۔

''کیا مطلب اس بات کا'' ۔ فواز چونکا۔

''وہ... مطلب...'' زوہا خاموش۔

''ہاں بتاؤ نا! مجھے اب...'' فواز کا جسم لرز رہا تھا۔

''وہ... میری شادی طے ہوگئی ہے۔''

''کیا کہا؟؟؟ ہوش میں ہو تم؟؟؟

''جی ہوش میں ہی ہوں، میں نے گھر بات کی، ابو نہیں مانے کہ جس کا اپنا گھر نہیں ہے، جسے گھر والوں نے چھوڑ دیا، کرائے کے گھر میں دھکے کھاتا ہے اسے کیسے دے دوں بیٹی؟؟ نہ کوئی اسٹیٹس ہے، نہ کوئی حیثیت...'' زوہا نے ایک سانس میں باپ کی کہی بات دوہرادی۔

''اور تم نے کچھ نہیں کہا۔ ہمارے لیے کچھ نہیں بولی تم؟ تمھیں تو سب پتا کہ یہ سب کیوں ہوا اور کس لیے ہوا؟؟ تمھارے لیے اپنا مذہب چھوڑا تو یہ سب ہوا۔ یہ سب تمھارے لیے ہی کیا اور تم کچھ نہیں بولی۔'' فواز کی آواز بھرائی تھی، جسم میں جیسے سکت نہ رہی ہو۔

زوہا چپ چاپ نظریں جھکائے بیٹھی۔

''اب بولتی کیوں نہیں، مجھے ایک ایسے مقام پر چھوڑ رہی جہاں میں کچھ نہیں کرسکتا۔ سب ختم ہوگیا میرے لیے تو۔ تم کہتی تھی کہ میرے لیے کچھ بھی کرسکتی ہو دنیا چھوڑ سکتی ہو۔ اور اب...؟'' فواز کے حلق میں آنسو اٹک گئے ہوں جیسے۔

''میں تمھارے لیے اپنے ماں باپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔ انھوں نے جو میرے لیے پسند کیا ہے وہ ایک بزنس مین ہے، ایک اچھا اسٹیٹس ہے، میرے لیے اچھا ہوگا'' زوہا کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''واہ زوہا! تو میرے پاس کیوں بیٹھی ہو، اب مجھ سے کیا رشتہ ہے تمھارا، جاؤ نئی زندگی مبارک ہو۔ میرا اللہ مالک ہے'' فواز لڑکھڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

جس کے لیے اپنا مذہب چھوڑا، گھر والے چھوڑے، آج اسی زوہا نے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا، اس احساس نے فواز کے دل کی دھڑکن روک دی اور وہ گلی کے نکڑ پر مردہ حالت میں پایا گیا، گھر والوں نے قبول نہ کیا تو لاوارث لاش کی طرح مردہ خانے میں رکھ دیا گیا۔

ادھر زوہا کو رخصتی کے وقت فواز کی موت کی خبر پہنچی تو ماں سے لپٹ کر پھوٹ کر رونے لگی اور بولی ''میں نے اسے مار دیا ہے، میں نے اسے مار دیا ہے، میں اس کی قاتل ہوں، میں اس کی قاتل ہوں'' اور پھر زوہا کی آواز ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی۔

☆☆☆☆☆

روشنی کا رستہ

ارم شہزادی

جامعہ النور کے وسیع و عریض کیمپس میں خزاں کا پہلا دن اُتر چکا تھا- پتوں کی سنہری بارش درختوں سے یوں گرتی تھی جیسے کوئی پرانا شاعر اپنی یادوں کے لفظ زمین پر بکھیر رہا ہو- اسی ماحول میں ایک دبلی پتلی، سنجیدہ چہرے والی لڑکی آہستہ آہستہ گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی- اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں، چہرہ پُرسکون اور دل میں اللہ کا نام- یہ تھی ایمان بی ایس انگلش لٹریچر کی طالبہ تھی ایمان کے ساتھ اس کی بچپن کی سہیلی ثانیہ بھی تھی، جو طبیعت کی ہلکی پھلکی مگر ذہین لڑکی تھی- دونوں لڑکیاں پہلی بار یونیورسٹی میں قدم رکھ رہی تھیں، مگر ان دونوں کے دلوں میں یہاں آنے کا مقصد بہت واضح تھا: سیکھنا، بڑھنا، اور اپنے خاندانوں کا نام روشن کرنا-

ایمان کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا- اس کا ایک بڑا بھائی فراز تھا، جو انجینئرنگ کے آخری سال کا محنتی طالب علم تھا- ماں گھر پر بچوں کے لیے دعا گو رہتی تھیں اور باپ محنت مزدوری کر کے اس گھر کی بنیاد مضبوط رکھنے کی کوشش کرتے تھے-

فراز ایمان کو ہمیشہ نصیحت کرتا:

"دیکھو بہن، نئے ماحول میں نئی آزمائشیں بھی ہوتی ہیں- لوگ باتوں میں بہکاتے ہیں- بس اپنی پہچان اور مقصد مضبوط رکھنا، کبھی کمزور نہ پڑنا-"

ایمان یہ باتیں دل میں اتار کر یونیورسٹی آئی تھی- وہ ہر اس قدم سے بچنا چاہتی تھی جو اس کے والدین کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائے-

جامعہ النور میں مختلف مزاج کے طلبہ تھے- کچھ سنجیدہ، کچھ شرارتی، کچھ غفلت کے مارے، اور کچھ ایسے بھی جو دوسروں کے لیے روشنی کا چراغ تھے-

ایمان کے سیکشن میں ایک لڑکی عنبر تھی جو بے حد تیز زبان، آزاد خیال اور سب کو اپنی چالاکی میں لپیٹ لینے والی تھی- دوسری جانب حریم تھی، جو چپ چاپ رہتی مگر دل سے نیک اور دوسروں کی مدد کرنے والی-

لڑکوں میں شیراز نامی لڑکا نمایاں تھا— ذہین، باوقار، اور ہمیشہ کلاس میں سب سے آگے بیٹھنے والا طالبعلم تھا- وہ ہر طالب علم کی عزت کرتا تھا اور کسی بھی گفتگو میں احترام کی حدیں قائم رکھتا تھا-

ایمان نے جلد ہی سمجھ لیا کہ کون لوگ اس کے رستے کے مسافر ہیں اور کون راہوں سے بھٹکانے والے۔

ایک دن عنبر نے ایمان اور ثانیہ کو اپنی میز پر بلایا۔

عنبر نے ہنستے ہوئے کہا:

"کیوں ایمان؟ تم ہر وقت کتابوں میں گھسی رہتی ہو۔ یونیورسٹی پڑھنے کے ساتھ تھوڑا مزے بھی لیے جاتے ہیں۔ ہم لوگ آج رات ایک نئی جگہ جا رہے ہیں... تم بھی چلو۔"

ایمان نے نرمی سے جواب دیا:

"میں یہاں پڑھنے آئی ہوں، اپنی ذمہ داری نبھانے۔ مجھے وہ کچھ نہیں کرنا جس سے میرے ماں باپ کا دل دکھے یا وقت ضائع ہو۔"

عنبر نے ناک چڑھا دی، مگر ایمان کے اندر ایک عجیب سا اعتماد پیدا ہوا۔ اس نے خود کو مضبوط ہوتے محسوس کیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ بعض فیصلے چھوٹے ہوتے ہیں مگر انسان کی پوری شخصیت کا تعین کر دیتے ہیں۔

اگلے کچھ دن ایمان بہت مصروف رہی۔ اس کا بھائی فراز کبھی کبھار یونیورسٹی آ کر اسے لیتا تھا۔

ایک شام فراز غیر معمولی طور پر سنجیدہ تھا۔ اس نے پوچھا:

"ایمان، سب ٹھیک تو ہے؟ کوئی مشکل تو نہیں؟"

ایمان نے حیرت سے کہا: "نہیں بھائی، سب ٹھیک ہے۔ کیا ہوا؟"

فراز نے آہستہ کہا:

"بس خیال رکھو۔ یونیورسٹی کی زندگی خوب صورت بھی ہے اور پُر لرزش بھی۔ کچھ لوگ تمھیں تم سے چھیننے کی کوشش کریں گے — تمھاری محنت، تمھاری نیکی، تمھاری پہچان۔"

ایمان نے بھائی کی آنکھوں میں وہ پریشانی دیکھی جو ایک بہن کو زمانے سے بچانے کی خواہش رکھتی ہے۔ اس نے دل میں عہد کیا کہ اپنے خاندان کی عزت کبھی مجروح نہ ہونے دے گی۔

ایک ہفتے بعد کلاس کا ایک اہم گروپ پراجیکٹ تھا۔ ایمان، ثانیہ، حریم، عنبر اور دو لڑکے، عمار اور بلال ایک ہی گروپ میں آ گئے۔

کام شروع ہوا تو عنبر نے بے ایمانی سے کام کا بیشتر حصہ عمار پر ڈال دیا اور سب کو غیر ضروری کام دے دیے۔ اسی دوران وہ دوسروں کے خیالات چوری کر کے اپنی کارکردگی بہتر دکھانا چاہتی تھی۔

ایمان نے بات کو فوراً بھانپ لیا۔

اس نے بیٹھ کر پوری رات پراجیکٹ کے اہم نکات لکھے، ثانیہ اور حریم کے حصے بہتر کیے، اور عمار کو بھی سمجھایا کہ گروپ ورک میں

ہر کوئی برابر ہوتا ہے۔
پراجیکٹ جمع ہونے کے دن استاد نے سب کے سامنے کہا:
''میں نے دیکھا کہ اس گروپ میں نظم، محنت اور دیانت سب سے زیادہ ہے۔ اس کا کریڈٹ ایمان کو جاتا ہے، جس نے پوری ٹیم کو سنبھالا۔''
عنبر کا چہرہ بجھ گیا، مگر ایمان کا سر جھکا رہا— عاجزی سے، غرور سے نہیں۔
ایک دن یونیورسٹی میں ایک سیمینار ہوا جس کا عنوان تھا:
''کردار، علم اور ذمہ داری''
ایمان نے تقریب میں تقریر کی۔ اس کی آواز میں سچائی کی گہرائی اور تجربے کی پختگی تھی:
''جامعہ میں ہم صرف کتابیں نہیں پڑھتے، ہم اپنی زندگی بھی لکھتے ہیں۔ یہاں قدم قدم پر راستے بدل جاتے ہیں۔ کچھ راستے آسان ہوتے ہیں، مگر انجام مشکل... اور کچھ مشکل راستے ہوتے ہیں جن کا انجام روشنی ہے۔
ہم سب کو یہ فیصلہ خود کرنا ہوتا ہے کہ ہم کس منزل کے مسافر ہیں۔ علم عزت دیتا ہے، مگر کردار انسان بناتا ہے۔''
ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس دن نہ صرف ایمان کو عزت ملی بل کہ اس کی بات بہت سے طلبہ کے دل تک اتر گئی۔
کچھ دن بعد عنبر نے ایمان کو روکتے ہوئے کہا:
''میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ میں نے تمہیں کمزور سمجھا تھا، لیکن تمھاری مضبوطی نے مجھے بدل دیا۔ میں چاہتی ہوں کہ میں بھی وہ بن سکوں جس پر میرے والدین فخر کریں۔''
ایمان نے مسکرا کر جواب دیا:
''انسان وہی بدلتا ہے جس کے دل میں سچائی ہو۔ آج تم نے پہلا قدم اٹھالیا، باقی اللہ بہتر کرے گا۔''
چار سال بعد ایمان نے نہ صرف پوزیشن لی بل کہ اپنی مضبوط شخصیت کے باعث سینکڑوں طالبات کے لئے مثال بن گئی۔
فراز نے بہن کی گریجویشن میں آنکھوں میں آنسو لئے کہا:
''میں نے تمھیں نصیحت کی تھی، مگر تم نے اس نصیحت کو حقیقت بنادیا۔''
ایمان نے جواب دیا:
''اگر راستہ درست ہو تو منزل خود بخود خوب صورت ہو جاتی ہے۔''
یوں ایمان نے ثابت کردیا کہ
یونیورسٹی صرف علم دینے کی جگہ نہیں، بل کہ انسان تراشنے کی درسگاہ ہے۔
اور جو طالب علم اپنے اصولوں پر ڈٹ جائیں، دنیا کی کوئی گمراہی انہیں ہلا نہیں سکتی۔

☆☆☆☆☆

''ساڑھی''

لائبہ خلیل

ٹی وی پر نظریں جمائے ہمہ تن گوش، ایک سحر میں جکڑے ہوئے شخص کے تاثرات لیے، سکرین سے ایک فٹ کے فاصلے پر بیٹھی نور ایک اور ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کے تخیل کی دنیا حقیقی دنیا سے کہیں زیادہ خوب صورت، پُر رونق اور رنگین ہے۔ ٹی وی سکرین پر ملکہ ترنم نور جہاں اپنی تمام تر خوب صورتی، پُر وقار شخصیت، جاذبیت اور دلکشی لیے کانوں میں رس گھولنے والے سُر بکھیر رہی تھیں۔ لیکن وہ دس برس کی معصوم بچی، جسے گیت کے بول سے زیادہ نور جہاں کی شخصیت باندھے ہوئے تھی۔ شاید یہ ہم نام ہونے کا اثر تھا یا کچھ اور، لیکن نور جہاں میں کچھ ایسا تھا جو اسے مسحور کیے رکھتا تھا۔ نور جہاں سے اس کی محبت اور پاگل پن کی حد تک عقیدت کی وجہ سے سب گھر والے اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کہیں نہ کہیں اسے بھی یہ اپنی بے وقوفی ہی لگتی تھی۔ کیمرے کے پیچھے کے لوگوں سے اس قدر محبت پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر پھر بھی نور جہاں میں کچھ ایسا تھا جسے وہ اپنے دل کے بہت قریب، بہت پاس محسوس کرتی تھی۔ وہ جب بھی انھیں سنتی، یوں لگتا جیسے نور جہاں کے سارے گیت، سارے بول اور سارے نغمے فقط اسی کے لیے لکھے گئے ہیں۔ جب بھی ٹی وی پر ان کا کوئی گانا لگتا یا کسی اخبار یا رسالے میں ان کی کوئی تصویر یا خبر چھپتی، وہ لمحہ نور کی عید ہوتا تھا۔ اس لمحے اسے دنیا کی ہر چیز بے معنی اور ہر رنگ پھیکا لگتا تھا۔ وہ ان سے ملنا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی اسے کسی آٹوگراف کی ضرورت تھی اور نہ ہی وہ تحفے تحائف کے ذریعے اپنی محبت اور عقیدت کا ثبوت دینا چاہتی تھی۔ نہ ہی اس نے کبھی نور جہاں کی جگہ خود کو تصور کیا اور نہ ہی کبھی دل ہی دل میں ان کی جگہ لینا چاہتی تھی۔ وہ تو بس ایک مداح تھی، پاگل پن کی حد تک محبت کرنے والی اور پاگل پن بھی ایسا جو ظاہر نہ ہوا ہو۔ اور اس پاگل پن میں وہ زندگی کے دن خوشی خوشی گزار رہی تھی۔

وہ بارہ برس کی تھی جب گھر میں چھوٹے چچا کی شادی کی بات ہوئی۔ ایک دو مہینے میں سب کچھ طے ہو گیا اور زور و شور سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ رنگ برنگے کپڑے، نت نئے جوڑے، گوٹے کنارے

والے دوپٹے، غرض ان چند مہینوں میں اس نے کپڑوں اور انسانوں کے وہ وہ رنگ دیکھے جو پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ خواتین کی آپس کی مقابلہ بازی، گھریلو سیاسی معاملات، ایک سے بڑھ کر ایک دکھنے کی خواہش لیے پانی کی طرح پیسہ بہاتی اس کے خاندان کی خواتین، ڈھول ڈھمکے، آتش بازی، چراغاں، نت نئے پکوانوں پر پیسے لٹاتے خاندان کے مرد، اس شادی میں اس نے ہر کسی کا وہ روپ دیکھا جو زندگی کی بارہ خزاؤں میں نہ دیکھا تھا۔ شاید یہ کئی سالوں بعد گھر میں ہونے والی تقریب کی خوشی تھی یا چچا جان کی سرکاری کرسی کا دبدبہ، ہر کوئی ایسے تیاریوں میں مگن تھا جیسے کہیں ان کی کمی بیشی کی وجہ سے شادی کی چکا چوند میں کمی نہ آجائے۔ غرض یہ کہ ہر کوئی اپنا اپنا دائرے دوسروں کے دائروں سے وسیع کرنے کے چکروں میں تھا۔

دنیا و مافیہا سے بے خبر نور اپنی ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے جیسے نہ کسی کے لہنگے کی پرواہ تھی نہ کسی کے غرارے یا پوشاک کی۔ نہ اسے ڈھول ڈھمکے سے دلچسپی تھی نہ آتش بازی اور پکوانوں سے۔ وہ تو ہر لمحے بدلتے رنگوں اور کچے دھاگوں سے بندھے رشتوں میں ہی کہیں اٹکی ہوئی تھی۔ لیکن جب ایک دن گھر کی سب خواتین بڑے صحن میں بیٹھی نیلے پیلے، لال گلابی، گوٹے کناری، چنری، مالا اور موتی سے مزین دوپٹے بانٹ رہی تھیں اور وہ سب سے آخری چارپائی کے کونے میں بیٹھی پچھلے ماہ کا رسالہ کھنگال رہی تھی، تو اس کی تائی اماں نے پوچھا ”کیوں بھئی نور تم نے بھی کچھ پہننا ہے شادی پر یا ایسے ہی سوگ نما کپڑوں میں چچا کی شادی بھگتانی ہے؟“ ابھی وہ سوال سمجھ ہی نہ پائی تھی کہ اس کی اماں جلدی سے بولیں، ”ارے بھئی کیوں؟ سوگ منائیں دشمن، میں تو اپنی نور کے لیے سبز رنگ کی بڑی خوب صورت سی پوشاک بنوا رہی ہوں۔ دیکھنا کیسے کھلتی ہے میری بیٹی۔ حور لگے گی حور“۔

اماں پتہ نہیں تائی کو جتا رہی تھیں یا نور کو بتا رہی تھیں وہ سمجھ نہ پائی۔ وہ چپکے سے اٹھی اور رسالہ لے جا کر تائی اماں کو دکھایا: ”بڑی اماں میرا دل چاہ رہا ہے میں نور جہاں کے جیسی ساڑھی پہنوں جیسی اس نے ادھر پہنی ہوئی ہے۔ دیکھیں کتنی خوب صورت لگ رہی ہے۔“ یہ سنتے ہی تائی اماں نے ایک بلند قہقہہ مارا اور بولیں: ”اے بھئی سن لو سب۔ یہ چلی چلی نور جہاں بننے۔ بہن پہلے دوپٹا ڈھنگ سے تو اوڑھنا سیکھ لو پھر ساڑھی کا پلو بھی سنبھال لینا۔“

یہ کہہ کر تائی اماں ہنستے ہوئے سنہری گوٹے والا آتشی گلابی دوپٹا اپنے سر پر لے کر آئینے میں خود کا جائزہ لینے لگیں۔ اماں نے نور کی طرف گھورا اور وہ بھی اپنے کام میں لگ

گئیں۔ نہ جانے ان نظروں میں غصہ تھا، تائی اماں کے مذاق کی شرمندگی تھی یا اپنی تربیت پر اٹھائے گئے سوالوں کا گھاؤ۔ لیکن اماں کی نظریں نور کو اندر تک وار کرتی محسوس ہوئیں۔ وہ خاموشی کی چادر اوڑھ کر رسالے کے صفحے الٹنے لگی۔ پھر کچھ سوچ کر رسالہ ایک سائیڈ پر رکھ دیا اور دوپٹہ کندھوں سے ہٹا کر سر پر اوڑھ لیا۔

چچا کی شادی کے دن وہ سبز پوشاک میں ملبوس زرق برق ملبوسات میں چمکتی دمکتی خواتین کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ عزت کا معیار صرف دوپٹہ ہی کیوں ہے؟ دوپٹہ سر سے سرک جانا کسی کی شرافت، تربیت اور عزت پر سوال کیوں اٹھاتا ہے؟ اور یہی عزت، شرافت اور تربیت شادی بیاہ کے موقع پر نمائش پر کیوں لگ جاتی ہے۔ کیا تب تک کے لیے معیار کہیں چھپ جاتا ہے یا بند کمرے میں الماری کے سب سے اونچے دراز میں چھپا کر تالا لگا دیا جاتا ہے؟ وہ جان نہ پائی۔ اس نے اپنے گجرے سے پھول نکال کر اپنے بالوں میں اڑس لیا۔ شاید وہ نور جہاں سے عقیدت تھی یا دل کو دیا گیا ایک بہلاوا۔ پتہ نہیں وہ کیا تھا۔ مگر اس لمحے اسے کچھ تو ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنے بالوں سے وہ پھول نکال کر پھینک دیا اور پھر سے سنہری لیس والا سبز دوپٹہ سر پر اوڑھ لیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ وقت کیسے گزر گیا پتہ بھی نہیں چلا۔ وقت تو گزر ہی جاتا ہے۔ اسے گزرنا ہی ہوتا ہے۔ اب گزارنے والوں کی دل لگی کے لیے ٹھہر تو نہیں سکتا۔ لیکن نور وقت کیسے گزار رہی تھی وہی جانتی تھی۔ اسے لگتا تھا ہر گزرتا ہوا لمحہ، گھنٹے، دن اور سال، یہ سب اس کے گرد حصار باندھ رہے ہیں۔ اس ایسے لگتا تھا اس کا وقت گزر نہیں رہا بلکہ تہہ در تہہ اسے اپنے اندر غرق کر رہا ہے۔ ہر گزرتا دن اس کی خواہشات کے گرد ایک جال بنا رہا ہے۔ اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس جال کے اندر دھنستی چلی جا رہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں وقت بہت ظالم شے ہے۔ لیکن نور کو لگتا تھا وقت ایک مکار جادوگرنی ہے جو بظاہر غائب ہو جاتی ہے اور یوں لگتا ہے گزر گئی۔ لیکن پھر دوبارہ اپنا بھیانک، مکار اور خوفناک چہرہ لیے نمودار ہو جاتی ہے اور اگلی بار آپ کی تمام خامیوں، کمزوریوں اور مجبوریوں سے آشنا ہو کر وار کرتی ہے۔

وقت کی جادوگرنی نے ایک دفعہ پھر اس پر منتر پھونکا تھا۔ ایک دفعہ پھر اسے لاحاصل خواہشات کے حصار میں جکڑا تھا۔ ایک دفعہ پھر اس کی خواہشات کے جنازے پر جشن منایا تھا۔ بس اس دفعہ جادوگرنی نے نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ پہلے تو اس پر کم عمری کی حد لگی تھی۔ لیکن اب تو وہ بائیس سال کی تھی۔ اب تو وہ دوپٹہ سنبھالنا جان چکی تھی۔ اب تو اس کے سگے بھائی کی شادی تھی۔ اب تو

بقول اس کے "بڑوں" کے، وہ جوان جہان اور بیاہ کے قابل تھی۔ لیکن پھر اب اس کی خواہش کو کیوں کچلا گیا تھا۔ اب اس کو کیوں کہا گیا تھا کہ ساڑھی شادی شدہ خواتین کا لباس ہے۔ اب اسے کیوں احساس دلایا گیا تھا کہ غیر شادی شدہ خواتین کا ساڑھی پہننا معیوب ہے۔ اب پھر سے کیوں اسے وقت کی ایک اور تہہ میں دبا دیا گیا تھا؟ لیکن وہ تو جیسے وقت کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کے رہ گئی تھی۔ معاشرے نے اس کے وقار کو بحال رکھنے کے لیے اسے شادی کے زنجیر نما بندھن میں تو باندھ دیا تھا لیکن وقت کی جادوگرنی ایک نئے منتر سے وارد ہوئی تھی۔ اس دفعہ اس کا نیا حربہ تھا۔ اب تو وہ شادی شدہ بھی تھی، پھر اب کیوں؟ اب کیوں اس کی خواہش کو صرف اس لیے دبا دیا گیا کہ باہر جاتے ہوئے ایسا لباس نہیں پہنا جاتا۔ اب کیوں سسرال کے رشتہ داروں نے اس کے وقار کا پیمانہ طے کیا تھا۔ اب کیوں اسے بتایا گیا تھا کہ شوہر کے رشتہ دار ایسے لباس کو پسند نہیں کرتے؟ اب کیوں اسے احساس دلایا گیا تھا کہ اس کے شوہر کی عزت اس کی عزت ہے اور اس کے ساڑھی پہننے سے شوہر کی عزت پر حرف آتا ہے۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ ساڑھی کوئی معیوب یا غیر شرعی لباس نہیں ہے۔ پھر کیوں اس پر سماجی پابندی لگائی گئی تھی؟ کیوں چند برس بعد ایک بار پھر اس کی خواہشات کی ڈور پر وقت کی جادوگرنی نے ایک اور طلسم پھونکا تھا۔ ایک بار پھر اپنے بیٹے کے عقیقے پر اس کو ساڑھی پہننے سے منع کیوں کیا گیا تھا؟ کیوں اس دفعہ اس پر موٹاپے کی حد لگائی گئی تھی؟ کیوں اس کو احساس دلایا گیا تھا کہ اگر وہ ساڑھی پہنے گی تو بدنما لگے گی؟ کیوں اس کو اس وہم میں مبتلا کیا گیا تھا کہ اگر وہ خوش و خرم نظر آتی ہے تو اس کے بیٹے کو نظر بد لگ جائے گی۔ ایک بار پھر اولاد کی خاطر اس نے جادوگرنی کا وار برداشت کرتے ہوئے اپنے اوپر زنجیروں کی ایک اور تہہ جمالی تھی۔

خواہشات بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں نا۔ کسی کے لیے تو جام امر اور کسی کے لیے زہر کا پیالہ، کسی کے لیے جینے کا مقصد اور کسی کے لیے وجہِ موت، کسی کے لیے آزادی اور کسی کے لیے باعث قید، کسی کے لیے زندگی کی امنگ اور کسی کے لیے مایوسی۔ خواہشات پر تو کسی کا بس نہیں ہوتا۔ پھر ایک شخص کی خواہشات دوسرے کے لیے باعث احساس کمتری کیوں بن جاتی ہیں؟ اپنے جھوٹے وقار کو بچانے کے لیے اپنے سے کمزور کی خواہشات کو کیوں کچلا جاتا ہے؟ کیوں کسی کی خواہشات پر مذہبی، سماجی، خاندانی اور معاشرتی حدیں لگائی جاتی ہیں؟ خواہشات کے سہارے تو لوگ زندگیاں گزار دیتے ہیں پھر کیوں نور کی خواہش،

ایک معصوم سی خواہش کو پورا نہ ہونے دیا گیا؟ کیوں اس پر بھی حدود و قیود کی مہر لگا کر تو کبھی وقار کا مسئلہ بنا کر صندوق کے کسی آخری کونے میں بند کر دیا گیا؟ اس کی خواہش سے کسی کو جانی یا مالی نقصان تو نہ پہنچ سکتا تھا پھر کیوں اس کو جذباتی طور پر اس قدر دبا دیا گیا کہ وہ کھل کر اظہار بھی نہ کر سکے؟ اب تو وقت کی جادوگرنی جیسے اس کی بری قسمت کی سہیلی بن گئی تھی۔ اب تو اس پر زندگی بھر کی ایک قید لگ چکی تھی۔ ساڑھی تو کجا وہ تو اب کوئی رنگ بھی نہ پہن سکتی تھی۔ اب وہ بیوہ جو ہو چکی تھی۔ لیکن اب کی بار اس کو کسی نے نہ روکا۔ نہ ہی اس پر عمر کی قید تھی نہ ہی کسی کی عزت یا وقار بچانے کی پابندی کیونکہ اب کی بار اس نے اپنی کوئی خواہش صندوق سے باہر ہی نہ نکالی تھی۔

اب اس نے بیوگی کا روپ جو لے لیا تھا۔ وہ ایک بار پھر سے اپنی خواہشات کا جنازہ اٹھتا نہ دیکھ سکتی تھی۔ اگر وہ کبھی اپنی خواہش کا اظہار کر بھی دیتی پھر بھی تو اس پر بے شرمی کی مہر ہی لگنی تھی۔ اس میں اب مزید سکت نہ بچی تھی کہ ایک بار پھر اپنی خواہش کا قتل عام ہوتے دیکھ سکتی۔

اب کی بار وقت کی جادوگرنی اپنی بہت ہی دیرینہ اور پرانی سہیلی کو ساتھ لائی تھی۔ شاید اب کی بار ایک آخری اور کاری وار کرنا چاہتی تھی۔ شاید اب کی بار وہ اس کھیل کا خاتمہ کرنا چاہتی تھی۔ شاید اب وہ بھی تھک چکی تھی یا شاید اب کوئی نیا شکار ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ بہر حال جو بھی تھا، وقت کے اس وار نے اسے جادوگرنی کی سہیلی کی آغوش میں پھینک دیا تھا۔ اس آغوش کی گرمائش یا شاید ٹھنڈک ہی کچھ ایسی تھی کہ نور کی خواہش راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی طرح بھڑک اٹھی۔ خواہشات بھی کبھی مرتی ہیں کیا، ایک دفعہ جب یہ پیدا ہو جائیں تو جونک کی طرح چمٹ کر رہ جاتی ہیں، پل پل خون چوستی ہیں مگر ان کو خود سے الگ کرنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ نور کی خواہش نے بھی آج کئی برسوں کے بعد وقت اور اس کی سہیلی کے مشترکہ وار سے چھلنی ہو کر انگڑائی لی تھی۔ آج پھر سے اس کی خواہش میں تکمیل کی امید پیدا ہوئی تھی۔ کاملیت کا نشہ ہی ایسا ہے۔ مر جاتا ہے انسان۔ مٹی میں مل جاتا ہے لیکن مکمل نہیں ہوتا۔ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی نامکمل سا محسوس ہوتا رہتا ہے۔ شاید ہماری کاملیت میں ایسی ہی خواہشات کے جنازے ہوتے ہیں۔ شاید ہماری نامکمل خواہشات کی بھٹکی ہوئی روحیں ہی ہمیں بے چین کیے رکھتی ہیں۔ تبھی آخری سانس تک ہم کاملیت کے لیے جستجو کرتے رہتے ہیں۔ اپنے اندر کے خلا کو پر کرنے کی جستجو ہی ہمیں موت کی آغوش میں لے جاتی ہے۔

اس آغوش میں پڑے پڑے نور میں

آخری بار امید کی کرن جاگی تھی۔ اس نے ہسپتال کے بیڈ پر لیٹے ہوئے آخری لمحات میں اپنی بیٹی کو اپنے پاس بلایا اور بہت امید سے اسے وصیت میں کہا کہ جب میں مر جاؤں تو میرے کفن کو میرے گرد ساڑی کی طرح لپیٹ دینا۔ بالوں کا جوڑا بنا کر اس میں ایک کھلتا ہوا سرخ گلاب لگا دینا۔ زندگی نے تو کوئی خواہش پوری نہیں کی شاید موت کی دیوی ہی مہربان ہو جائے۔۔۔ بس اتنی ہی مہلت ملی تھی اسے اپنی خواہش کا اظہار کرنے کی۔ پھر وہ وقت کی جادوگرنی اور اس کی سہیلی کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اس دنیا، اس کے فریب، معیار، حدود اور زنجیروں سے آزاد ہو کر چل پڑی۔

عجیب سی کشمکش میں تھی نور کی بیٹی۔ سب کو بتاتی ہے تو اعتراض ہوگا۔ چھپاتی ہے تو اُن کی روح کو تکلیف ہوگی۔ کرے تو کیا کرے۔ جب اِس کا ذکر اُس نے بھائی سے کیا تو وہ گرج پڑا: "عجیب ہی خواہش تھی امی کی۔ بھلا کوئی ایسے بھی کرتا ہے؟ دیکھا ہے کسی کو آج تک ساڑھی کا کفن پہنے؟ مذہب اجازت دیتا ہے کیا؟ وصیت کیسے پوری ہو؟ ویسے بھی غیر اسلامی وصیتوں کو ماننے کا حکم نہیں ہے، شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اب کون سا امی دیکھنے آئیں گی کہ ساڑھی پہنائی گئی ہے کہ نہیں۔ مگر اللہ کو تو منہ دکھانا ہے نا۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ تدفین عین اسلامی طریقے سے ہوگی۔ مرنے والے خود تو مر جاتے ہیں پیچھے چھوڑنے والوں کو ایسی بہکی ہوئی خواہشات میں الجھا کر چلے جاتے ہیں۔ کسی اور سے اس بات کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خواہ مخواہ مفت کی بدنامی پلے پڑے گی"۔

مرتی کیا نہ کرتی۔ چپ کر گئی۔ کیسے بتا سکتی تھی کسی کو۔ دل تو کر رہا تھا اس کا کہ ماں کے جنازے کے ساتھ ایک چارپائی پر ماں کی خواہش کی لاش بھی رکھ دے۔ چیخ چیخ کر ماتم کرے، رو رو کر آسمان پھاڑ دے، دہائیاں دے، دھاڑیں مارے۔ مگر تھی تو وہ نور ہی کی بیٹی نا، چپ کر گئی۔ وقار، عزت اور خاندانی معیار کی خاطر، ہی لی زبان اس نے بھی۔ آخر ماں کی وراثت کی لاج بھی تو رکھنی تھی نا۔ اور کیا دے سکتی ہے ایک ماں بیٹی کو وراثت میں۔ سب کچھ تو لے جاتے ہیں دنیا والے۔ خواہشات، امیدیں، امنگیں زندگی کے رنگ، قہقہے، رونقیں۔ سب کچھ لٹ جاتا ہے۔ بچ جاتی ہے بے بسی اور خاموشی۔ بس یہی نسل در نسل مائیں بیٹیوں کو وراثت میں بانٹتی جاتی ہیں۔ نور کی بیٹی نے بھی خاموشی اور بے بسی کی چادر کو اپنے سر پر مضبوطی سے کس لیا اور سامنے پڑے ہوئے دو جنازوں پر دل ہی دل میں فاتحہ پڑھ لی۔

☆☆☆☆☆

قہقہہ [افسانچہ]

اسعد کی موت کو ایک سال گزر چکا تھا، مگر اس کا عکس آج بھی میرے ذہن میں زندہ تھا۔ پچیس برس کی عمر، یہ تو زندگی کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے، مگر اس کے لیے یہی آخری ثابت ہوئی۔ میں اس دن اس کے چھوٹے بھائی اسامہ سے ملنے گیا۔ باتوں باتوں میں اس کی موت کا ذکر چھڑ گیا۔ اسامہ نے دھیرے سے کہا، ”بھائی جان کچھ دنوں سے عجیب سے تھے... ملکی حالات، گھریلو ناچاقیاں... سب کا بوجھ اپنے دل پر لیے پھرتے تھے۔“

پھر وہ لمحہ بیان کرنے لگا، ”اس رات تو وہ ہنسی مذاق میں لگے رہے۔ جیسے سارے غم اتار پھینکے ہوں۔ صبح کے قریب کمرے میں گئے۔ اور پھر... پھر وہ کبھی نہیں جاگے۔“

اسامہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

میں نے پوچھا، ”اس رات کچھ غیر معمولی ہوا تھا؟“ وہ رُک کر بولا، ”ہاں... ایک بات پر انھوں نے ایسا قہقہہ لگایا کہ میں حیران رہ گیا۔ زور سے... اتنا زور سے کہ لگا جیسے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہو۔“

میں چپ رہا۔ بس ذہن میں وہ منظر ابھر آیا۔ اسعد کا وہ آخری قہقہہ۔ شاید وہ زندگی سے مذاق کر رہا تھا، یا موت کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا، کاش میں بھی ایک ایسا قہقہہ لگا سکوں... اتنا زور سے کہ زندگی سنبھل نہ سکے، اور موت حیران رہ جائے کہ یہ ہنسنے والا اب کس کے ساتھ ہے۔

☆☆☆☆☆

خالد نذیر

''ڈوبی آپ کا ایلف رہے گا'' [خالہ کی رخصتی پر احساس]

محمد علی راحیل خان

جس رات میں واڈیز ہاؤس پہنچا تھا میں آپ کے کمرے (ملیو روم) میں بیڈ پہ بیٹھا حیران ہو کر سوچ رہا تھا خود کو یقین دلا رہا تھا کل میری بہترین دوست کی شادی ہے۔ اس وقت ماسورشنا یا آپ یا کوئی اور کافی پھینٹ رہا تھا۔ میں نے خود سے کہا میں یہاں دس دنوں کے لیے ہوں اور کل میری بہترین دوست کی شادی ہے میں مبالغہ آرائی نہیں کروں گا کہ مجھے دکھ ہوا بلکہ مجھے ایک قسم کی تقریباتی مسرت تھی

چینی (دوست کا نک نیم) جو میڈیکل یونیورسٹی میں ہوا کرتی تھی رات گئے تک برگد کے تنے جیسی موٹی موٹی کتابوں کے ساتھ پڑھائی میں مگن وہ انگلش ناول وہ ڈائریاں وہ سجا ہوا سٹڈی سیٹ اپ جو آپ کا تھا وہ کیا ہوا۔

وہ چینی جس نے ایک دفعہ حیران کن انداز میں اپنے امتحان کی تیاری کی تھی اور ساتھ کے ساتھ میں تھا جو اپنے کیڈٹ کالج امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔

وہ چینی جو چھٹیوں میں گھر آیا کرتی تھیں اور ماما مجھے کہتیں

''اس بار نانماں کے گھر جائیں گے تو وہاں چینی ہوگی'' اور میں فرط مسرت سے لبریز ہو جاتا۔

وہ چینی جو میرے چھوٹے ٹرائی سائیکل کے ساتھ اپنی سائیکل چلایا کرتی تھیں جس کے سکول سے آنے پہ میرے بچپن کے کھیلوں کی امید بندھی ہوتی تھی۔

وہ جو کافی بناتی تھیں نوڈلز کی مختلف ریسپیز بناتی اور میں نے اسے چکن چیز پراٹھا کا تعارف کرایا۔ ہم لیپ ٹاپ پر موویز دیکھتے تھے۔ ہم سب سے اوپر والی چھت پر رات کو چلتے تھے۔ کبھی لان میں تو کبھی ٹیرس پہ محفل جماتے۔

''وہ دیکھو'' کہہ کر ایک دوسرے کو کچھ دکھانے والا ہنسی سے بھرا وقت

ہم نے اپنی تخیلاتی hood world بنا رکھی تھی

ہم گپ شپ لگاتے ایک دوسرے کی نفسیاتی تھراپی سیشن کرتے ایک دوسرے

کے بکے والے دوست

وہ سب بچپن لڑکپن کی یادیں اور اب ---

کل آپ کی شادی ہونے والی ہے نیا گھر

نئے فرائض نئی زندگی نئے امور پر

توجہ ---- اور -- میں سی سی ایچ لوٹ

جاؤں گا میں نے دل میں کہیں محسوس کیا کہ

Dobby the elf اور ماسٹر

johnathama کا تعلق کھو گیا

کتابوں میں، شلیف کے پیچھے ' یادوں

میں بند' کبھی کبھار کی ملاقاتوں میں ہنسنے اور

دہرانے کے لیے مگر میں نے وعدہ کیا اپنے

اپ سے وعدہ کیا ہم اس چمک کو جاری

رکھیں گے-

ہوسکتا ہے آپ مجھے آئندہ کبھی اکیلے نہ مل

پائیں آپ کے ہمراہ shaky ہو- تو

کیا ہوا-

ہم ابھی فن کر سکتے میں کسی دن اپ کے گھر

کراچی رہنے آؤں -- چنانچہ بجائے اس

کے کہ اس شادی کو ہمارے تعلق کو محدود

کرنے کا ذریعہ سمجھا جائے اسے مزید

وسعت پاتا دیکھا جا سکتا ہے اس (شادی)

نے افق کو قفل نہیں لگائے اس نے افق پہ

مزید رنگوں کا اضافہ کیا ہے- اس بات کی

مکمل مثال بنتے ہوئے اس رات میں نے

جدائی کے آنسو نہیں بہائے میں نے خوشی

کے تئے دوری کو سانس میں بسایا ان شااللہ

میں رخصتی کے دن خوش تھا خوشی خوشی سب

کو مل رہا تھا سجاوٹ بھری جگہ ' محبتیں'

دعائیں -- میں آپ کی bride

maid تھا اور فوٹو شوٹ میں ساتھ ساتھ

تھا معاون مددگار -- آپ خوبصورت بہادر

اور تیار مورتی لگ رہی تھیں-

پھر جب آپ کی رخصتی ہوئی میں کیوں

پھوٹ پھوٹ کر رو دیا- جھوٹ نہیں بولوں

گا میں نے سچ مچ دھاڑیں مارنا شروع کر

دی یہاں تک کہ پون خالہ نے مجھے تسلی

دینے کی کوشش کی

یہ ایک اچانک بنیادی احساس تھا

ہم دونوں کی زندگیوں میں تبدیلی کا -- یہ غم

نہ تھا میں غمگین نہیں تھا اور نہ کبھی ہوں گا

ایک چیز ہے جو مجھے غمگین کرتی ہے کہ میں

کبھی اپ کی جرابیں نہیں لینا چاہوں گا

(ہیری پورٹر میں Dobby ایک نوکر

ذات مخلوق ہے ایلف ہے اس کے آزاد

ہونے کے لیے ہیری پورٹر کو اپنا کوئی کپڑا

دینا تھا تو اس نے اپنی جرابیں دے کر اسے

گویا آزادی کا تحفہ دیا تھا)

☆☆☆☆☆

خواب اور زندگی

بھئی جلدی کرو مریم۔ گاڑی کا وقت قریب آ رہا ہے ابھی تم نے سٹیشن پہنچنا ہے۔ بھائی جان مجھے وقت کا احساس دلا رہے تھے۔ افراتفری میں بچے کھچے کپڑے اٹیچی میں ٹھونسے اور تیاری مکمل کی۔ بھائی جان سٹیشن تک ساتھ آ رہے تھے۔ راستے میں رکشے کا ٹائر پنکچر ہونے سے اور بھی وقت تنگ ہو گیا۔ جونہی ہم پلیٹ فارم پر پہنچے گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ بھائی جان نے ایک ڈبہ میں اٹیچی پھینکتے ہوئے مجھے ڈبہ میں سوار ہونے میں مدد دی۔ اب گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس بھاگم بھاگ میں میری سانس میں بھی تیزی آ گئی۔ ڈبہ میں نظر دوڑائی تو ایک نشست خالی نظر آئی۔ اٹیچی گھسیٹ کر نشست کے برابر رکھا اور بیٹھ گئی۔ ایک صاحب نے مجھے آگاہ کرتے ہوئے کہا بہن جی! یہ جگہ خالی نہیں مسافر ابھی بیت الخلا گیا ہے۔

”ٹھیک ہے سانس تو بحال کرنے دیں مسافر کے آنے پر اُٹھ جاؤں گی۔ میں نے دل ہی میں جواب دیا۔

ابھی میں سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ وہ صاحب تشریف لے آئے۔ میں نے اُٹھنا چاہا تو اس نے کہا مریم بیٹھی رہو۔ میں جو نظریں نیچی کیے بیٹھی تھی اُس کی زبان سے اپنا نام سُن کر بے اختیار میری نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ اُف میرے اللہ! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ میرے دل و دماغ میں ایک ہیجان بپا ہو گیا۔ میرے کانوں میں یکدم سیٹیاں بجنے لگیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت سی گاڑیاں مل کر سیٹیاں بجا رہی ہوں۔ پوری گاڑی گھومتی ہوئی محسوس ہونے لگی جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ گاڑی نہ جانے کس رفتار سے آگے دوڑے جا رہی تھی اور میں اس سے کہیں زیادہ تیز پیچھے کی طرف دوڑنے لگی۔ اس سے قبل کہ میں چکرا کر گر جاتی۔ اس نے مجھے سنبھالا دیتے ہوئے نشست پر بیٹھا دیا۔ وہ میری غیر متوقع حالت دیکھ کر خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے ہوش سنبھالا تو اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔ میں نے کنکھیوں سے جائزہ لیا کہ تمام مسافر ہمیں ٹیڑھی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یوں تو لب خاموش ہیں مگر آنکھوں میں اَن گنت سوال ہیں۔ اور میری حالت تھی کہ مارے شرم سے جیسے زمین پر گڑھی جا رہی تھی۔ میں بھلا کیا جواب دیتی۔ اس شخص نے مجھے اس قابل چھوڑا ہی کہاں تھا کہ معاشرے میں کسی کو جواب دے سکتی۔

نازا کاڑوی

گاڑی اپنی پوری رفتار سے اپنی منزل کی جانب رواں تھی۔ گاڑی چلتے وقت اس قدر شور ہو رہا تھا کہ بمشکل ہم ایک دوسرے کی بات سن رہے تھے۔ ساجد پھر مخاطب ہوا۔ کہاں جا رہی ہو۔ مریم! میں جواب میں خاموش رہی، شاید تم مجھ سے ناراض ہو اور تمہیں حق بھی پہنچتا ہے۔ ناراض ہونے کا تمہارا مجرم جو ہوں۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ اور کہتا میں بے اختیار بول اٹھی میں ابھی تک اپنے آپ کو قابو کئے بیٹھی تھی ایک گھٹن سی تھی ایک بوجھ تھا دل پہ جو ابھی تک اٹھائے پھرتی تھی۔ موقع ملا تو اتارنے لگی نہیں مجرم تو میں ہوں تمہاری جو ابھی تک سزا بھگت رہی ہوں۔ منصف تو صرف فیصلے کرتا ہے جیسے ایک فیصلہ تم نے بھی سنایا۔ میں نے تو تمہارے فیصلے کے آگے سرخم کر دیا تھا۔ اب وقت کی مرہم نے جبکہ زخم مندمل کر دیئے تھے تو تم نے پھر آج کسی اناڑی جراح کی طرح کند نشتر سے میرے زخموں کو کرید ڈالا۔ اس ریل گاڑی کے تمام مسافر ہم دونوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے درد کی ٹیسیں میری روئیں روئیں سے اٹھنے لگی تھیں خدا کے لئے خاموش رہو ساجد مجھ سے کچھ مت پوچھو۔ مجھ پہ ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ ”مریم آج اپنے دل کا بوجھ اتار پھینکو جو بات تمہارے دل میں ہے، اسے باہر نکالو“ ساجد مجھے مزید بولنے پر اکسا رہا تھا۔

ساجد تمہیں کچھ یاد ہے؟ یاد کرو وہ دن جب تم اپنے ابا اور میرے چچا کے ساتھ پہلی بار ہمارے گھر آئے کتنی عجیب ملاقات تھی۔ تمہارا راستہ میں ایکسیڈنٹ ہوا تو تمہیں چوٹیں آئیں۔ گھر والے جو پریشان ہوئے سو ہوئے میں کسی انجان جذبے کے ساتھ کچھ زیادہ ہی پریشان ہوئی۔ تمہارے صحتیاب ہونے تک دن رات تمہاری تیمارداری کی۔ صحتیاب ہو کر تم گھر لوٹتے ہوئے انعام کے طور پر مجھے اپنی یادیں عنایت کر گئے۔ یہ میری زندگی کا انمول سرمایہ تھیں۔ دنیا والوں کی چور نگاہوں سے بچا کر اپنے دل کی تجوری میں مقفل کر لیں۔ اب تم اکثر ہمارے گھر آنے لگے کسی نہ کسی طرح ہمارے پیار کی بھنک ہمارے گھر والوں کے کانوں تک جا پہنچی۔ ہماری چاہت کو دیکھتے ہوئے اپنے بزرگوں نے اپنی شفقت کا پلاسٹر چڑھا کر مزید پختہ کر دیا۔ ہماری منگنی ہو گئی۔ پھر وہ دن بھی آیا جس کا مجھے اور تمہیں بھی شدت سے انتظار تھا۔ اب تمہارے آنگن میں دلہن بنی سیج پر بیٹھی تھی۔ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔ دل میں فخر اور گھمنڈ آ گیا کہ ہوگا کوئی ہم جیسی قسمت والا۔ جسے چاہا پا لیا۔ میں اس قدر محو تھی کہ تم دبے پاؤں میرے پاس آئے اور مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ اس رات ہماری محبت کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ہماری محبت کے آنگن میں ہر سو بہار ہی بہار تھی۔ اپنی محبت کا گلزار تمہارے اور میرے پیار کی ٹھنڈی چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ لیکن اپنی امنگوں اور

آرزوؤں کا ملاپ تقدیر کو ایک آنکھ نہ بھایا۔ وہ معصوم دِلوں کی خوشیاں دُنیا والوں سے دیکھی نہ گئیں۔ نہ جانے کس کی نظر کھا گئی۔ ایک ہی سال میں ہماری محبت کا دمکتا چاند گہنا گیا۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ اندھیرے میں چلتے ہوئے اُونچی نیچی اور سنگلاخ راہوں میں زخمی ہو کر رہ گئی۔ اس اکیلے مسافر کی طرح جسے قافلے والے راہ میں چھوڑ کر چل دیئے ہوں۔

چچی جان جو میری ساس بھی تھیں۔ اُٹھتے بیٹھتے بانجھ پن کا طعنہ دینے لگی۔ میں تو مارے شرم کے کچھ نہ بولتی۔ چچی جان میری خاموشی کو میری کمزوری سمجھتی رہیں۔ انہیں پوتا چاہیے تھا۔ جائداد کا وارث چاہیے تھا۔ لیکن میں خاموش رہتی۔ اس لیے کہ شادی کو ابھی عرصہ ہی کتنا ہُوا ہے۔ تم بھی تو صورتِ حال سے اچھی طرح واقف تھے تم نے مجھے تسلیاں دیتے نہ تھکتے تھے۔ ساجد! لیکن کیا معلوم کہ تم بھی پہاڑ کے پانی کی طرح اتنی جلدی اپنا رُخ بدل لو گے۔ جسے رُخ بدلتے وقت یہ احساس نہیں ہوتا کہ راستے میں کس کا گھر ہے یا کوئی مجبور و بے کس انسان ہے۔ راستے میں جو کچھ بھی ہو بہا لے جاتا ہے۔ اب تم بھی بانجھ پن کا طعنہ دینے لگے۔ تمہارے منہ سے یہ طعنہ سُن کر تو میں ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئی۔ جس مکان کی چھت گر جائے تو دیواروں کی کیا حیثیت! اکثر رات گئے گھر لوٹتے میں فریاد کرتی تو تم کسی سنگدل حکمران کی طرح اپنی حاکمیت کے بل بوتے مجھے مجرم قرار دیتے اور میں بے بس و مجبور مجرم کی طرح خاموش ہو کر رہ جاتی۔

آہ! وہ دن ...... وہ دن تو میرے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریکیاں لے کر آیا۔ وہ دن تو یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس دن تمہارا ایک اور رُوپ ظاہر ہُوا۔ کل تک میری آنکھ سے پوشیدہ رہا۔ یہ صحیح ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک اور انسان چھپا ہُوا ہے' جو خاص موقع پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس دن تم نے فردِ جرم عائد کرتے ہوئے بانجھ پن کے جرم کی پاداش میں میرے ہاتھ طلاق نامہ تھما دیا۔ اس دن یہ حقیقت بھی آشکار ہوئی کہ تمہاری محبت خود غرض تھی۔ بعض اوقات لوگ انسانیت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے کیا تمہارا دل نہ کانپا۔ لیکن کیوں کانپتا' کچھ احساس ہوتا تب ناں۔ پھر یہ کہہ کر تم نے مجھے ملیا میٹ کر ڈالا۔ مجھے اولاد چاہیے جو تم نہیں دے سکتیں' میں کسی بھی طرح اپنے وجود کو اپنے صبر و تقدیر کی پوٹلی میں لپیٹ کر پھر اسی مقام پر چلی آئی جہاں سے سفر کا آغاز ہُوا تھا۔ کیا کیا دل میں ارمان تھے۔ حسرتیں یاس و اُمید کی بھٹی میں جل کر خاکستر ہو گئیں۔ پتہ چلا تم نے دوسری شادی کی۔ اس بدنصیب کو بھی میری طرح حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ تیسری کا بھی یہی حشر ہُوا۔ تمہیں اولاد کی خواہش تھی ناں ساجد' اولاد کی خواہش میں تم لوگ اس قدر اندھے ہو گئے کہ تمہیں اپنا آپ بھی نہ دکھائی دیا۔ تمہیں شاید

پتہ نہیں ساجد۔ شادی کے بعد عورت کی بھی سب سے بڑی خواہش اولاد ہوتی ہے۔ جتنی شدت سے عورت اولاد کی آرزو رکھتی ہے شاید مرد نہیں۔ اولاد بھی شاید ہمارے مقدر میں نہ تھی۔ یہ کام اس خالق کائنات کا ہے جس نے کائنات کو تخلیق کیا اور کر رہا ہے۔

پھر یہ بات ہر طرف پھیل گئی کہ ساجد میں نقص ہے۔ ساجد! جب تمھیں اس بات کی خبر تھی تو میرے علاوہ دوسری دو زندگیوں کو کیوں زندہ درگور کیا۔ مگر تمھارا کیا قصور تم مرد لوگ تو انا اور وقار کا وہ مجسمہ ہوتے ہو جو کسی طور اپنے اوپر الزام لینا گوارہ نہیں کرتے۔ اپنی زندگی مردانگی پر کوئی حرف نہیں آنے دیتے۔

"بس کرو مریم بس کرو۔ ساجد نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ میں بہت سزا بھگت چکا ہوں۔ جب مجھے اس بات کا پتہ چلا کہ میں ہی اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں تو میں شرم اور ندامت سے پانی پانی ہو گیا۔ میرے اندر احساس جاگ اُٹھا۔ واقعی میں تین زندگیوں کو برباد کرنے کا مجرم ہوں۔ مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ اولاد کی خواہش میں اپنی محبت کا بھی اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دیا۔ میں شرمندہ ہوں نادم ہوں اپنے کیے پر۔ ساجد شدت جذبات سے کانپ رہا تھا۔ الفاظ اس کے منہ سے اٹک اٹک کر ادا ہو رہے تھے کہہ رہا تھا اکثر سوتے میں کوئی مجھے آ کر جھنجھوڑتا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھتا تو وہاں کوئی نہ ہوتا' یہ میرا احساس گناہ تھا مریم! جو مجھے کچوکے لگا رہا تھا۔ امی جان بھی اسی غم میں اس جہان سے رخصت ہو گئیں ابا جان بہت پہلے چل بسے۔ دوسرے بہن بھائی بھی مجھ سے منہ موڑ گئے۔ اب دُنیا میں اکیلا دربدر پھر رہا ہوں۔ دِل میں ایک خلش تھی کہ زندگی میں ایک بار تم سے ملاقات ہو جائے تو تم سے معافی مانگ سکوں۔ آج خدا نے میری سُن لی۔ اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔"

ساجد ایک مجرم کی طرح سامنے بیٹھا مجھ سے معافی مانگ رہا تھا۔

اس دوران راستے میں کتنے سٹیشن آئے کتنے لوگ اُترے اور چڑھے ہمیں کچھ خبر نہ ہوئی۔ اچانک ساجد نے پوچھا کہاں جا رہی ہو مریم۔

لاہور۔ میں نے مختصر جواب دیا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا شاید ہم لاہور کے قریب ہی ہیں۔ میں نے ایک نظر باہر ڈالی تو گاڑی اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ لاہور کا ہی اسٹیشن تھا۔ میں باہر جانے کے لیے نیچے اُتری تو ساجد مجھے باہر تک چھوڑنے آیا۔ سٹیشن سے باہر نکل کر میں نے ساجد کو واپس جانے کو کہا۔ مبادا کوئی آپ کو میرے ساتھ نہ دیکھ لے۔ تو کیا تم نے مجھے معاف کر دیا۔ ساجد نے پھر مجھ سے پوچھا۔ میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور سوچنے لگی اسے کیا جواب دوں۔ تھوڑی دیر بعد گھوم کر دیکھا تو وہ وہاں سے جا چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

نامعلوم پتہ

وہ روزانہ ڈاک خانے کے باہر بنی ٹوٹی سی بنچ پر آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ جیب میں پڑا لفافہ بار بار نکالتا، انگلیوں سے اس کا کنارا سیدھا کرتا اور پھر واپس رکھ لیتا۔ لفافے پر نہ بھیجنے والے کا نام تھا، نہ وصول کرنے والے کا پورا پتہ___ بس اتنا لکھا تھا:

''اس کے نام، جواب یہاں نہیں رہتا۔''

ڈاک خانے کے کلرک اسے جانتے تھے۔ کوئی پوچھتا تو مسکرا کر کہتا، ''بس ایسے ہی بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔''

حالانکہ سچ یہ تھا کہ وہ خط بھیجنے نہیں، سننے آتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر خط نے ایک بار ڈاک کے تھیلے میں جگہ بنالی تو اس کے اندر بند آوازیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں گی۔

ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ بنچ گیلی تھی، مگر وہ پھر بھی گیا۔ لفافہ نکالا، دیر تک دیکھتا رہا، پھر پہلی بار اس نے ڈاک خانے کے اندر قدم رکھا۔ کلرک نے لفافہ دیکھا، ابرو چڑھائے، بولا، ''پتہ مکمل نہیں ہے۔''

وہ خاموش رہا۔

''کہاں بھیجنا ہے''

اس نے آہستہ سے کہا، ''جہاں لفظ پہنچ جائیں''

کلرک نے لفافہ ایک طرف رکھ دیا۔ شاید ترس آیا، شاید جلدی تھی۔ مہر لگی، لفافہ دھیلے میں چلا گیا۔

وہ باہر آیا تو عجیب ہلکا پن تھا، جیسے سینے سے کوئی بوجھ اُتار دیا گیا ہو۔

کئی دن بعد، اسی بنچ پر بیٹھے بیٹھے اس نے دیکھا کہ ایک پوسٹ مین اس کی طرف آ رہا ہے۔ ہاتھ میں وہی لفافہ تھا،___ کھلا ہوا۔

''یہ لو'' پوسٹ مین بولا، ''کہیں پہنچ نہیں سکا۔''

وہ لفافہ لے کر مسکرایا۔ اندر کاغذ خالی تھا۔ لفظ کہیں راستے میں اُتر چکے تھے۔

اس دن کے بعد وہ بنچ پر نہیں بیٹھا۔

شاید وہ جان گیا تھا کہ کچھ خط بھیجنے کے لیے نہیں صرف چھوڑ دینے کے لیے لکھے جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

نعمان منظور

غزل

خالد احمد

ہر سمت بس اک رت ہو، ہر سمت یہ چرچا ہو
آنکھیں کہیں امڈی ہوں، بادل کہیں برسا ہو

ہم گھر سے تجھے ملنے، آنسو کی طرح نکلیں
بھیگی ہوئی پلکیں ہوں، بھیگا ہوا رستہ ہو

اس خوف سے ہم تیرے در سے نہ پلٹ آئیں
اس رنگ میں بھی شاید تو نے ہمیں دیکھا ہو

بستی کو پلٹ آئے، یہ سوچ کے دیوانے
چہرے نہ سہی لیکن بستی تو شناسا ہو

کب خاک بکھر جائے، کس گھاٹ اُتر جائے
کس شہر کی مٹی ہو، کس شہر میں رسوا ہو

کیا جانیے کب خالد کس رخ ہمیں لے جائے
کیا جانیے اس در تک کیا رنگ ہوا کا ہو

غزلیں

کیا کچھ نہ زبانی کہا، کیا کیا نہ لکھا بھی
پر درد کہاں ٹھیک سے لفظوں میں ڈھلا بھی

روبوٹ سے بڑھ کر کہیں بے حس ہیں وہ انساں
کہتا نہیں کچھ جن کو الم زارِ غزہ بھی

دیوارِ خرد راستہ دیتی نہیں کوئی
اک لفظ ہے سو اُن کے لیے ذاتِ خدا بھی

انسان نے انسان پہ ڈھائے ستم ایسے
شہروں سے نکلنے لگا اب دشتِ بلا بھی

یہ کیا کہ سدا شکوۂ کم مہریٔ احباب
یہ سوچ کسی کے لیے کچھ تجھ سے ہوا بھی

بندہ تو بشر ہے، نہ فرشتہ ہے نہ شیطاں
ہر شخص میں موجود ہے اچھا بھی برا بھی

روکے گا بھلا کیا کوئی رستہ مرا عالی
آنکھوں میں ہیں کچھ خواب تو ہاتھوں میں عصا بھی

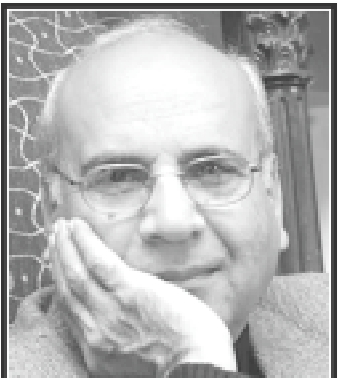

جلیل عالی

خوابوں کی تجسیم کی دُھن میں رہتے ہیں
ایک نئی تقویم کی دُھن میں رہتے ہیں

دکھ سب اپنے رکھتے ہیں ہم اپنے ساتھ
خوشیوں کی تقسیم کی دُھن میں رہتے ہیں

انساں کیا کیا نقشے لیکتا رہتا ہے
دن اپنی اسکیم کی دُھن میں رہتے ہیں

آپ عبث الجھاتے ہیں تفصیلوں میں
ہم پس پردہ تفہیم کی دُھن میں رہتے ہیں

کیا معلوم انہیں اعجاز حلیمی کا
پل پل جو تحکیم کی دُھن میں رہتے ہیں

ان کے اپنے اصول بھی ساتھ نہیں دیتے
روز نئی ترمیم کی دُھن میں رہتے ہیں

اوروں کی کم آگاہی کی ٹوہ نہیں
ہم اپنی تعلیم کی دُھن میں رہتے ہیں

غزل

جب سے لہو کو رنگ حنا ماننے لگے
صرصر کو لوگ باد صبا ماننے لگے

شب کے خلاف اس کے سوا کچھ نہیں کیا
جب حد سے بڑھ گئی تو دعا مانگنے لگے

لازم ہوا ہے جب سے یہاں احترام شب
ظلمت کو لوگ رب کی عطاء ماننے لگے

عادت سی بن گئی تھی محبت سے دیکھنا
پھر یوں ہوا کہ لوگ برا ماننے لگے

ظاہر کا خوف پھیل کے باطن پہ چھا گیا
ہم اپنی زندگی کو سزا ماننے لگے

دن میں بھی چل رہا ہے یہاں کاروبار شب
کھوٹے کو لوگ جب سے کھرا ماننے لگے

آنکھیں کھلی ہوں ذہن رسا بھی ہو جس کے پاس
کیسے وہ ہر کسی کا کہا ماننے لگے

اک پل میں اتنے رنگ بدلتی ہے زندگی
اب کیا کوئی ہرے کو ہرا ماننے لگے

ہر حکم پہ کیا سر تسلیم خم مگر
ایسا نہیں کہ دل کو خدا ماننے لگے

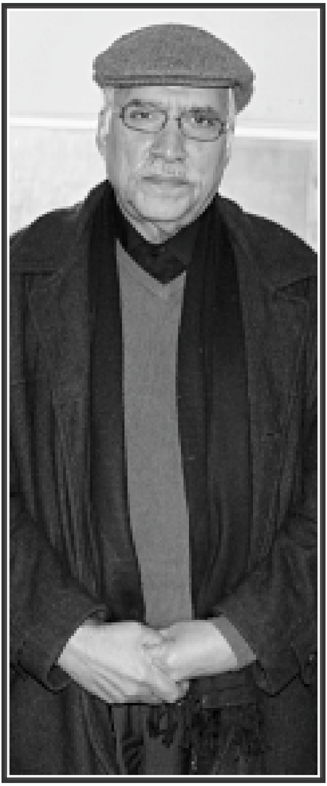

اعجاز کنور راجہ

غزل

مجھ کو پکارا جائے نہ اب آسمان سے
مانوس ہو چکا ہوں مَیں اِس خاکدان سے

اب یہ حقیقتوں سے بہت دُور جا چکی
مجھ کو نکال دیجئے اِس داستان سے

منصف نے مجھ کو رکھا اگرچہ دباؤ میں
مَیں منحرف نہیں ہوا اپنے بیان سے

کیوں میری بات سُن کے وہ آتش بجاں ہوا
مَیں نے تو بات کی تھی بڑے ہی رسان سے

تیزی سے آ رہا ہے پرندہ زمیں کی سمت
ٹکرا نہ جائے وہ کسی اونچی چٹان سے

جس کی ہر ایک اینٹ پہ لکھا ہے میرا نام
بے دخل کر دیا گیا مَیں اُس مکان سے

پھر اُس کے ساتھ کھُل کے مری گفتگو رہی
میرا وجود ہٹ گیا جب درمیان سے

جانا پڑا کسی کو زمیں سے فلک کی سمت
جب بھی کوئی ستارہ گرا آسمان سے

مَیں اِس کے باوجود سفر پر رہا نسیم
بے حال تو بہت تھا بدن کی تھکان سے

الزام دے رہے ہیں سبھی ناؤ کو نسیم
کرتا نہیں ہے بات کوئی بادبان سے

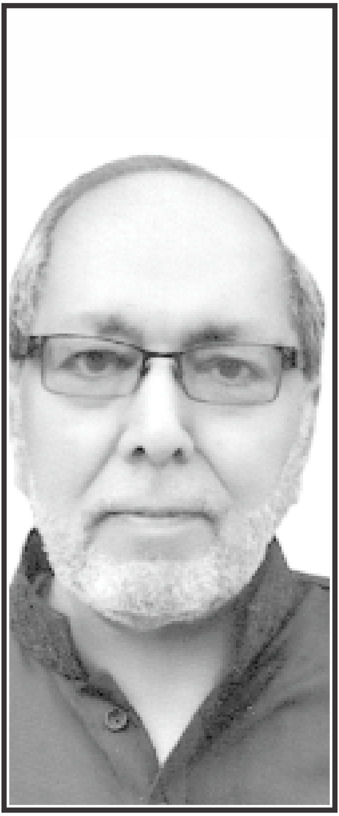

نسیم سحر

غزل

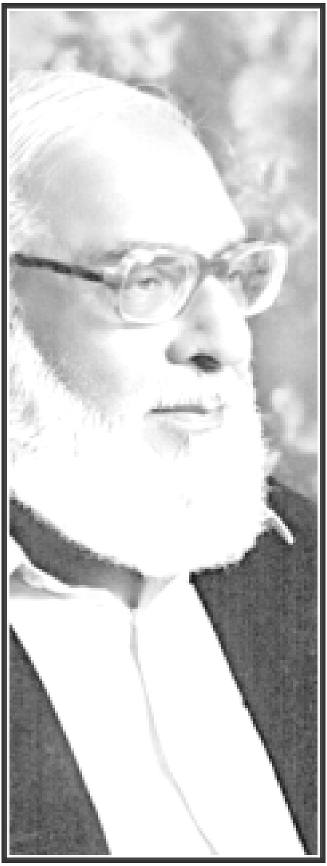

صبحِ دم پھول پہ شبنم کو اترتے دیکھا
پرتوِ خور سے مگر پل میں بکھرتے دیکھا

برق نے شعلے گرائے ہیں مگر پھر بھی پھول
اپنے اندر کی حرارت سے نکھرتے دیکھا

اس نے تو چاہنے والوں کی پذیرائی کی
اس کو تو ہم نے ہمہ وقت سنورتے دیکھا

ایک مدت سے مری آنکھ میں اس کے جلوے
ایک مدت سے اسے دل میں گزرتے دیکھا

ہے تعارف کی ریاضؔ اپنی ہزاروں شکلیں
اس کے دم خم سے پہاڑوں کو بکھرتے دیکھا

سید ریاض حسین زیدی

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

دل بھر آئے تو سمندر نہیں دیکھے جاتے
عکس، پانی میں اُتر کر نہیں دیکھے جاتے

غزل

خوف سے سہمے ہوئے، جبر کے مارے ہوئے لوگ
عہدِ امروز میں، یہ جیت کے ہارے ہوئے لوگ

چاند بھی کیسا پشیمان ہُوا جاتا ہے
راندۂ خاک تھے کیا کیا، جو ستارے ہوئے لوگ

حکمرانوں کی چکا چوند تکے جاتے ہیں
عالمی قرض کی دلدل میں اُتارے ہوئے لوگ

وہ کسی اور کے منظورِ نظر تھے شاید
جو کسی طور، تمھارے نہ ہمارے ہوئے لوگ

شور کرنا تو کُجا، بولنا بھی بُھول گئے
ایسی مہنگائی میں، یہ پاؤں پسارے ہوئے لوگ

مشعلیں تھامے چلے آتے ہیں شب زادوں میں
کبھی زِنداں، کبھی مقتل سے گزارے ہوئے لوگ

باہر آئے ہی نہیں، ذات کے محور سے کبھی
کن کی پُوجا میں رہے؟ کن کے سہارے ہوئے لوگ؟

جن کی کردار کُشی پر رہے مامور، تمام
کیا عجب ہے! وہی مخلوق کو پیارے ہوئے لوگ

اُن پری چہروں کا کیا پوچھتے ہو جانِ انیس!
آن کی آن میں ہی جن سے کنارے ہوئے لوگ

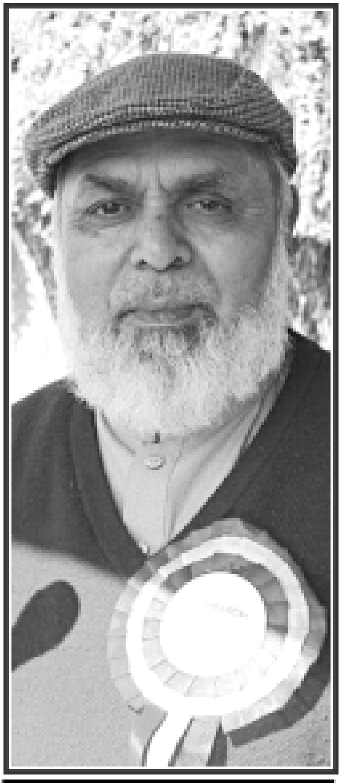

محمد انیس انصاری

غزل

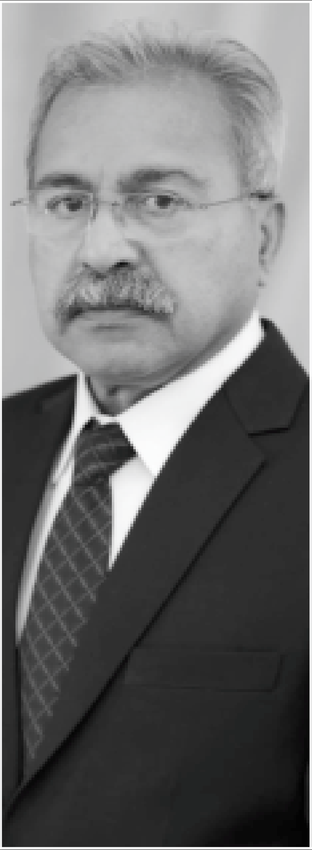

کہاں پہ سر نہیں پھوڑا کہاں دہائی نہ دی
کسی کو بھی مری آہ و بکا سنائی نہ دی

طلوع یوں ہوا مجھ پہ وہ آفتابِ جمال
کہ داد ہر بُنِ مُو نے برنگِ آئینہ دی

یہ سوچ کر کہ کہیں جل نہ جائیں پر اس کے
کسی کو دل کے فلک تک کبھی رسائی نہ دی

خدا کا شکر ادا کر کہ رات سونے کو
تجھے زمین تو دی ہے اگر چٹائی نہ دی

میں خود سے ہارا ہوں لڑ کر مقدمہ اپنا
شکست مان لی کوئی مگر صفائی نہ دی

کسی کی آنکھ میں دیکھی وہ کہکشاں راحت
جو کائنات میں پہلے کہیں دکھائی نہ دی

راحت سرحدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چھوڑتے ہی نہیں زندانِ تعلق خالد
کچھ اسیروں کو اگر چھوڑ دیا جاتا ہے

غزل

امکان روشنی کا عطا کر دیا گیا
لیکن ہمیں چراغ بجھا کر دیا گیا

شب سے لڑا بھی صبح کی لایا نوید بھی
ایسا نہیں کہ جان گنوا کر دیا گیا

نادان تھے نہ بچ سکے بھنورے گرفت سے
چالاک تتلیوں کو رہا کر دیا گیا

پابندیاں لگا کے اڑانوں کی مشق پر
جینے سے پنچھیوں کو خفا کر دیا گیا

کچھ دیر انعکاس کی صورت بنی رہی
پھر آئینے سے عکس جدا کر دیا گیا

اپنے کیے پہ غور کی توفیق ہی نہیں
رہتی ہے سب کو فکر یہ کیا کر دیا گیا

گلزار فن رفو کا دکھانے کے شوق میں
نشتر سے زخم زخم ہرا کر دیا گیا

گلزار بخاری

غزل

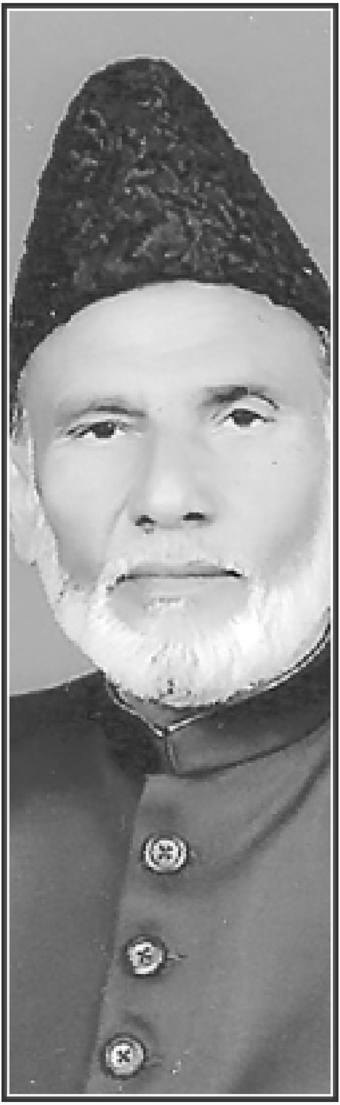

شریف ساجد

کہا، کیا دل لگی کا سلسلہ اچھا نہیں لگتا
کہا، لگتا ہے لیکن برملا اچھا نہیں لگتا

انھیں اظہار کی خواہش کی عریانی نہیں بھاتی
ہمیں پیراہن صبر و رضا اچھا نہیں لگتا

خدا جانے عدو سے کب ہماری جان چھوٹے گی
کہا ترک تعلق کا، کہا اچھا نہیں لگتا

کہا کیا ختم بھی ہوں گی کبھی یہ ہجر کی راتیں
کہا انساں کوئی کم حوصلہ اچھا نہیں لگتا

کہا کچھ تو مری مجبوریوں پر رحم، یوں بولے
ہمیں یہ جامہ مکر و ریا اچھا نہیں لگتا

کبھی اچھی نہیں لگتیں ہمیں خوشیاں زمانے کی
کبھی ساجد اگر ہو غم زدہ اچھا نہیں لگتا

غزلیں

رستے جو نکلنے تھے وہ تاخیر سے نکلے
جب ٹوٹ چکے پاؤں تو زنجیر سے نکلے

یہ بارہ دری جیسی غزل اُس کی عطا ہے
ہم لوگ کہاں بارگہِ میر سے نکلے

کیا باغ جو آباد کیے خواب میں اپنے
کیا دشتِ رواں خواب کی تعبیر سے نکلے

بس اتنا کہ یہ آنکھ کسیلی ہو ذرا سی
بس اتنا دھواں شعر کی تاثیر سے نکلے

کچھ بول تھے ایسے جو فقط میں نے سنے تھے
کچھ رنگ جو میرے لیے تصویر سے نکلے

مشعل بھی کوئی اب تو دلاسا نہیں دیتی
یہ قافلہ، کیا جادۂ شب گیر سے نکلے

قیوم طاہر

دریا بھی کب دریا نکلا
ریت سے بڑھ کر پیاسا نکلا

میں ہی بجھتے طاق میں آخر
آنکھ جلانے والا نکلا

جبر نہ جس نے عہد کا لکھا
اُس کا شعر، قصیدہ نکلا

سرمایہ اک خواب تھا میرا
خاک میں میرا حصہ نکلا

اک تُو ہی تھا میرا اپنا
تُو بھی ایک جہان کا نکلا

شہر اجڑتے دیکھے، لیکن
اے دل، کوئی نہ تجھ سا نکلا

جس وعدے پہ عمر اُساری
کچے گارے جیسا نکلا

آتی رُت کی خوش خبری تھی
جب اس شاخ پہ پتہ نکلا

کھل کر عشق نہیں کر پائے
اپنا سورج دھندلا نکلا

غزل

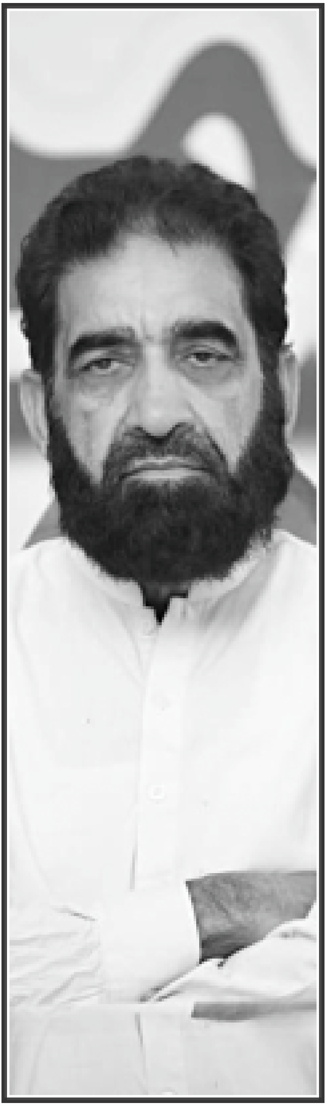

سمجھو تو ہے بجا کہ میں پھولوں میں خار ہوں
تلخی مرے سخن میں ہے بے اختیار ہوں

اک سمت ہو کے بیٹھ گیا کچھ نہیں کہا
محسوس جب کیا کہ میں محفل پہ بار ہوں

اڑتا تو میں بہت ہوں تخیل کے زور پر
پھر تھک کے بیٹھ جاتا ہوں آخر غبار ہوں

سارے بدن کو توڑ کے انگڑائی جو نہ لے
میں ایسی آگہی کا کشیدہ خمار ہوں

بالکل نہیں قیافہ شناسوں کے بس کی بات
میں اپنے آپ پر بھی کہاں آشکار ہوں

ہندسہ ہوں گرچہ ایک کا لیکن اگر کہیں
ہاتھ آئیں تین صفر تو پورا ہزار ہوں

اے سعد روشنی ہوں ستاروں کی مثل میں
اور خاک ہوں تو گویا کوئی ریگزار ہوں

سعداللہ شاہ

غزلیں

جی میں آتا ہے کوئی نام کمایا جائے
جو بھی اونچا ہو اُسے نیچا دکھایا جائے

کیا اِسی طور ہوا کرتا ہے اقرار وفا
کیا ضروری ہے کہ ہاتھ اس کا دبایا جائے

بدگمانی کے جہنم میں جو لا پھینکتے ہیں
ایسے جذبات کو خاطر میں نہ لایا جائے

کربِ تنہائی کا احساس گھٹانے کے لیے
مجھ کو برہا کا کوئی گیت سنایا جائے

بستیاں چیختی پھرتی ہیں مگر کون سُنے
کوئی چشمہ ہی بلندی سے گرایا جائے

مشورہ آج مرے دل نے مجھے خوب دیا
خود پہ پختہ سا کوئی رنگ چڑھایا جائے

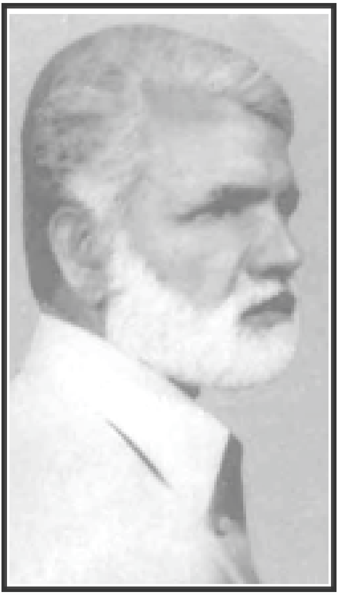

یعقوب پرواز

کیوں نہیں اونچی ہوائیں حرف کی
دب گئیں کیسے صدائیں حرف کی

کنجِ عزلت میں کہاں فارغ رہے
اپنے سر لی ہیں بلائیں حرف کی

ہر طرف ہے آج مرا تذکرہ
ہیں غضب کی یہ عطائیں حرف کی

نام ہے ان کا دیارِ حرف میں
لگ گئیں جن کو دعائیں حرف کی

باوجود اس کے اسیرِ حرف ہوں
جان لیوا ہیں ادائیں حرف کی

کیوں نہ ہو شاداب پھر کشتِ غزل
جم کے برسی ہیں گھٹائیں حرف کی

آؤ نا پرواز بزمِ شعر میں
روشنی تم کو پلائیں حرف کی

غزل

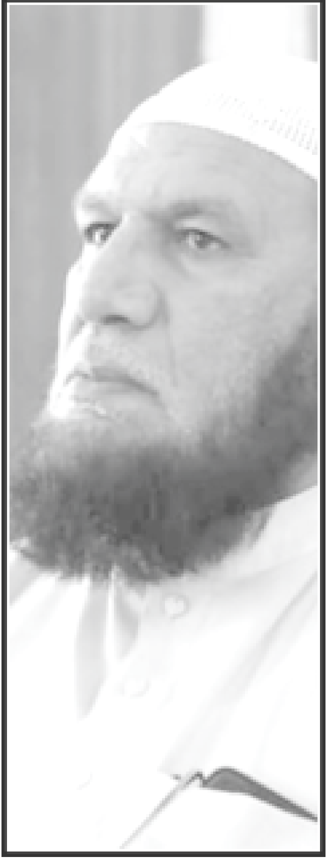

فضائے درد میں اک لہر سی اٹھائی ہے
کسی غریب نے پھر زندگی اٹھائی ہے

مہیب رات نے آخر کو ختم ہونا ہے
افق سے چرخ نے پھر روشنی اٹھائی ہے

کہیں نہ لاش ہو محمل میں قومی غیرت کی
ہمارے لیڈروں نے پالکی اٹھائی ہے

تمھارے شہر میں جو لوگ بھی ملے ہیں ہمیں
سبھی نے گٹھڑی سی اک درد کی اٹھائی ہے

نہ جانے قافلے کا حال کیا رضا ہو گا
جنابِ شیخ نے پھر رہبری اٹھائی ہے

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وجہِ مجالِ گریہ گری جان تو گیا
کچھ غم کشوں کی سمت ترا دھیان تو گیا

غزل

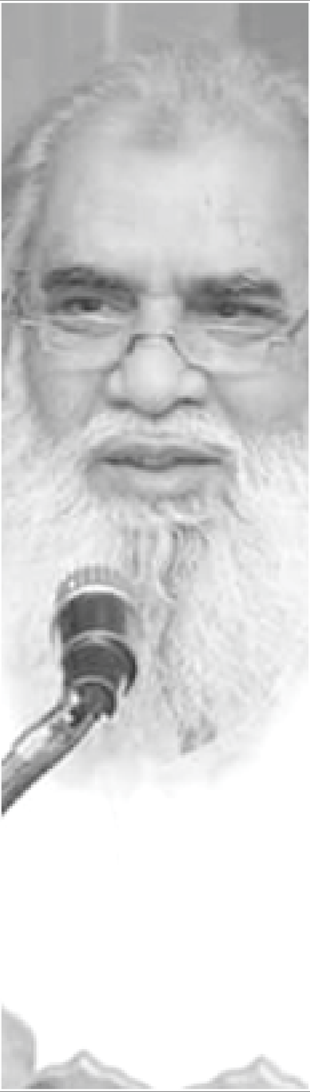

اکرم ناصر

شہر میں ہم فضول کیوں آئے
خود کو گاؤں میں بھول کیوں آئے

وہ نہیں آئے تھے تو گلشن میں
ٹہنی ٹہنی پہ پھول کیوں آئے

کون پوچھے کہ ان کی محفل سے
آپ اتنے ملول کیوں آئے

اس کی خوشبو نہیں تو کھڑکی سے
گرد کیوں آئے دھول کیوں آئے

گر بچھڑنے کا فیصلہ ہے تو
گفتگو میں بھی طول کیوں آئے

عشق پیشہ نہیں تو پھر اس میں
ضابطے اور اصول کیوں آئے

راہ مشکل اگر تھی تو اکرم
آپ اس کو قبول کیوں آئے

غزلیں

آپ سیدھی سڑک پہ بھٹکے ہیں
اس کا مطلب ہے آپ اندھے ہیں

دے رہا ہے سنائی آنکھوں کو
زاویے جو کلام کرتے ہیں

وہ ملن کے تھے یہ جدائی کے
دن گزارے تھے دن گزرتے ہیں

ایک مدت جدائی جھیلی ہے
ایک مدت میں جا کے سنبھلے ہیں

ڈھلتے سورج نے یہ کہا مجھ سے
لوگ چھوٹے ہیں، سائے لمبے ہیں

ایک عرصے تلک نہیں ڈستے
سانپ جو آستیں میں پلتے ہیں

جن کی شامیں حسین تھیں شاہد
ہم نے ایسے بھی دن گزارے ہیں

افتخار شاہد

کسے کس سے محبت ہو گئی ہے
سنا ہے پھر بغاوت ہو گئی ہے

سبھی ناراض رہنے لگ گئے ہیں
محبت اک مصیبت ہو گئی ہے

میں شاید دائرے میں چل رہا ہوں
بڑی لمبی مسافت ہو گئی ہے

میں اپنی بات کرتے تھک گیا تھا
خلافِ آدمیت ہو گئی ہے

یہاں تو سانس لینا بھی ہے مشکل
یہاں اتنی کثافت ہو گئی ہے

نہیں معلوم کتنے دن چلے گی
مری، مجھ سے رفاقت ہو گئی ہے

غزل

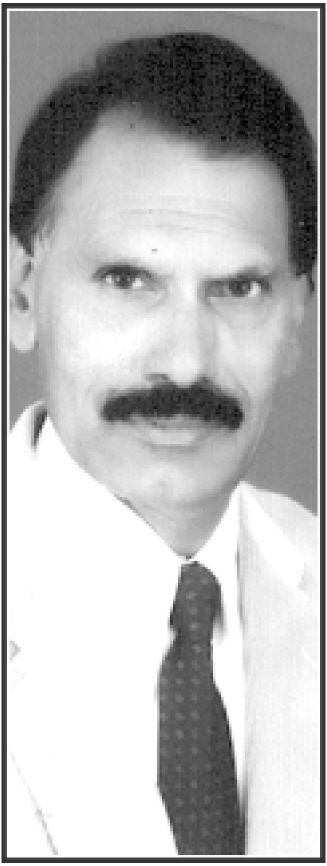

قریب دل کے جو مجھ سے بھی کچھ زیادہ ہے
اُسی کو دل سے بھلانے کا اب ارادہ ہے

بکھیر رکھی ہیں اس نے ہی الجھنیں ساری
جو دیکھنے میں بہت بھولا سیدھا سادہ ہے

اُسے پتہ ہے مجھے زخم بھول جاتے ہیں
وہ اُن کو رکھے گا تازہ یہ اس کا وعدہ ہے

گزرتے وقت کا مرہم نہ مندمل کر دے
تیرے خیال سے ہر زخم کا اعادہ ہے

جلیل اُن سے کہو اور بھی ستم ڈھالیں
ہمارے صبر کا دامن بہت کشادہ ہے

احمد جلیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جی میں آتا ہے کسی دن آئنے سے پوچھ لیں
رُو بہ رُو اِک شخص ہے جانے کہاں دیکھا ہوا

غزل

معیشت کو سنبھالا جا رہا ہے
ہمارا ہر نوالہ جا رہا ہے

پکانے کو نہیں کچھ بھی میسر
فقط پانی اُبالا جا رہا ہے

ہمارے جسم کی رسی جلا کر
ہمارا بَل نکالا جا رہا ہے

بہت رونق ہے میری آستیں میں
انوکھا سانپ پالا جا رہا ہے

مدینے ، کربلا ، شام و نجف میں
سنہرے بخت والا جا رہا ہے

وہ سَر، چُوما جسے اکثر نبیؐ نے
وہ نیزوں پر اُچھالا جا رہا ہے

اَبد تک روشنی ہی روشنی ہے
بہتّر کا اُجالا جا رہا ہے

جنازہ ماں کا پڑھنے والو سوچو
محبت کا حوالہ جا رہا ہے

تمہارے جسم کی رنگینیوں کو
حسیں شعروں میں ڈھالا جا رہا ہے

ہوئی بیٹی ہمارے گھر سے رخصت
عقیل اپنا اُجالا جا رہا ہے

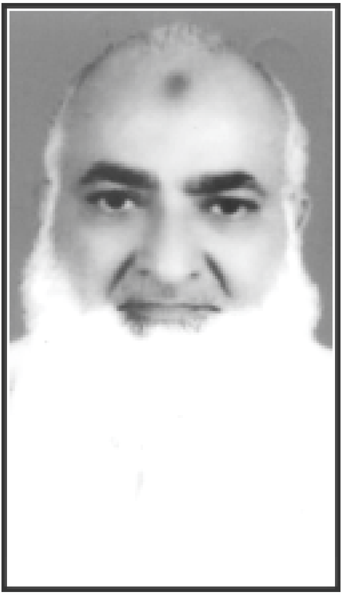

عقیل رحمانی

غزل

وقت نے کیا سے کیا کیا ہو گا
سارا نقشہ بدل دیا ہو گا

روح کوئے وفا پڑی ہو گی
جسم پہلو میں مر گیا ہو گا

اب کہاں راستے میں پھول لیے
کوئی آشفتہ سر کھڑا ہو گا

پہلی تصویر ڈھونڈنے والو
اب تو منظر ہی دوسرا ہو گا

تیز آندھی میں جو سلامت ہے
میرے مسکن کا وہ دیا ہو گا

عشق موجود میں نہیں ناظر
پہلے وقتوں میں ہاں ہوا ہو گا

اقبال ناظر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دور کچھ بھی نہیں، اے جاں، تری دارائی سے
کبھی دردانہ گزر جا، مری تنہائی سے

غزل

چھٹے گا یہ اندھیرا پھر اچانک
نکل آئے گا رستہ پھر اچانک

مقابل تو ادھورے خال و خد ہیں
ابھر آئے گا چہرہ پھر اچانک

ادھورے خواب کی تکمیل کیسے
نہیں بدلے گی دنیا پھر اچانک

یہ ہم جو پھر اکٹھے چل رہے ہیں
جدا ہونا ہے رستہ پھر اچانک

اچانک ہی غزل ہو گی کسی دن
جڑے گا مصرعہ مصرعہ پھر اچانک

عاصم اعجاز

انتخاب

– خالد احمد –

نعمان منظور

شہر کی ویرانیوں پہ نوحہ گر
رُوح بن کر رات بھر بھٹکا کروں

غزلیں

نیک ناموں سے، دین داروں سے
کیسے تنہا لڑوں ہزاروں سے

راس آتا نہیں کوئی موسم
میں کہ تنگ آ گیا ہوں چاروں سے

میں نے دیکھے ہیں کھیلتے بچے
نالیوں میں پڑے غباروں سے

کان پر جوں تلک نہیں رینگی
آسماں ہل گیا پکاروں سے

بات کرنے کا وقت تھا ہی نہیں
اس کو سمجھا دیا اشاروں سے

وہ خزائیں بھی ان سے بہتر تھیں
کیا ملا ہم کو ان بہاروں سے

کیا خبر تھی برہنہ پائی مری
یوں گزارے گی ریگ زاروں سے

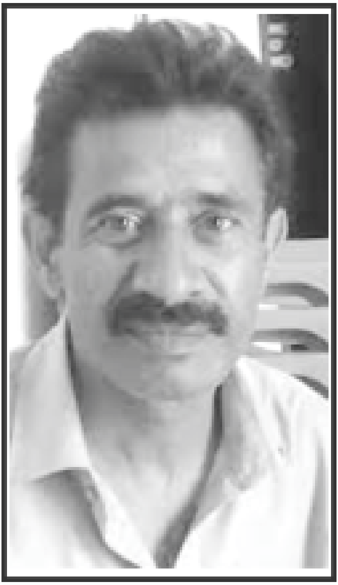

رانا سعید دوشی

یہی رہا ہے ہر اک سے گلہ محبت کا
بنے گا اتنی محبت سے، کیا محبت کا

یہ تاج و تخت یہ جان اور عزت و ناموس
لٹا کے یہ بھی، نہ کچھ بن سکا محبت کا

ہوس کی تنگ گلی راستے میں آئی تھی
وہاں میں بھول گیا راستہ محبت کا

میں اپنی جان بچاتا تو اس پہ کیا بنتی
وہاں نہ تھا کوئی میرے سوا محبت کا

سو اب میں خط کا لفافے پہ کچھ نہیں لکھتا
یہی تو سادہ ورق ہے پتہ محبت کا

خبر کہاں اسے اگلے جہان کی ہو گی
کہ جس نے چکھا نہیں ذائقہ محبت کا

غزلیں

مشکل روڑا بن جاتا ہے
ملن بچھوڑا بن جاتا ہے
آنسو، آنسو مل کے سمندر
یونہی تھوڑا بن جاتا ہے
اتنا تیز دھڑکتا یہ دل
پاگل گھوڑا بن جاتا ہے
چار اطراف، نکیلے پتھر
لفظ، ہتھوڑا بن جاتا ہے
انجانے دو انسانوں کا
فلک پہ جوڑا بن جاتا ہے
کینسر بعد میں، دکھ کا پہلے
دِل میں پھوڑا بن جاتا ہے
موم کے اک پتلے سا انساں
جدھر کو موڑا، بن جاتا ہے
رخشندہ! محبوب تمھارا
ایک بھگوڑا بن جاتا ہے

رخشندہ نوید

اسپِ تازہ کی رفتار سے بھاگ اُٹھا
دل میں سویا عشق دوبارہ جاگ اُٹھا

آنکھیں آخر کس دن پھر کام آئیں گی
پانی اِدھر سے مل جائے گا آگ اُٹھا

رستے صرف دعاؤں سے نہیں کھل سکتے
پہلے سوئے پڑے ہوئے یہ بھاگ اُٹھا

دروازے پر قفل کہاں لگ سکتا ہے
بیٹھے ہیں کچھ دیواروں پر کاگ، اُٹھا

سیپ کو حاصل کر لینا آسان ہے کیا
دریا سے اک دن پہلے کچھ جھاگ اُٹھا

غزلیں

وہی اب نام دیتا ہے، محبت کو فسانے کا
سدا جو درس دیتا تھا قیامت تک نبھانے کا

قفس کچھ اس طرح سے راس آیا ہے پرندوں کو
نہیں لیتے ہی اب تو نام تک وہ آشیانے کا

خوشی کے پردہ رنگیں میں غم پلتے ہیں کچھ ایسے
فنا، انجام ہے جیسے کلی کے مسکرانے کا

خبر اس کو نہیں شاید، ہے اس کا عشق جاں پرور
ہمیں جو مشورہ دیتا ہے اب کے بھول جانے کا

اجارہ ظلمتِ شب کا، بجا ہے کم نہیں ہوگا
تہیہ کر کے بیٹھے ہیں مگر دیپک جلانے کا

عناصر دندناتے پھر رہے ہیں پھر سے طاغوتی
یہی تو وقت ہے شوکت، یہ تن من دھن لٹانے کا

شوکت محمود شوکت

زندگی جب اداس ہوتی ہے
تیری یادوں کی آس ہوتی ہے

ذکر ہوتا ہے جب خزاؤں کا
فصلِ گل، آس پاس ہوتی ہے

راس ہوتے ہیں درد، الفت میں
بات رنجش کی راس ہوتی ہے

ایک تیرے ذرا بچھڑنے سے
زندگی، محوِ یاس ہوتی ہے

خاکِ ارضِ وطن کی خوش بُو بھی
مشک و عنبر کی باس ہوتی ہے

لوگ خوش حال میرے ہوتے ہیں
کھیت میں جب کپاس ہوتی ہے

غیر بھی اپنے بنتے ہیں، شوکت
لہجے میں جب مٹھاس ہوتی ہے

غزل

میں نے جو دیپ کبھی خَلقِ خُدا کو سونپا
عمر بھر ایسے لگا جیسے ہَوا کو سونپا

ہم سا سادہ بھی زمانے میں کوئی کیا ہوگا
دل سا ہیرا بھی ستم کیش خفا کو سونپا

پہلے تخلیق کیا بزمِ جہاں کو اُس نے
ہر نَفَس ساتھ ہی پھر اُس نے قضا کو سونپا

جب ذرا ماند ہوئی دستِ ستم کی سُرخی
ہم نے سینے کا لہو رنگِ حنا کو سونپا

شاخِ اُمید پہ جو پھول کھلا ، غنچہ کھلا
ماند ہوتی ہوئی تصویرِ صبا کو سونپا

ہم نے ٹھہرے ہوئے تالاب میں پھینکا پتھر
ہم نے اِک سیلِ بلا موجِ نوا کو سونپا

جس پہ موقوف ہے انسان کا جینا ، مرنا
ہم نے وہ دل بھی تیرے ناز و ادا کو سونپا

جب بھی ہمراہ چلا ہوں میں زمانے کے نبیلؔ
اس نے ہر بار مجھے مکر و ریا کو سونپا

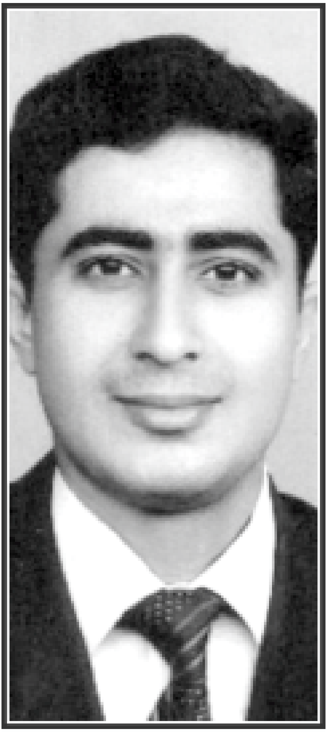

نبیل احمد نبیل

غزل

جاڑے کی ٹھنڈ سے ہے ہر اک شے جمی ہوئی
مہنگائی کی تپش میں نہیں کچھ کمی ہوئی

ہے کُہر اور دُھند کی شدّت عروج پر
شعر و سُخن کی چال بھی دیکھو تھمی ہوئی

آلودگی، گلوب پہ چھائی ہے اس طرح
ماحول کی یہ بدنظری عالمی ہوئی

اَرضی جمال، تلخیوں کا ہم قدم ہُوا
اوجِ فلک کی پستیوں سے ہم دمی ہوئی

شفاف کاریوں کا جہاں اِلتزام ہے
آب و ہوا وہاں کی خنک شبنمی ہوئی

جس خطۂ زمیں پہ صفا کا رواج ہے
محفل وہاں بہشت نُما ہے جمی ہوئی

ہم نے لطافتوں کو کثافت بنا دیا
اپنا نصیب سردی بدموسمی ہوئی

نیٹ کھاتہ، کھول کر ذرا سروے تو کیجئے
آلودگی ہماری کئی کالمی ہوئی

افسوس! اے زمین، ترے حالِ زار پر
کل چشمِ آسماں کو بڑی برہمی ہوئی

فیضاؔن قطرہ قطرہ جو گدلا دیا گیا
بدلے میں ذرّے ذرّے کی خو ایٹمی ہوئی

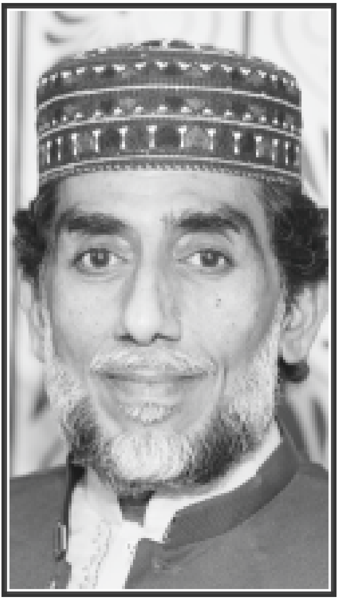

فیض رسول فیضان

غزل

کوئی حسرت نہ آس ہے باقی
اک اکیلی سی یاس ہے باقی

دن کسی طور ہم نے کاٹ لیا
شام بوجھل، اداس ہے باقی

تجھ سے منسوب سب بھرم ٹوٹے
ایک وعدے کا پاس ہے باقی

یاد کے بے ثمر جزیروں میں
ہلکی ہلکی سی گھاس ہے باقی

آرزوؤں کے پھول مُرجھائے
اُن کی اجڑی سی باس ہے باقی

مجھ کو تیرا لباس لکھا گیا
جسم غائب، لباس ہے باقی

راس آئیں نہ 'راس' کی باتیں
'راس' تھی اور 'راس' ہے باقی

چونک اٹھے گا نام سن کے مرا
ہلکا سا اک قیاس ہے باقی

منتوں کے تو مرحلے گزرے
کیوں کوئی التماس ہے باقی

منہدم ہو گیا حصار یقیں
کھوکھلی سی اساس ہے باقی

خالدہ انور

غزل

رہتی ہے اپنی آنکھ اگر نم تو کیا ہوا
دل میں چھپا ہوا ہے کوئی غم تو کیا ہوا

ہم سے سنور سکے نہ کبھی گیسوئے حیات
اک زلف آج بھی ہے جو برہم تو کیا ہوا

اک عمر، دے کے دل کا لہو، کی ہے روشنی
لو آج گر دیے کی ہے مدھم تو کیا ہوا

قرنوں ہمارا ساتھ رہا ہے مرے عزیز
مشکل ہے آج ہونا جو باہم تو کیا ہوا

گونجا تھا اپنا نام بھی دنیا میں چارسو
پہلے سا اب نہیں ہے وہ عالم تو کیا ہوا

دیکھی ہے فصل گل بھی اسی گلستان میں
پت جھڑ کا اب چمن میں ہے موسم تو کیا ہوا

ہم رک گئے تو اس سے زمانہ ہے بے خبر
گردش جہاں کی اب بھی ہے قائم تو کیا ہوا

جی تو چکے ہیں اتنا بہت سا، جہان میں
رہنا نہیں ہمیں یہاں دائم تو کیا ہوا

جو جیسے لب پہ آ گئی انجم وہ کہہ گئے
دل میں جو تھی وہ کہہ نہ سکے ہم تو کیا ہوا

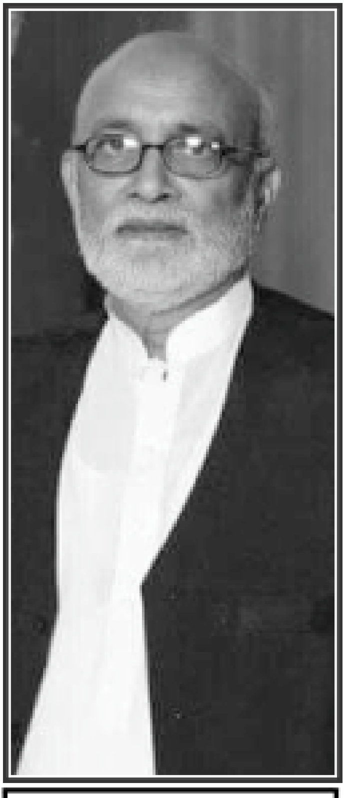

محمد افضال انجم

غزل

نقطہ و شوشہ و واوین کہاں لے جائیں
لفظ اور لفظ کا مابین کہاں لے جائیں

خواب رکھے تھے دریچے میں اٹھا لیتے ہیں
پر یہ دو نین، یہ دو نین کہاں لے جائیں

فرق مٹ سکتا ہے، لوگوں کو مٹا سکتا ہے
دیکھیے اس کو فریقین کہاں لے جائیں

ٹھیک سے دیکھ تو لیں پہلے یہاں کا نقشہ
لامکانی میں یہ کونین کہاں لے جائیں

کچھ مشارق کا مغارب کا تو کر لیں پہلے
سوچتے ہیں کہ جنوبین کہاں لے جائیں

نشۂ لفظ اتر جائے تو آگے دیکھیں
واحد و جمع اور اثنین کہاں لے جائیں

چین پڑتا ہو کسی کل تو ترا کل سوچیں
اب تجھے اے دلِ بے چین کہاں لے جائیں

ہجر سے اور گریزانی سے سب گردش ہے
کھینچ کر ورنہ تو نورین کہاں لے جائیں

اپنی مرضی سے کہاں جاتا ہے دریا منظر
کیا خبر اب اسے طرفین کہاں لے جائیں

منظر اعجاز

غزل

کون آخر کہاں سے آیا ہے
دل نے اک حشر سا اٹھایا ہے

روشنی آسماں سے اوپر ہے
اور زمیں آسماں کا سایہ ہے

وحشت والے بڑے پریشاں ہیں
کس نے ہم کو یہاں بلایا ہے

اب معافی نہیں ملے گی اسے
جس نے بھی دل مرا جلایا ہے

دیر کر دی ہے تم نے آنے میں
وہ جنازہ ابھی اٹھایا ہے

دو ٹکے کی نہیں ہے یہ دنیا
ہم نے خود کو یہاں گنوایا ہے

اب اسے یاد کر نہ پاؤں گا
مشکلوں سے جسے بھلایا ہے

نوحہ گر آ چکے ہیں خیمے میں
یہ دیا اس لئے بجھایا ہے

اس نے یہ بیکراں خلا آصف
جانے کیا سوچ کر بنایا ہے

آصف خیال

غزلیں

نیند کے زنداں میں کوئی راستہ بننے لگا!
خواب امکاں کے دریچے کی ہوا بننے لگا

جب مٹائے اور ابجد عاجزی کے ہاتھ نے
رفتہ رفتہ دل مرا حرفِ دعا بننے لگا

واقعوں کی ڈور میں کچھ دیر گرہیں ڈال کر
وقت پیچھے ہٹ گیا اور حادثہ بننے لگا

دوسروں سے ایک جیسا فاصلہ رکھتے ہوئے
میں تعلق کے سفر میں دائرہ بننے لگا

زندگی کی آس اہراموں میں چکرانے لگی
بندگی کرتا ہوا بت جب خدا بننے لگا

عکسِ امکاں جم گیا امید کی دیوار پر
جا بجا در کی جگہ اک آئنہ بننے لگا

پرورش اُس درد کی مجھ کو بہت مہنگی پڑی
دیکھتے ہی دیکھتے جس کی غذا بننے لگا

وقت کی تصویر تو پوری نہ ہو پائی مگر
اک نظارہ اور منظر سے ورا بننے لگا

پھر سے آئینِ ہوا پر گفتگو ہونے لگی
سانس لینے کے لیے کلیہ نیا بننے لگا

افتخار الحق

مرے مزاج پہ دیوانہ وار برسا ہے
کبھی سکون کبھی اضطرار برسا ہے

یہ سرخ فصل یونہی آنکھ میں کہاں اُگتی
ہمارے دل پہ بہت انتظار برسا ہے

حدوں میں جس کی ابھرنے لگا کوئی چہرہ
کسی کی یاد کا ایسا حصار برسا ہے

کسی زمانے میں بیداریوں کی رم جھم تھی
ہمارے بخت پہ اب کے خمار برسا ہے

پھر اس کے بعد بہت حبسِ جبر پھیل گیا
ذرا سی دیر اگر اختیار برسا ہے

مرے خیال کی پوشاک عطر بیز ہوئی
کسی کے جسم پہ کھل کر نکھار برسا ہے

اسی لیے تو یہ دشتِ فریب سبز ہوا
کہیں خلوص کہیں اعتبار برسا ہے

دھلے ہوئے جو یہ لہجے ہوئے ہیں ضیالے
اس آبشار پہ اک ریگزار برسا ہے

غرور بہہ کے نشیبِ انا میں ڈوب گیا
فلک سے ایسے کوئی خاکسار برسا ہے

غزل

ہمارے درمیاں کچھ بھی نہیں ہے
جو ہے سود و زیاں کچھ بھی نہیں ہے

وہ پس انداز یادیں کام آئیں
جہاں میں رائیگاں کچھ بھی نہیں ہے

وہ دیکھے گا سنبھل جائے گا یہ دل
مرا دردِ نہاں کچھ بھی نہیں ہے

زمیں کی سبز گوں وسعت کے آگے
یہ نیلا آسماں کچھ بھی نہیں ہے

ہوا کے رخ پہ لہراتا ہے یونہی
وگرنہ بادباں کچھ بھی نہیں ہے

تُو جس کی شہ پہ اتراتی ہے دنیا
یقیں کچھ بھی گماں کچھ بھی نہیں ہے

جو ہے وہ سب نظر کا واہمہ ہے
زر و گوہر میاں کچھ بھی نہیں ہے

ہماری منتظر آنکھوں کے آگے
یہ دشتِ بے کراں کچھ بھی نہیں ہے

تلاشِ ذات ہے اظہار کا فن
یہ اسلوبِ بیاں کچھ بھی نہیں ہے

مکینوں سے ہے یہ آباد عالم
زماں کچھ بھی مکاں کچھ بھی نہیں ہے

چلیں اصغر ابد کو لوٹ جائیں
یہ جنگل ہے، یہاں کچھ بھی نہیں ہے

اصغر علی بلوچ

غزل

یہ محبت مقناطیسی کھینچ کر لے آئے گی
دیکھ لینا! اُس کو اک دن میرے گھر لے آئے گی

یاد کی زنجیر بھی اک پُرکشش زنجیر ہے
وہ چلا جائے جدھر، اُس کو اِدھر لے آئے گی

خواہشِ نشوونما میں قوتِ تخلیق ہے
کوئی موسم ہو، یہ پیڑوں پر ثمر لے آئے گی

میں شجر کمزور، میری دوست ہے سرکش ہَوا
خوش گمانی ہے، یہی اُس کی خبر لے آئے گی

زندگی وہ ناؤ ہے جو ڈوبنے سے بچ گئی
تو اُٹھا کر سامنے کوئی بھنور لے آئے گی

آنسوؤں سے بھیگتی جائے گی دل کی سرزمیں
غم کی شدت میرے لفظوں میں اثر لے آئے گی

اک صدا پیچھا تا ہوں، میں کہیں جاؤں ظہور
میری انگلی تھام کر واپس مگر لے آئے گی

ظہور چوہان

غزل

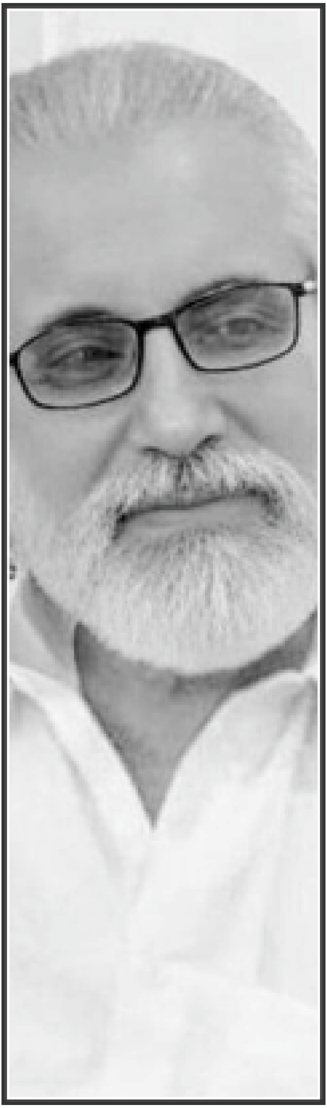

اب کہاں لوگ وہ محفل کو ہنسانے والے
اب تو آ جاتے ہیں دکھ درد بڑھانے والے

وہ کہاں جائیں سرِ شام نہیں گھر جن کے
لوٹ کے جائیں فقط لوگ ٹھکانے والے

پوچھ ان سے نہ ملے کام تو کیا ہوتا ہے
کیسے کرتے ہیں گزر روز کمانے والے

اب کوئی آتا نہیں در پہ شرارت کرنے
اب کہاں جھونکے ہوا کے وہ ستانے والے

پوش بستی میں نیا گھر تو بنایا لیکن
یاد آتے ہیں در و بام پرانے والے

اب تو آتی ہی نہیں نیند دوا کھائے بغیر
اب کہاں ہاتھ وہ تھپکی سے سلانے والے

جب بھی آ جائے بلاوا تو چلے جاتے ہیں
پھر کبھی لوٹ کے آتے نہیں جانے والے

اب کوئی ہجر میں آنسو نہ بہائے افضل
اب کہاں روگ دل و جاں کو لگانے والے

افضل ہزاروی

غزل

میں یوں حیات کا چہرہ بدل کے بیٹھ گیا
قریب جا کے میں دستِ اجل کے بیٹھ گیا

نہ مل سکے اسے ٹوٹے ہوئے کھلونے بھی
تسلیوں سے ہی بچہ بہل کے بیٹھ گیا

نہ کوئی لہجہ نہ انداز گفتگو میں کھنک
یہ کون حسنِ تکلم نگل کے بیٹھ گیا

میں گفتگو کے ہنر سے کہاں شناسا تھا
مقابلے میں جہاں کے سنبھل کے بیٹھ گیا

شریر طفل نے رنگوں سے بھر لیا خود کو
ہتھیلیوں پہ ہی تتلی مسل کے بیٹھ گیا

اسے بھی موت کے ہاتھوں بچا سکا نہ کوئی
جو سانپ چڑیا کے بچے نگل کے بیٹھ گیا

یہ کس نے وقت کو مٹھی میں اپنی قید کیا
یہ کون گردشِ دوراں بدل کے بیٹھ گیا

مہک رہا تھا خیالوں میں روح تک میں نوید
پھر ایک باغ میں تنہا ٹہل کے بیٹھ گیا

مصوری کا ہنر کام آ گیا میرے
میں سارے شہر کا نقشہ بدل کے بیٹھ گیا

مشاہدہ مجھے کرنا تھا کائنات کا بھی
میں اپنے آپ سے باہر نکل کے بیٹھ گیا

تمام عمر جسے میرے ساتھ چلنا تھا
سفر میں تھک کے وہ رستہ بدل کے بیٹھ گیا

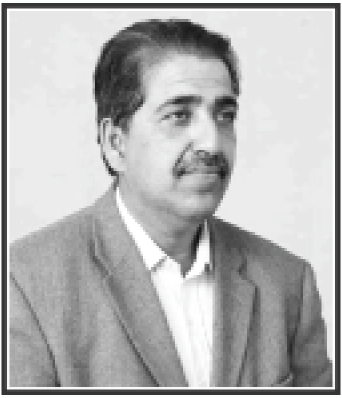

محمد نوید مرزا

غزل

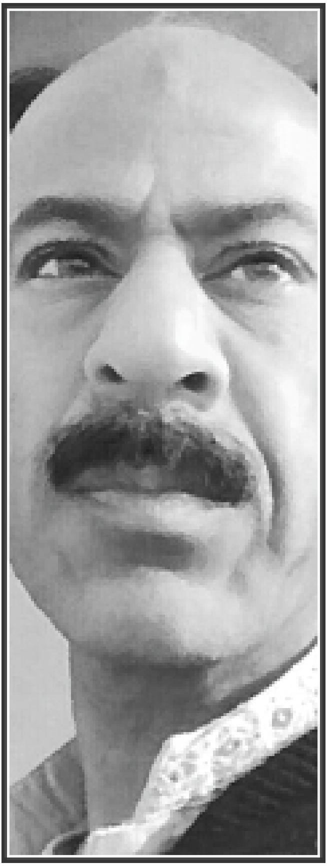

نبیل قیصر

کتنے زخموں سے تن سجا میرا
کیا حسیں ہے یہ فن کدہ میرا

تھا بہت میں قریب توبہ کے
ماپ لو چاہے فاصلہ میرا

جال آتا ہے خالی دریا سے
پوچھ موسیٰ سے ماجرا میرا

ڈھونڈنے میں تمھیں نہ ہو مشکل
نوٹ کر لیجیے پتہ میرا

مارنے میں کسر نہ چھوڑی کوئی
رنگ دنیا سے تھا جدا میرا

کرتا کیا زندگی میں اور نبیل
عشق کرنا تھا مشغلہ میرا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ستمِ طرزِ فلک، زخم آشنا بھی تو ہو
اُفق اُفق شفقِ درد کی حنا بھی تو ہو

غزل

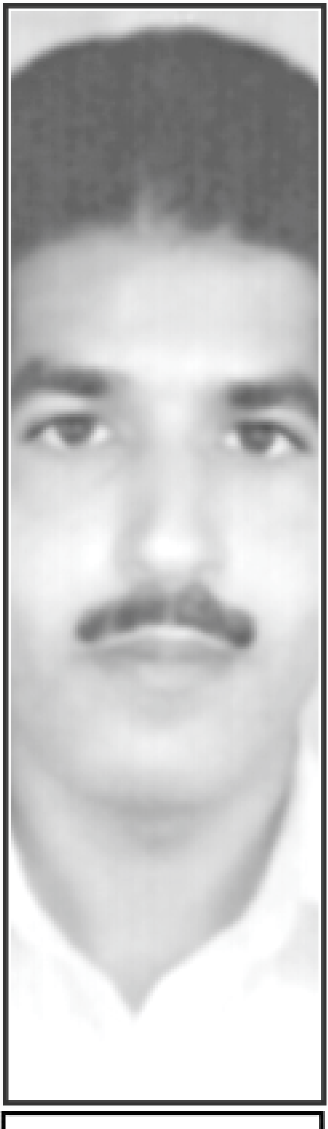

سرور فرحان

یوں لگے ہے زندگی کا خاتمہ ہونے کو ہے
اک نئے عالم سے اپنا رابطہ ہونے کو ہے

شور تھا پہلے مرے چاروں طرف اک بھیڑ کا
اب مری تنہائیوں پر تبصرہ ہونے کو ہے

سوچنا ہوگا فضا کے حبس کی بابت ہمیں
سانس لینا بھی تو اب اک مسئلہ ہونے کو ہے

اصل کی جانب دوبارہ مڑ رہی ہے کائنات
انتہا کے بعد کیا پھر ابتدا ہونے کو ہے؟

چھا گئی چہروں پہ اب تو ہر طرف پژمردگی
کیا زمانے سے خوشی کا خاتمہ ہونے کو ہے

کب تلک مخفی رکھو گے تم ہمارے نام کو
جلد ہی گھر گھر ہمارا تذکرہ ہونے کو ہے

پہلے تو تھا وصل ہی میرے لئے راحت رساں
اب تمہارا ہجر بھی راحت فزا ہونے کو ہے

آ گئے ہیں مل کے بیٹے باپ سے حق چھیننے
پھر کوئی فرحاں وقوعہ رونما ہونے کو ہے

غزل

حالات سے گریز کہاں تک کرے کوئی
اربابِ اختیار سے کتنا ڈرے کوئی

صرفِ نظر خطاؤں سے اپنی اگر نہ ہو
الزام دوسروں پہ بھلا کیوں دھرے کوئی

احسان اہلِ شہر کی نسلوں پہ جائے گا
کردے الگ الگ جو یہ کھوٹے کھرے کوئی

دل میں جگہ نہ پائے کشش جب جہان کی
پھر کیوں قضا نمازِ محبت کرے کوئی

اب اتنی تیز آنچ کہاں جسم کی درست
رکھے محبتوں سے ہوس کو پرے کوئی

بس جائے دل میں عشق تو لفظوں کو جاں ملے
یوں ہی کسی کے کرتا نہیں تذکرے کوئی

کیسے کہوں کہ جائے مکافات ہے جہاں
جاذب کرے کوئی یہاں لیکن بھرے کوئی

اکرم جاذب

غزل

محمد اشفاق بیگ

یہ کیا ہو رہا ہے یہ کیوں ہو رہا ہے
نہ یوں ہو رہا ہے نہ ووں ہو رہا ہے

شب و روز ہوتے ہیں خودکش دھماکے
خدا کے گھروں میں بھی خوں ہو رہا ہے

ہراساں ہے ہر شخص اس خامشی سے
مگر کچھ دروں کچھ بروں ہو رہا ہے

اندھیرا بنا روشنی کے میں دیکھوں
تماشائے سحر و فسوں ہو رہا ہے

عجب تیرگی چھا رہی ہے کہ جس میں
ہر انسان خوار و زبوں ہو رہا ہے

کرن روشنی کی بکھرنے کو بے تاب
دل مضطرب پُرسکوں ہو رہا ہے

غزلیں

اگر سب اچھا ہونا ہوتا تو سب اچھا ہو سکتا تھا
جس نے بگڑنا تھا وہ بگڑا وہ کب اچھا ہو سکتا تھا

چارہ گروں کی چارہ گری نے آخر اس کو مار دیا
جس نے اچھا ہو جانا تھا وہ جب اچھا ہو سکتا تھا

نظم جہاں پر سوچنے والے جانے کب سے سوچ رہے تھے
لگتا نہیں تھا کارِ جہاں بھی اتنا بے ڈھب ہو سکتا تھا

وقت کی نبض پہ ہاتھ جو ہوتا تو حالات بدل سکتے تھے
یہ اس وقت کی بات تھی لیکن یہ تو بس تب ہو سکتا تھا

توبہ کی جو مہلت ملتی تو توبہ بھی ہو سکتی تھی
وقت پہ توبہ جو کر لیتے تو راضی رب ہو سکتا تھا

جانے کیسے آتے جاتے، آمنا سامنا ہو جاتا تھا
اتنی گہری چاہت کا یہ ایک سبب تو ہو سکتا تھا

راجہ عبدالقیوم

دل میں گر تھی کبھی کوئی امید
تھی کبھی، اب نہیں رہی امید

سارے قوسِ قزح کے رنگوں سی
قرمزی ، سبز ، سرمئی امید

کتنی مایوسیوں میں پالا اسے
پھر بھی آخر میں مر گئی امید

اس نے دیکھا کچھ ایسی نظروں سے
مٹ گئی سب رہی سہی امید

یاالٰہی ہو خاتمہ بالخیر
اب یہی ہے بس آخری امید

اس سے مایوسیاں بہت بہتر
ہو ادھوری جو سرسری امید

غزل

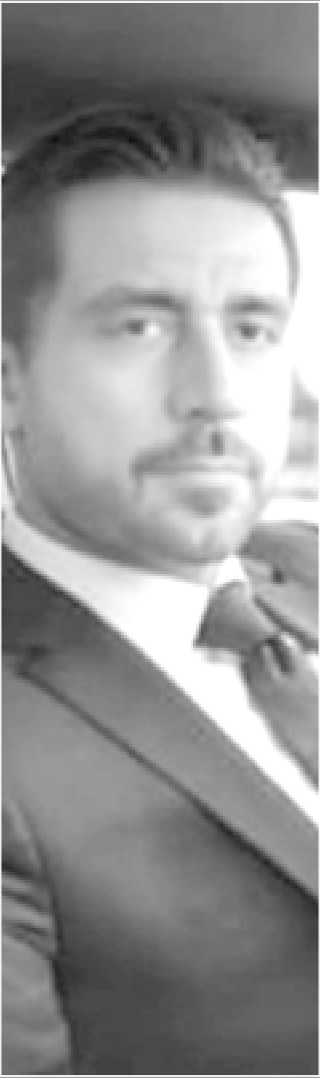

سامنے بھی بیٹھے ہوں، فاصلے تو ہوتے ہیں
اک قدم کی دوری میں مرحلے تو ہوتے ہیں

ایک ساتھ رہ کر بھی عمر جب گزاری ہو
ایک ساتھ رہنے میں مسئلے تو ہوتے ہیں

کوئی لاکھ بہکائے، راستے سے بھٹکائے
ایک رو میں بہنے کے حوصلے تو ہوتے ہیں

خواب کا بہانہ کیا، رات کا فسانہ کیا!
خواب کے تسلسل میں رتجگے تو ہوتے ہیں

بارشوں کے موسم میں بھیگنا تو بنتا ہے
شہر شہر گاؤں میں من چلے تو ہوتے ہیں

عشق کرنے والوں کا فاصلوں سے ڈرنا کیا
عیب غیب والے کچھ سلسلے تو ہوتے ہیں

عمر کی مسافت پر روٹھ جانے والوں کے
خواب کے دریچوں سے رابطے تو ہوتے ہیں

وہ اگر بشیر احمد، تم سے دور ہے تو کیا
چاند تک پہنچنے کے راستے تو ہوتے ہیں

بشیر احمد حبیب

غزلیں

جنبشِ مژگاں تیری قیامت بنی
ہر ادا تیری، میری امانت بنی

تیرا یوں پیار سے دیکھنا بار بار
زندگی کی مری تو ضمانت بنی

نام سے تیرے دنیا میں جانے گئے
پیار کی اک نئی پھر علامت بنی

ایک شے یہ سمجھ سے ہے باہر مرے
کیوں محبت یہاں پر ندامت بنی

داستاں یہ پرانی سنی ہے کلیم
بات حق کی اٹھانا قیامت بنی

کون کہہ سکتا ہے یقیں کے ساتھ
رہنا آسان ہے نہیں کے ساتھ

لوگ کہتے ہیں میں اکیلا ہوں
میں مگر ہوں کسی مکیں کے ساتھ

ٹھیک ہے آسماں میرا نہیں
پر جڑا تو ہوں میں زمیں کے ساتھ

خوبصورت ہماری جوڑی ہے
جیسے انگوٹھی ہو نگیں کے ساتھ

محمد کلیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

محفلِ ماہتاب میں نجمِ سحر نہیں تو کیا
لاکھ نیاز مند ہیں ، ایک اگر تو نہیں کیا

غزل

خوابوں کی بیڑیوں سے رہائی کبھی تو ہو
خود ہم تلک ہمیں بھی رسائی کبھی تو ہو

لائیں گے ہم بھی پیار سے کنگن خرید کر
ہاتھوں میں اپنے اُس کی کلائی کبھی تو ہو

سر سبز رُت میں کیسے ستم ڈھا دیئے گئے
پیڑوں نے آپ بیتی سُنائی کبھی تو ہو

نائب بنا کے بھیجا خدا نے زمین پر
کچھ دسترس میں اپنے خدائی کبھی تو ہو

چپ چاپ سہہ لیے ہیں جدائی کے روز و شب
کچھ شور دل میں اور دہائی کبھی تو ہو

اکتا گئے ہیں اب تو سکوتِ دروں سے ہم
دل کی دماغ سے بھی لڑائی کبھی تو ہو

مہر و وفا پہ تجھ کو نہیں اعتبار کیا
اے بے وفا کسی سے نبھائی کبھی تو ہو

رانا دلشاد

غزل

بے وفائی کا میں ایسے ہی صلہ دیتا ہوں
جو مرا ہو نہ سکے اس کو بھلا دیتا ہوں

بھول جانے کا مرض یوں بھی مجھے لاحق ہے
اور کچھ نام میں قصداً بھی بھلا دیتا ہوں

توبہ توبہ کوئی عادت سی ہے تنہائی کی
شاخ پر بیٹھے پرندے بھی اڑا دیتا ہوں

خود کو میں خود ہی لگاتا ہوں کسی یاد کی آگ
خود ہی پھر یاد کے شعلوں کو ہوا دیتا ہوں

آنکھ تاریکی سے مانوس ہوئی ہے ایسی
جوں ہی جلتا ہے دیا کوئی بجھا دیتا ہوں

اس قدر قحط محبت ہے مری بستی میں
مسکرا کر کوئی مل لے تو دعا دیتا ہوں

قصہ گوئی کا ہنر تھوڑا بہت جانتا ہوں
جس کو بھی قصہ سناتا ہوں رلا دیتا ہوں

روز اک زعمِ خدائی مجھے آ لیتا ہے
روز اک نقش بناتا ہوں، مٹا دیتا ہوں

کچھ تو ہے تم میں جو دل میں تمھیں رکھا ہوا ہے
ورنہ ہر اک کو میں کب دل میں جگہ دیتا ہوں

مجھ سے ملنا ہے تو آ میرے کھنڈر میں اک شام
اپنے آثار سے میں اپنا پتہ دیتا ہوں

علمدار حسین

غزل

دل پر جو کھل گئی ہے یہ وسعت کبھی نہ تھی
ایسی کھلی ہو ذات کی حدت کبھی نہ تھی

آئینۂ شعور نے جب سچ دکھا دیا
جو شے ہوئی عیاں، وہ ندامت کبھی نہ تھی

ہم خاک میں تلاشا کیے عمر بھر جسے
اس نور کی زمین میں نسبت کبھی نہ تھی

سجدے میں سر تو جھک گیا پر دل نہ جھک سکا
یوں بندگی میں دل کی شراکت کبھی نہ تھی

دریا سمجھ لیا تھا جسے تشنگی کا حل
وہ پیاس ہی تھی، جس سے فراغت کبھی نہ تھی

خاموشیوں نے کہہ دی وہی بات ایک دن
جو لفظ لفظ ڈھل گئی، حکمت کبھی نہ تھی

خود میں اتر کے ہم بھی خدا تک پہنچ گئے
پھر اور کسی بھی در کی ضرورت کبھی نہ تھی

جو زخم آگہی نے دیا ہم کو راہ میں
اس درد میں بھی ایسی حلاوت کبھی نہ تھی

پہلے تو خواب آنکھ کی دہلیز تک تھے بس
جاگے میں خواب رت کی اذیت کبھی نہ تھی

جس کو سمجھ رہا تھا کبھی میں انا ولی
وہ ٹوٹ کر کھلی، جو حقیقت کبھی نہ تھی

شاہ روم خان ولی

غزل

جیسے دستک پہ کسی گھر کا فسوں ٹوٹتا ہے
آئینہ روز مرے سامنے یوں ٹوٹتا ہے

سانس لیتا ہوں تو شریانیں سنبھل جاتی ہیں
آہ بھرتا ہوں تو کچھ دل کے دروں ٹوٹتا ہے

قابو اعصاب پہ رکھ ہجر کا رونا مت رو
آنکھ بہتی ہے تو پھر شوقِ جنوں ٹوٹتا ہے

کوزہ گر کھول گرہ تاکہ سبھی جان سکیں
دستِ حیرت سے جو بنتا ہے وہ کیوں ٹوٹتا ہے

تیرے آنے پہ نکھرتے ہیں رخِ برگ وگلاب
تیرے جانے پہ رگ وپے کا سکوں ٹوٹتا ہے

اسد رضا سحر

درد کا نشہ انگ انگ میں تھا
زندگی کا مزہ ترنگ میں تھا

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

غزل

مجھ سے کیا پوچھتا ہے زیست کے افسانے کی
یادداشت اتنی کہاں ہے ترے دیوانے کی

چادرِ زیست کبھی اِتنی کشادہ نہ ہوئی
جتنی حسرت ہے مجھے پاؤں کو پھیلانے کی

شہرِ خواہش میں کوئی شے بھی سلامت نہیں ہے
خاک ہی خاک ہے اور خاک بھی ویرانے کی

میں تو وحشت میں کہیں پر بھی قدم رکھتا تھا
پھر بھی ہمت نہ ہوئی تیری گلی جانے کی

اِک لپک میں ہی بدن راکھ میں ڈھل جاتا ہے
عمر اِتنی بھی کہاں ہوتی ہے پروانے کی

میں نے اِک بار تری یاد کو قصہ کیا تھا
خاک اڑتی ہے ابھی تک مرے افسانے کی

میں کسی اور ہی عالم کا مکیں ہوں تیمور
یہ زمیں ٹھہری کسی اور ہی دیوانے کی

سیّد تیمور کاظمی

غزل

یہاں ہر شخص بے گانہ ہوا ہے
کہاں کوئی بھی اپنا ہی بنا ہے

اکیلی جھیلتی ہوں سارے صدمے
کوئی ہمدرد ہے، نا ہی دعا ہے

دکھوں سے ہو گئی ہلکان میں تو
ہر اک ٹھوکر پہ تازہ غم ملا ہے

دلوں کے بیچ رشتہ بن گیا ہے
نہ جانے کس لیے اب تو خفا ہے

جدا ہوں گے کبھی نا زندگی میں
کہ گل سے کب ہوئی خوشبو جدا ہے

کوکی گل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم تو ٹھہرے دیوانے بستیوں میں ویرانے
اہلِ عقل کیوں خالد پاگلوں کو گھیرے ہیں

غزل

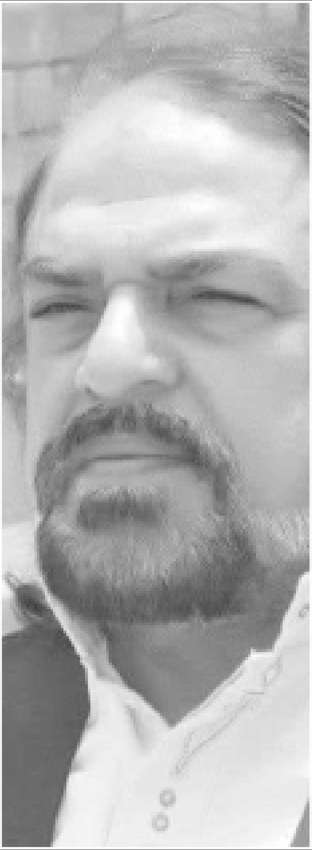

غمِ حیات کی تشکیل ہونے والی ہے
یہ دنیا ساری ہی تبدیل ہونے والی ہے

ہر اک نظام نشانے پہ رکھ دیا گیا ہے
کسی اشارے کی تعمیل ہونے والی ہے

جنھیں سنبھال کے محمل میں رکھ دیا گیا تھا
اب اُن صحیفوں کی ترتیل ہونے والی ہے

اسی لیے ابھی منظر بدل نہیں پایا
تمہارے حکم کی تاویل ہونے والی ہے

جہانِ "کن" تو مکمل بھی ہو چکا احمد
بس اب "یکون" کی تکمیل ہونے والی ہے

احمد ساقی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نہ مضطرب ہو، غمِ جاں گزیں! یہ میں تو نہیں
لہو ہیں، سنگ و سرو آستیں، یہ میں تو نہیں

غزل

گزشتہ سال کی سب تلخیاں بھلانے لگے
کہ زندگی کو نئے ڈھنگ سے بتانے لگے

نجانے کس لیے پھر سے ہیں یاد آنے لگے
وہ لوگ جن کو بھلانے میں تھے زمانے لگے

گلہ کریں بھی تو کس سے کریں گلہ تو بتا
ملے جو دوست وہی راہ میں گرانے لگے

وہ میرے ساتھ بہت دور تک چلے تو مگر
انہیں بھی حوصلے اُنکے ہیں اب تھکانے لگے

وہ چاہتے بھی یہی تھے کہ اب کبھی نہ ملیں
اسی لیے تو ہیں ہم فاصلے بڑھانے لگے

کدورتیں لیے دل میں وہ برسوں ملتے رہے
مگر یہ بات سمجھتے ہمیں زمانے لگے

کبھی کسی کے لیے دل اداس ہوتا نہیں
یوں اپنے ساتھ ہیں ہم وقت اب بتانے لگے

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہاتھ سے لے نکل گئی، شور میں ضربِ ذات کے
ہم ہی تو گُر تھے، ہم ہی سَم زمزمۂ حیات کے

غزل

نوید عاجز

یہ دل تو ہار کے بھی خوش ہے اور خنداں ہے
وہ جیت کر بھی سنا ہے بہت ہی نالاں ہے

اب اس کے ہاتھ میں ہے قافلے کی سرداری
شعورِ ذات کی منزل سے جو گریزاں ہے

وہ جس کا دعویٰ ہے کہ روشنی پرست ہے وہ
نئے چراغوں کی آمد سے کیوں ہراساں ہے

ہر ایک سوچ مری خوش ہے قید میں رہ کر
تمھاری یاد کا کیسا عجیب زنداں ہے

یہ خوش گمانی بھی دل مانتا نہیں اب تو
مجھے نکال کے محفل سے وہ پریشاں ہے

بہت بھڑکتا ہے شعلہ بھی بجھنے سے پہلے
یقین جان یہ اک عارضی سا طوفاں ہے

یونہی وہ غیر کی باتوں میں آ گیا ہو گا
وہ بے وفا تو نہیں، بس ذرا سا ناداں ہے

بہت کٹھن ہے نئی منزلوں کا کھوج نوید
قدیم سوچ کے حجرے میں رہنا آساں ہے

غزل

میں اپنے خوابوں کے ساتھ اُس کے نگر گیا تھا
تو اک سمندر سا میری آنکھوں میں بھر گیا تھا

مری کہانی نئی صداؤں میں پل رہی تھی
نئے فسانے کے استعارے میں مر گیا تھا

دوبارہ مجھ کو بناتا کیسے یہ کوزہ گر بھی
کہ میں تو پہلے ہی مرحلے میں بکھر گیا تھا

میں لوٹ آیا تھا اپنے خستہ مکاں کی جانب
پرانے وقتوں کا زخم پھر سے اُبھر گیا تھا

مجھے گزرنا ہے اُس ڈگر سے عزیز عادل
جہاں پہلے جہاں سلامت گزر گیا تھا

عزیز عادل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لہو کی دھار نے تن روشنی میں ڈھال دیے
سُروں کے ساتھ ہوا میں دیے اُچھال دیے

غزل

عبدالرؤف زین

لوٹ آیا ہوں میں پھر خدا کی طرف
دل نہ ٹوٹے جہاں، اس فضا کی طرف

میری چاہت کو اس نے تماشا کیا
لے گیا ہے مجھے وہ فنا کی طرف

جس نے لیکچر دیے تھے وفا پر کبھی
وہ ہی مائل نہیں اب وفا کی طرف

جس نے ٹکڑے کیے میرے احساس کے
ہیں سبھی اس جفا آشنا کی طرف

دونوں گھائل ہوئے، دونوں مائل ہوئے
وہ دوا کی طرف، میں دعا کی طرف

کہہ رہی ہے یہ کیا، کان دھر، غور کر
اپنے اندر سے اٹھی صدا کی طرف

ہے سوا نیزے پر ہجر کا مہر بھی
زین تکتا ہوں ابرِ عطا کی طرف

غزل

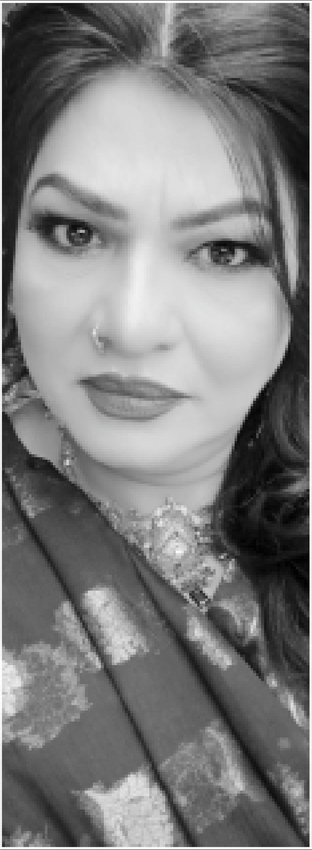

غموں میں شوق کے پہلو نے کر دیا سرشار
شبِ سیاہ میں جگنو نے کر دیا سرشار

ہر ایک سمت دکھوں کے مہیب سائے تھے
ترے جمال کے جادو نے کر دیا سرشار

تلاشِ وصل میں نکلے ہوئے پلٹ آئے
گلِ خیال کی خوشبو نے کر دیا سرشار

اداس ہو گئے میرے دکھوں پہ ہنستے لوگ
جب ایک روز مجھے تو نے کر دیا سرشار

کوئی تو چیز گری دامنِ تہی میں جیا
کسی غریب کے آنسو نے کر دیا سرشار

جیا قریشی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ لوگ تو آنسو بھی بہانے نہیں دیتے
نیکی کو بھی دریاؤں تک آنے نہیں دیتے

غزل

خالق آرزو

اپنی ذات کا جوہر آج پھر دکھانا ہے
زندگی کے رنگوں سے نقش اک بنانا ہے

انتخاب کرنا ہے موت یا محبت کا
پار آ کے دریا کے کشتیاں جلانا ہے

اس سے بات کرنا تو یوں لگا مجھے جیسے
بیچ سے پہاڑوں کے راستہ بنانا ہے

تیری یاد کے لمحے مختصر سہی لیکن
فاصلوں کو لمحوں میں قید کر کے لانا ہے

یہ تو ایک دریا ہے اس کی سرد یادوں کا
آرزو مجھے اک دن اس کے پار جانا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یوں ملاقاتیں ادھوری چھوڑ کر جاتے نہ تھے
تم تو میری دُکھ بھری باتوں سے اکتاتے نہ تھے

غزل

کہاں ہوں میں کہ گم ہوا ہوں کن تصنعات میں
یہ کون منعکس ہُوا ہے آئنۂ ذات میں

یہ نفس کی فریب کاریوں کا جال ہے یہاں
کئی فسانے بن گئے ذرا سی بات بات میں

تمھاری میری گفتگو کے درمیان خامشی
جو حُسن سکوتو معجزہ ہے ایک معجزات میں

یہ جبر ہے کہ شوقِ خودسری کی انتہا کوئی؟
بندھا ہوا ہے آدمی عمل کے حادثات میں

ہنر ہے گر تو کر عیاں جو عیب ہے تو کر بیاں
وگرنہ جان پیش کر ہے رات بیٹھی گھات میں

عجب ہے تشنگی مری کہ بحر پی کے خوش نہیں
میں ڈھونڈتا ہوں آبِ جاں سرابِ کائنات میں

جب اس حیات پر ہمیں یقیں نہیں رہا کوئی
وثوق کیا رہے حیات بعد از ممات میں

فریبِ رنگ و بُو سے اب نکل اے کاظمِ حزیں
بپا ہے ایک کربلا شعور کی فرات میں

جو چاہِ زنخ سے نکل کے دم لیا، ذرا بڑھے
سنبھل نہ پائے آ گرے ہیں قعرِ نفسیات میں

ایم اے کاظم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رنگ کہتے ہیں کہانی میری
کس کی خُوشبُو تھی جوانی میری

غزل

مرے دل کو کسی کی جب کمی محسوس ہوتی ہے
تو پلکوں کی منڈیروں پر نمی محسوس ہوتی ہے

تکلم کی حلاوت ہے کہ ہے ذوقِ سخن اے دل
کہ اسکی گفتگو بھی شاعری محسوس ہوتی ہے

مری تاریک آنکھوں میں کوئی مہتاب رہتا ہے
وہ جب ہو ضوفشاں تو روشنی محسوس ہوتی ہے

غریبوں کے لہو میں عشق بھی ہے اور شجاعت بھی
امیروں کے لہو میں دلکشی محسوس ہوتی ہے

بہار آنگن میں آئی، غنچہ و گل کھلکھلا اُٹھے
تبھی تو خواہشِ بلبل ہری محسوس ہوتی ہے

میں جب بھی مسکراتی ہوں، تو اس مسکان میں چھپے
بڑی شدت سے اپنی بے بسی محسوس ہوتی ہے

مسکان گل

چلو دل اُس کا وفادار کر کے دیکھتے ہیں
خدا کے ساتھ یہ بیوپار کر کے دیکھتے ہیں

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

غزلیں

غضنفر مہدی

خود سے بے زار کر گیا مجھ کو
غم یہ لاچار کر گیا مجھ کو

دشمنوں سے گلہ کروں کیوں کر
قتل جب یار کر گیا مجھ کو

اِک ترے وصل کا ادھورا خواب
کیسے مسمار کر گیا مجھ کو

خال و خد سب بگڑ گئے میرے
ہجر بیمار کر گیا مجھ کو

آنکھوں میں اشک لب پہ نوحہ گری
دل عزادار کر گیا مجھ کو

اک فقیر آ کے میری چوکھٹ پر
پھر گنہگار کر گیا مجھ کو

دان کر کے وہ درد کی دولت
کتنا زردار کر گیا مجھ کو

جیت کر وہ بھی خوش نہیں مہدیؔ
شخص جو ہار کر گیا مجھ کو

اے شبِ تیرگی معافی دے
ہجر کی بے بسی معافی دے

ہر طرف ظلمتوں کے سائے ہیں
حسرتِ روشنی معافی دے

بوجھ لگنے لگی ہیں یہ سانسیں
اب مجھے زندگی معافی دے

دوستی کے ہیں زخم تازہ ابھی
اِس لیے دشمنی معافی دے

میں اُسے ایک دن بھلا دوں گا
گر یہ دل کی لگی معافی دے

ہجر سیراب کر گیا مجھ کو
وصل کی تشنگی معافی دے

دکھ تو میراث ہو گئے مہدیؔ
زیست کی ہر خوشی معافی دے

تھیوری کے فکری و تہذیبی مضمرات

جلیل عالی

ایک بڑی فکری و تہذیبی روایت میں جنم لینے والے تخلیقی ادب پر دُنیا کی کسی بھی تھیوری کے اطلاق کی آزادی سے نہ کسی کو روکا جا سکتا ہے نہ ایسا رویہ مناسب ہے۔ بل کہ ہمیں تو پوری انسانیت کی علمی و فکری دریافتوں سے اکتساب کی تلقین کی گئی ہے۔ ہمارے عظیم مفکر شاعر کا تنقیدی ویژن بھی یہی درس دیتا ہے کہ:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

....

مگر کوئی فکر بھی نقد و تنقیح سے بالا تو نہیں ہوتی اور ادبی دنیا میں یہ ضروری تو نہیں ہے کہ ہر تھیوری ہر فن پارے کی فکری و فنی گمبھیرتا کی جامع تفہیم اور قرار واقعی تحسین کی کفایت کرتی ہو۔ لہٰذا کسی تھیوری کے کسی عجز کی نشاندہی پر تہذیبی خوف کی تہمت باندھنے کے بجائے سنجیدہ مکالمہ ہونا چاہیے۔ اگر کوئی فکری تہذیبی روایت انسان کے داخل و خارج میں خیر و شر کی کشمکش پر یقین رکھتی ہو اور تخلیق کار کے اپنے شعورِ خیر کا مکلف ہونے کو فضیلت ٹھہراتی ہو تو اس پر نظریے کو لازمی طور پر فسطائیت گرداننے والی تھیوری کا اطلاق بھی تو ایک طرح سے فکری استعماریت کی ہی ایک صورت ہوگی۔ بے شک ایسے اطلاق سے جزوی طور پر کچھ معقول نکات بھی ضرور سامنے آ سکتے ہیں۔ مگر یہ جزوی نکات اگر شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک بڑے ویژن کو دھندلانے کا باعث بن رہے ہوں تو کیا عالمگیر انسانیت کے تقاضوں کے ناطے اس کی نشاندہی نہیں کرنی چاہیے؟ تھیوری کے ہر درست و نادرست مطالبے اور محاکمے پر اپنی فکری و تہذیبی روایت کے روشن ترین زاویوں کو کٹہرے میں کھڑا کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ کیا ہمارے اہلِ علم اس سے ناآشنا ہیں کہ استعماریت ہو یا نو استعماریت دونوں دوسروں کی سوچ کو اپنے مزعومہ مفادات سے ہم آہنگ فکری سانچوں میں ڈھالنے کی انتہائی باریک تدابیر بروئے کار لاتی رہتی ہیں۔

بھلے معنی کے کہیں قیام نہ کرنے کی مُوشگافی ایک سطح پر کچھ حقیقت رکھتی بھی ہو اور آخری نتیجے میں:

''تراشیدم، پرستیدم، شکستم''

ہی انسان کا مقدر محسوس ہو، تو بھی ہر فکری تجزیہ یا تشریح بالآخر کسی نہ کسی معنی تک پہنچنے کی سعی ہی تو ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو تو فکری فعلیت کا جواز ہی باقی نہیں رہتا۔

تخلیقی فن پارے کے معنیاتی امکانات کی طرف تو جہاں میر کا یہ شعر بہت بلیغ اشارہ کرتا ہے کہ:

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر
کیا کیا کہا کریں ہیں زبانِ قلم سے ہم

....

وہاں میر کا اس طرف متوجہ کرنا بھی غور طلب ہے کہ:

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

....

کسی بھی فن پارے کی معروف تعبیر سے ہٹ کر کسی نئی تعبیر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ مگر یہ نہیں ہوتا کہ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی تعبیر سامنے آ جائے۔ کسی تخلیقی متن کی معروف و متفقہ تفہیم کے مقابل کوئی مختلف مربوط و ہم آہنگ تفہیم سامنے لانا ادبی دنیا میں بہت وقیع اور اہم پیش رفت کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم جتنے قاری اتنی تعبیریں' والی بات تو ادب کی سنجیدگی کو مذاق بنا دینے کے مترادف ہے۔

ہر تھیوری پر سنجیدہ سوال اٹھائے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی تھیوری یہ دعوا کرے کہ کوئی مہابیانیہ ممکن ہی نہیں ہے تو

(آ) کیا اس سے کسی مربوط نظامِ فکر کی تشکیل کی مساعی پر زد نہیں پڑتی؟

(ب) کیا اس سے فکری نراجیت کو بڑھاوا نہیں ملتا؟

(ج) کیا انسان کی تہذیبی بقا کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی ایسا معاہدۂ عمرانی وضع کیا جائے جسے کسی مربوط و ہم آہنگ نظامِ فکر کی کمک بھی حاصل ہو؟

(د) اور کیا اپنی سچائی کے یقین کے بغیر جبر و استبداد کے خلاف مزاحمت کا جذبہ بیدار ہو سکتا ہے؟

نیچرل سائنسز کا معاملہ اور ہے۔ ان کے اصول اٹل ہوتے ہیں۔ وہ ''کیا'' اور ''کیسے'' کی تفہیم کراتے ہیں۔ ''کیا ہونا چاہیے'' ان کے دائرے ہی میں نہیں آتا۔ وہ طبعی علوم ہیں غائی نہیں۔ ان کے دریافت شدہ حقائق کو انسانیت کے خوابوں کی تکمیل کے لیے استعمال میں لانے کی تدبیر تو کی جا سکتی انھیں بدلا نہیں جا سکتا۔ جب کہ اول تو سماجی علوم پر نیچرل علوم کے اصول لاگو ہی نہیں ہوتے۔ سماجی علوم کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ مگر انسانی علوم بھی اپنے سائنسی منطقے میں ''کیا'' اور ''کیسے'' سے سروکار رکھتے ہیں۔ ''کیا ہونا چاہیے'' کا منطقہ انسانی آئیڈیالوجی کا منطقہ ہے، انسانی

سماجی سائنس کا نہیں۔ اور ادب تو محض موجود کی تصویر کشی سے آگے ناموجود کو موجود بنانے کے جتن کرتا ہے۔ وہ بقول غالب ''عندلیب گلشنِ ناآفریدہ'' ہوتا ہے۔ گویا ادب موجود سے عدم اطمینان کی پیداوار ہوتا ہے اور کوئی نہ کوئی ''خوابیہ'' تعمیر تا ہے۔ چنانچہ آئیڈیالوجی یا نظریہ پسندی اس کی فطری اساس ہے۔ اب اگر یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ معنی کا عدم قیام، نظریے کی نفی اور مہا بیانیے کا انکار استعماری پیش رفتوں کے خلاف مزاحمتی فکر و احساس کے راستے مسدود کرنے میں سہولت پیدا کرتا ہے تو ایک خاص برینڈ کی نام نہاد علمی سنجیدگی سے انحراف کا طعنہ داغ دیا جاتا ہے۔ اس طعیاتی استعماریت کے اثرات کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اشتراکیت کے عروج کے زمانے میں ہمارے ادب میں ترقی پسند رجحانات کا چرچا تھا اور ہماری تنقیدی تحریروں میں بار بار کمٹمنٹ کا لفظ استعمال ہوتا تھا اور تخلیق کار سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ اس کی تحریروں میں انسان کے سماجی و معاشی مسائل کے اجتماعی و انقلابی حل کی تڑپ جھلکنی چاہیے۔ ان سے اختلاف کرنے والے بیشتر اہلِ فکر کا اعتراض یہ نہیں تھا کہ انسانوں کے مسائل سے ادب کا سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ ایک تو انسانی سروکار کا دائرہ صرف معاشی مسائل تک محدود نہیں ہوتا، انسانی وجود کے تہذیبی و جمالیاتی، روحانی اور دیگر تمام مطالبے بھی کم اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ تمام ادب کے موضوعات ہیں اور کوئی تخلیق کار اپنی افتادِ طبع کے مطابق ان سے بھی کمٹمنٹ کا اظہار کر سکتا ہے۔ مگر اب صورتِ حال یہ ہے کہ تنقیدی تحریروں سے کمٹمنٹ کی اصطلاح ہی غائب ہوگئی ہے۔ بل کہ ایک طرح سے شجرِ ممنوعہ بن کر رہ گئی ہے۔

صرف اتنا ہی نہیں متداول ادبی تھیوری کی محدودیت ہماری تخلیقی روایت کے بعض انتہائی قدر و قیمت کے حامل معنیاتی علاقوں کی تفہیم سے عاری رہتی ہے۔

مثلاً ہماری کلاسیکی شاعری کے تصورِ جنوں اور مظہرِ دیوانگی کو صرف بندھے ٹکے رویوں اور رجحانات سے انحراف تک محدود کر دینا اور اس کے دائرۂ معانی سے کسی آئیڈیل کے ساتھ انتہائی گہری وابستگی کے پہلو کو منہا کر دینا۔

یا

آہ و فغاں کو صرف اظہارِ غم و الم کا مظہر جاننا اور کسی مثالیے کے لیے ایک عاشقانہ وجودی تڑپ کی مثبت و فعال معنویت تک رسائی نہ حاصل کر پانا۔

کیا ایسا عجزِ تفہیم ہماری کثیر الجہت تہذیب و تخلیقی روایت کے ساتھ تکسیری سلوک کا مرتکب نہیں ہوتا۔

اس اجمال کی تفصیل میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، سرِ دست اتنا ہی کافی جانیے۔

☆☆☆☆☆

رانا محمد شاہد کی کتاب ''شاہد و مشہود'' پر ایک نظر

نوجوان دانشور، ادیب، کالم نگار اور نقاد رانا محمد شاہد کا تمام ادبی و صحافتی میدانوں میں ارتقائی و ارتفاعی سفر میری نظر میں ہے۔ اُن کی تین عمدہ کتابیں 'طنابِ فکر''، ''سخن سرائے'' اور 'شہابِ فکر'' میرے مطالعے میں آچکی ہیں جن کے ذریعے اُن کی متنوع تخلیقی جہات کا ادراک بھی ہوا، اور اب ان کی چھٹی کتاب ''شاہد و مشہود'' میرے سامنے ہے۔ کتاب پر کچھ کہنے سے پہلے مَیں بڑی بے ساختہ قسم کی داد اس کتاب کے عنوان پر رانا محمد شاہد کو ضرور دینا چاہتا ہوں کہ چونکہ یہ کتاب زیادہ تر مختلف کتابوں پر ان کے تبصروں اور تاثرات پر مشتمل ہے تو یقیناً انھوں نے ان کتابوں کو ''مشہود'' کی صورت دے کر اُن کا مطالعہ بھی کیا ہوگا بلکہ ان کے تخلیقی و تحقیقی دائرے میں تو کتابوں کے مصنفین بھی آئے ہوں گے اور لازم و ملزوم کے فلسفے کے تحت 'مشہود' کا وجود بھی 'شاہد' کا محتاج ہوتا ہے ہمارے یہاں تو 'شاہد' ذاتی حیثیت میں اپنے نام کی مناسبت سے بھی موجود ہے اور بطور مصنف بھی، چنانچہ احمد فراز کا مصرع یہاں پوری طرح منطبق ہوتا ہے کہ ''نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں''۔

یہ کتاب عہدِ رواں کے کچھ ممتاز شعرا اور قلمکاروں اور اُن کی کتابوں پر لکھے گئے پچیس مضامین پر مشتمل ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میری کتابیں بھی رانا محمد شاہد کے عمیق مطالعے کا شرف حاصل کرتی ہیں اور پھر ان کے تاثرات اُن کی کتابوں میں شائع ہونے کے علاوہ اخبارات و جرائد کی زینت بھی بنتے ہیں۔ اس کتاب میں میری دو کتب ''اے ارضِ وطن'' اور ''شذراتِ نسیم سحر'' پر اُن کے محبت

نسیم سحر

بھرے تبصرے میرے لیے باعثِ عزّو شرف ہیں۔ اس بیچ میدان کے علاوہ جن مشہور و معروف ہستیوں کی کتابوں پر رانا محمد شاہد کی "دو شہودیت" اجاگر ہوتی ہے ان میں جمیل احمد عدیل، اکرم باجوہ (مرحوم)، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر سید قاسم جلال، خادم حسین مجاہد کے علاوہ کچھ دیگر معروف ادیبوں، دانشوروں اور سیاست دانوں کے حوالے سے تحریریں بھی شامل ہیں۔

رانا محمد شاہد کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی مضمون کو محض کتاب کے بارے میں اپنے تبصراتی دائرے تک ہی محدود نہیں رکھتے، بل کہ اس میں دوسری یادداشتیں، مصنف سے اپنی ملاقاتوں کی روداد بھی بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے عہد اور سیاسی و سماجی ماحول کی نسبت سے بھی تبصرہ کرتے جاتے ہیں جس کی بدولت ان کی کوئی تحریر "جوابِ مضمون" کے درجے تک محدود نہیں رہتی بل کہ جامعیت کے درجے تک جا پہنچتی ہے۔ ان کا ہر کالم محض اخبار میں شائع ہونے والا "یک روزہ" کالم نہیں ہوتا بل کہ ادبی معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترنے والا ایک مکمل مضمون ہوتا ہے۔ میں یہاں اُن کی تحاریر میں سے محض چند نمونے اپنے تاثرات کے ساتھ پیش کروں گا کہ یہ سب تحاریر تو کتاب میں شامل ہیں اور یقیناً جب قارئین ان کا مطالعہ کریں گے تو انھیں میرے تاثرات کی تائید کرتے ہی بنے گی۔

آج کے ایک جدا طرز کے ادیب جناب جمیل احمد عدیل کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جمیل احمد عدیل نے 'موم کی مریم' سے جو سفر شروع کیا تھا وہ اپنے منفرد اور سحر انگیز اندازِ تحریر کی وجہ سے نہ صرف جاری و ساری ہے بل کہ انھوں نے اپنے فن کا لوہا بھی منوایا ہے"۔

اسی طرح ڈاکٹر صفدر محمود کی کتاب "سچ تو یہ ہے" کے مطالعے کے بعد رانا محمد شاہد قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بارے میں ان کی قیمتی باتیں کتاب میں شامل کر کے کتاب کو مزید بیش قیمت بنا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر فرید احمد پراچہ جیسے بااصول دانشور اور سینئر سیاست دان کی خود نوشت "عمرِ رواں" کی نسبت سے رانا شاہد کی تحریر قابلِ مطالعہ ہے اور مجھے اس کے مطالعے کے بعد یوں محسوس ہوا کہ ابھی کچھ دن قبل مَیں نے بھی اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اس پر کچھ لکھنے کے ارادے سے جو نوٹس بنائے تھے ان کی پوری پوری ترجمانی رانا محمد شاہد نے اپنے مضمون میں کر دی ہے، اور اب اگر مَیں اس پر کچھ لکھوں گا تو رانا محمد شاہد کے تاثرات کی تکرار یا دُہرائی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

معروف صحافی ضیا شاہد کی کتاب "میرا دوست، نواز شریف" کے بارے میں اُن کی تحریر سے ہمارا اُس نواز شریف سے تعارف ہوتا ہے جو سوشل میڈیا اور ٹی وی چینلز پر پیش کی جانے والی شخصیت سے ہٹ کر ایک مختلف شخصیت کا حامل ہے اور

یہاں اس شخصیت کے ذکر کو رانا محمد شاہد نے اپنے ایک دلچسپ جملے سے مزید لذیذ بنا دیا ہے کہ "کتاب کے جس حصے میں چائے، ٹھنڈے فالودے، گرمیوں میں ٹھنڈے دودھ کا گلاس جس میں فالودے کی سویاں ہوں اور گاجر کے حلوے کا ذکر ہو وہ حصہ مزیدار کیوں نہ لگے گا"

اسی طرح علامہ خادم حسین رضوی کی شخصیت اور ملک کے سیاسی و مذہبی پس منظر میں اُن کے کردار کے حوالے سے بھی ان کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کے مصنفین کے نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ ہمیں رانا شاہد کا اپنی نظریاتی زاویہ بھی نظر آتا ہے۔

ایک اور اہم تحریر جس کی طرف میں خاص طور پر قارئین کی توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ "بے مثل ریاست کا شہر بے مثال بہاولپور" کی کتاب کے مصنف ڈاکٹر شاہد حسن رضوی سے رانا محمد شاہد کی ملاقات پر مشتمل ہے جس میں اس ملاقات کی تفصیل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ رانا شاہد نے ایک ایسی اہم بات لکھ دی ہے جسے ایک بیش قیمت نصیحت یا مشورہ سمجھ کر تمام محققین، ناقدین اور قلمکاروں کو اپنے پلے باندھ لینی چاہیے۔ اِس کتاب کے مصنف ڈاکٹر شاہد حسن رضوی کا یہ قول زرّیں ملاحظہ ہو:

"سچی بات یہ ہے کہ کوئی کام حرف آخر نہیں ہوتا بلکہ اس میں گنجائش ہمیشہ رہتی ہے اس لیے جو کچھ کر سکا وہ پیش کر رہا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ اس میں رہ جانے والی کوتاہیوں کو قارئین خاص کر اہلِ علم اس میں موجود خامیوں کی نشان دہی فرمائیں گے تا کہ اگلے ایڈیشن میں وہ دور کی جا سکیں"۔

ان مشاہیرِ ادب سے ہٹ کر رانا محمد شاہد نے کچھ عمومی قلمکاروں پر بھی عمدہ انداز میں اظہار خیال کر کے انہیں ادبی تاریخ کا اہم کردار بنا دیا ہے۔ انھی میں ایک اہم مضمون رسالہ "چاند" میں کئی عشروں تک لکھنے والے قلمکار جناب خادم حسین مجاہد کے بارے میں بھی ہے، یادش بخیر اُسی عہد میں راقم السطور بھی 'چاند' اور 'قہقہہ' میں اپنی تحریریں شائع کروانے کو فخر سمجھتا تھا، اس حوالے سے خادم حسین مجاہد کے علاوہ بہت سے شگفتہ نگاروں کے نام اور اُن کی تحریریں مجھے یاد ہیں جن کی مزاح نگاری کا اسلوب اچھوتا اور قہقہہ آور ہوتا تھا۔ اب رانا محمد شاہد نے خادم حسین مجاہد کا ذکر کیا تو اُن کا شکریہ کہ اس زمانے کی بہت سی یادیں میرے ذہن میں بھی تازہ کر دی ہیں۔

اس کتاب کا آخری مضمون جناب جمیل احمد عدیل کی نہایت ہی علمی و عقیدتی انداز میں لکھی گئی کتاب "قیل و قال" پر ہے جسے میرے خیال میں اہمیت کے لحاظ سے اس کتاب کا پہلا مضمون ہونا چاہیے تھا۔ تاہم اب جو پہلا مضمون ہے وہ بھی جناب جمیل احمد عدیل ہی کا ہے، اور یہ بھی کہتا چلوں کہ اس کتاب میں جمیل احمد عدیل کے بارے

میں تین مضامین شامل ہیں مگر تکرارِ بیان کا احساس اس لیے نہیں ہوتا کہ ہر کتاب ایک مختلف موضوع پر ہے اور قابلِ مطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے ساتھ ساتھ نفسِ مضمون کی نسبت سے بھی اچھوتی ہے۔ یوں گویا اس کتاب کے معنی 'مین آف دا میچ' تو جمیل احمد عدیل ہی ٹھہرتے ہیں۔

رانا محمد شاہد کی اس کتاب کے سطر در سطر مطالعے کے دوران میں مَیں نے خاص طور پر نوٹ کیا ہے کہ رانا محمد شاہد ہر کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے ہیں اس لیے کمپوزنگ کی غلطیاں بھی ان کی عمیق نگاہ سے اوجھل نہیں رہتیں، راقم السطور بھی ہر کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے اسی اصول پر کاربند رہتا ہے، چنانچہ رانا محمد شاہد کی اس کتاب میں بھی اگرچہ بہت کم کمپوزنگ کی غلطیاں نظر میں آئیں مگر ان کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اگلے ایڈیشن میں ان کی تصحیح ہو سکے۔ کتاب میں اکثر جگہ 'بہر حال' کو 'بحر حال' لکھا گیا ہے، ایک جگہ کتاب کے کارٹن کا ذکر کرتے ہوئے اسے کاٹن لکھ دیا گیا ہے جبکہ ایک بڑی دلچسپ کمپوزنگ کی غلطی جمیل احمد عدیل کی ایک کتاب پر مضمون میں ہوئی ہے کہ "کتاب پر قیمت پانچ سو روپے درج ہے" کی جگہ لکھا گیا ہے "کتاب پر قیمت پانچ سو روپے درجن ہے"۔ تفنن بر طرف، خدا نہ کرے کہ کبھی کتابیں یوں درجن کے بھاؤ بکنے لگیں۔ مزید یہ کہ ان کے کچھ مضامین میں بعض واقعات کی تکرار بھی محسوس ہوتی ہے جو الگ الگ مضامین کی صورت میں تو گوارا ہے مگر کتابی صورت میں اس تکرار سے بچنا بہتر ہوتا۔

یہ کتاب حسنِ ادب پبلشرز، فیصل آباد کے زیرِ اہتمام سرورق پر مصنف کی دلکش تصویر کے ساتھ شائع ہوئی ہے جس پر فلیپ ڈاکٹر زاہد منیر عامر جیسے نامور نقاد کا لکھا ہوا ہے جبکہ دیباچہ نگاروں میں راقم السطور کے علاوہ جمیل احمد عدیل، خالد جاوید اور ڈاکٹر عارف حسین عارف جیسے معروف ادیبوں کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان معروف ادیبوں کے دیباچے بھی اس قدر اہم اور خیال افروز ہیں کہ ان کے اقتباسات درج کیے جائیں، مگر مضمون کی طوالت آڑے آ رہی ہے۔

اپنا یہ مضمون اس دعا پر تمام کرتا ہوں کہ خدا کرے رانا محمد شاہد جیسے زرخیز لکھاری پر یہ توفیقات ارزانی ہوں کہ وہ اسی طرح اپنی "مشہودیت" کا حاصل کتابی صورت میں ہمارے سامنے لاتے رہیں۔ بلاشبہ ہر کتاب پر وہ اپنا مضمون کچھ اتنی عمیق نظری اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ تحریر کرتے ہیں کہ کتاب کے ساتھ ساتھ صاحبِ کتاب کا، اور جس عہد میں وہ سانس لے رہا ہے اس کا منظر نامہ بھی، اور اس کے دوستوں کا مختصر تعارف بھی اسی ایک مضمون یا اظہاریے میں ہو جاتا ہے۔" اور اس عہد کے فنکار سے کیا چاہتے ہو؟"۔

☆☆☆☆☆

ادب ادیب اور اسلام عظمی [1961 سے شروع ہونے والا ادبی سفرنامہ] (قسط پنجم)

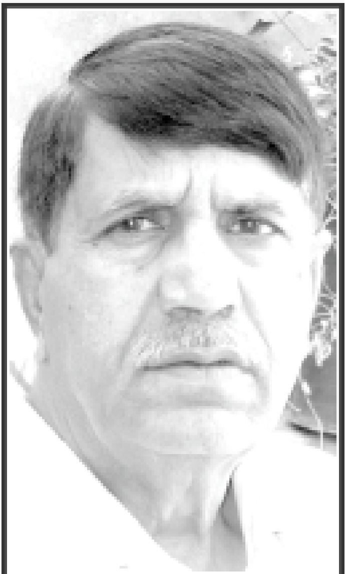

اسلام عظمی

کسوٹی حمایت علی شاعر کا پی ٹی وی پر پیش کیا جانے والا مقبول پروگرام تھا۔ کسی شخصیت جگہ یا کوئی حوالا لکھ کر پروگرام کمپیئر کے پاس محفوظ کر دیا جاتا۔ وہ ماہرین کی ٹیم کو جیسے اندھیرے میں تیر چلا کر بیس سوال پوچھ کر راز افشا کرنا ہوتا۔ یہ ماہرین افتخار عارف اور عبیداللہ بیگ تھے۔ ماہرین عموماً بیس سوال پورے ہونے سے پہلے ہی پوچھنے والے کے دماغ کے اندر جھانک کر راز یا نام افشا کر دیتے۔ کامیابی ہمیشہ ماہرین کا مقدر تھی۔

متحدہ عرب امارات میں مجھے چوبیس مارچ انیس سو اسی کو رفیق اظہر کا خط ملا۔ خط میں لکھا تھا۔۔۔

کل تیئس مارچ کو شکر پڑیاں کے ہرے بھرے جنگل میں میرا اور عبدالستار کا متفقہ فیصلہ ہوا کہ تم بھی بہت اچھے ہو۔ عبدالستار صاحب کہنے لگے کہ سلام کو پاکستان سے گئے ایک سال ہو گیا ہے، پتا نہیں کیسے گزارا کر رہا ہے۔ یہاں تو جنرل ضیا کا بہت سخت پہرہ ہے۔ میں تو یہاں تک خوف زدہ ہوں کہ میری بیوی محض مذاق میں مجھے باز رہنے سے کہ دے تو میں ہرگز یہ حق نہیں جتاؤں گا کہ تم میری منکوحہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ پڑتال کے وقت کوئی معمولی سقم نکل آئے اور میں دھر لیا

جاؤں۔ یہاں پر ٹی وی پر کسوٹی پروگرام دوبارہ چل رہا ہے۔ افتخار عارف اور عبیداللہ بیگ ماہرین ہیں۔ زبردست مطالعہ ہے اِن دونوں کا۔ اسی ہفتہ اُن سے ایک شخصیت کے متعلق پوچھا گیا۔

ماہرین۔ مرد۔۔۔

سائل۔ ہاں

ماہرین۔ مسلمان۔۔۔

سائل۔ ہاں

ماہرین۔ مشرق وسطیٰ کی کوئی شخصیت۔۔۔

سائل۔ ہاں

ماہرین۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کی کوئی شخصیت۔۔۔

سائل۔ ہاں

ماہرین۔ کیا وہ شخصیت ہجرت کرنے والوں میں شامل تھی۔۔۔

سائل۔ ہاں

بیس سوال پورے ہو گئے مگر ماہرین نام بتانے سے ناکام رہے۔ وہ شخصیت تھی۔۔۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

بیک وقت دونوں نے احساس ندامت سے سر جھکا لیے۔ سائل نے جب خود نام بتایا تو اس انداز سے دونوں ماہرین نے سر جھکائے کہ جیسے ناکام ہو کر بھی وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ بڑا دیدنی منظر تھا۔ افتخار عارف کا ایک شعر سنو۔

تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں
جان بہت شرمندہ ہیں

آسان چیزیں بھی مشکل میں ڈال دیتی ہیں۔ بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں والا محاورہ درست لگنے لگتا ہے۔ جواب یادداشت میں ہوتا ہے مگر کوئی اچانک پوچھ لے تو تائیں تائیں فش۔ اُن کے گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ کوئی یہ نام پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ ہے نا عجیب بات۔۔۔

رفیق اظہر نے یہ بھی لکھا کہ ترقی کے لحاظ سے براعظموں کی ترتیب۔۔۔

امریکہ، یورپ، ایشیا اور افریقہ۔

اور مسلمانوں کی فی صد آبادی کے لحاظ سے ترتیب ۔۔۔

افریقہ، ایشیا، یورپ اور امریکہ۔

ہے نا عجیب اتفاق۔۔۔

اُنھی دنوں غالباً اوراق کا شمارہ میرے ہاتھ آیا۔ اُس میں کسی نے مشفق خواجہ کے حوالے سے کسی ادبی شخصیات کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی ہوئی تھی اور کم وبیش یہ لکھا تھا۔۔

کچھ لوگ افتخار عارف اور پروین پر ایک دوسرے کے خیالات کی چوری کا الزام دھرتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسا نہیں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں نے کسی ایک ماخذ سے استفادہ کیا ہو اور یوں۔۔۔

سرقہ میں توارد ہو گیا ہو۔

سچ جھوٹ اپنی جگہ۔ بحث ومباحثہ اپنی جگہ۔ سچ یہی ہے شہرت یافتہ افراد کو اکثر اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ اُن افراد سے محبت کرنے والوں کو اس صورت حال سے بہت

صدمہ پہنچتا ہے۔ (مرحوم) خالد احمد کے آخری دنوں میں خالد احمد اور عطاالحق قاسمی کے دو چار کالموں نے دونوں سے محبت کرنے والوں کو دلی صدمہ پہنچایا۔ صوفیانہ سوچ ذرا ہٹ کر ہے۔ بابا بلھے شاہ نے کہا ہے--- مسجد ڈھا دے مندر ڈھا دے، دِل نہ کسے دا ڈھائیں ---

ایک زمانے میں عطاالحق قاسمی اور امجد اسلام امجد کی یاری دوستی تھی۔ پھر اس میں کچھ دراڑ آ گئی۔ خیال وفن کے نائب مدیر محمد اکرم نعیم نے تو امجد اسلام امجد سے اس بارے میں پوچھ بھی لیا۔ پچھلے دنوں عطاالحق قاسمی نے اپنے کالم میں اس بارے کچھ روشنی ڈالی--- یادداشتیں لکھنے میں یہی خرابی ہے کہ کبھی کبھی تلخ باتیں بھی تحریر ہو جاتی ہیں --- مگر سچ یہی ہے کہ مجھے سرقہ میں توارد والی بات نے بہت مزا دیا۔ امکانات کی دنیا سوچ سے کہیں بڑھ کر وسیع ہے۔ ایسے میں خیالات کا ٹکراؤ ہو جانا کوئی ناممکن یا اچنبا نہیں۔ پر یمی اظہار محبت میں--- مجھے تم سے محبت ہے--- کا گھسا پٹا جملہ ہی بولتے ہیں - وہ جملہ جو لاکھوں کروڑوں بار دہرایا جا چکا ہوتا ہے مگر پہلی بار بولنے والے کو ایسا لگتا ہے کہ یہ جملہ پہلی بار اُس پر نازل ہوا ہے۔ یہ سطریں لکھ رہا تھا تو یاد آیا کہ میں اور شفیق سلیمی خالد احمد سے ملنے کے لیے بیاض کے دفتر جا رہے تھے۔ راستے میں شفیق سلیمی نے بتایا کہ فلاں دوست نے میرے کئی مصرعے اڑا لیے ہیں - تم اس بارے میں کچھ لکھو۔ اس سے پہلے شفیق سلیمی کے یہ شعر ملاحظہ کر لیجیے کہ یاد آ گئے ہیں۔

سنگ و سنگ وصدا مرے پیچھے پڑے ہوئے
اک دوڑ سی ہے ہم میں برابر لگی ہوئی

مدت کے بعد آئے تو روٹھی ہوئی تھی
تختی ہمارے نام کی در پر لگی ہوئی

....

میں نے جواب دیا--- تو کیا ہوا۔ لوگ تمھارے شعروں کو پہچانتے ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہر شاعر کو اپنا کلام پیارا لگتا ہے۔ سو اُسے بہرحال رنج پہنچتا ہے۔ پھر کھلا ہے کہ وہ یہ جھگڑے یہ لفڑے سانس کے چلنے تک ہیں۔

جگر مراد آبادی کے بارے کہیں پڑھا تھا کہ جگر کے غزل پڑھ لینے کے ساتھ ہی مشاعرے کا اختتام ہو جاتا۔ سامعین پھر کسی اور کو یا کسی اور کی سننے پر آمادہ نہ ہوتے۔ جگر روانہ ہوتے تو سامعین اس ہوٹل تک جہاں جگر مراد آبادی ٹھہرے ہوتے، تانگے کے ساتھ ساتھ بھاگے چلے جاتے۔ پاکستان میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا مگر اب ایسا ہندوستان میں بھی نہیں ہوتا۔ محبتوں اور مروتوں کے انداز بدل گئے ہیں۔ سن دو ہزار کے آس پاس میں لمبی چھٹی پر آیا تو حسین مجروح کراچی سے واپس آ چکا تھا۔ اُس کا حبیب بنک کا قانونی دفتر ایل ڈی اے پلازہ میں تھا۔ میں گاہے بگاہے اسے ملنے چلا جاتا - اس کی وساطت سے میں نے ازانوں کا ہرا موسم کے نسخے بہت سے لکھاریوں تک پہنچائے۔ ایک بار بتایا کہ

میرے پاس سیکڑوں غیر مطبوعہ غزلیں جمع ہو چکی ہیں۔ کوئی بندہ کمزور شعروں کی نشان دہی کر دے تو اچھا رہے گا۔ حسنین مجروح نے ایک نام لیا اور اگلے لمحے ہی مجھے روک دیا۔۔۔

ایسا مت کرنا۔ اس بندے نے تو اگلے روز ہی پورے لاہور میں یہ ڈھنڈورا پیٹ دینا ہے کہ اسلام عظمی میری شاگردی میں آ گیا ہے۔

شفیق سلیمی مجھ سے کئی سال پہلے پردیس سے لوٹ آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ جب میری وطن واپسی ہوئی تو فلاں استاد ملا تو اس نے قدرے مایوس لہجے میں کہا۔

شفیق سلیمی تو کیا آپ پکے پکے واپس آ گئے ہو۔۔۔ میں اس کی بات سمجھ گیا اور اسے تسلی دی۔۔۔ پکا پکا آ گیا ہوں مگر آپ نہ گھبرائیں۔ میرا مال دوسری اور جاتا ہے۔

اقبال ساجد اور ساغر صدیقی سے ایسی ہی کئی کہانیاں منسوب ہیں۔ غافر شہزاد نے ایک کالم بھی اس موضوع پر لکھا تھا۔ غالب کے انکار کے باوجود شاعری بہرحال کچھ نہ کچھ ذریعہ عزت ضرور ہے۔ شہرت بھی عطا کرتی ہے۔ اور شہرت کے حصول کے لیے تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ یہ بھی ہے کہ ماسوائے چند ناموں کے اکثر نام بھلا دیے جاتے ہیں۔ دنیا چلو چلی کا میلہ ہے۔ مدتوں بیرون ملک رہنے کی وجہ سے مجھے دوستوں اور عزیزوں کے سفر آخرت میں شمولیت کا موقع نہیں ملا۔ اتفاقاً چھٹی پر آئے ہونے کی وجہ سے قیوم نظر کے بیٹے سلمان بٹ اور حسنین مجروح کی بیوی کے سفر آخرت میں البتہ شامل ہوا تو وہاں پر کم و بیش سبھی لکھاریوں سے ملاقات ہو گئی۔ خالد احمد کے سفر آخرت میں کون سا لکھاری تھا جو وہاں نہ تھا۔

رفیق اظہر نے ادبی جلسوں میں میری غیر حاضری پر رفیق اظہر نے مجھے کہا۔۔

اسلام عظمی، ادبی جلسوں میں آیا کرو۔ یہی تو ہماری برادری ہے۔ مگر جب رفیق اظہر اور پھر شفیق سلیمی نے وفات پائی تو اُن کے جنازوں میں چار پانچ لکھاری ہی تھے۔

تاہم اختر شمار کے جنازے میں تاہم درجن دو درجن ادبی لوگ ضرور تھے۔ سماعت کی کمزوری کی مجبوری کی وجہ سے گوشہ نشین ہونے سے پہلے مجھے ایسا لگا تھا کہ سو ڈیڑھ سو لکھاریوں کی وجہ سے ادبی محفلوں کی رونق قائم ہے۔ مگر یہ بھی غنیمت ہے۔ کبھی کبھی وہ دور یاد آنے لگتا ہے کہ اچھا شعر آپ ہی آپ اُڑان بھرنے لگتا تھا۔ لوگ اچھا شعر سوغات کے طور پر دوسروں کو سنا کر خوش ہوتے۔ پھر وقت بدلنے لگا۔ میں نے اپنے شعری مجموعہ اُڑانوں کا ہرا موسم کے پیش لفظ میں لکھا۔۔۔

یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی بوجوہ کمزور شعر کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جائے مگر ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ اچھے شعر کو داد نہ دے۔ پھر اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ بھی لکھا۔۔۔

مگر ہو سکتا ہے کہ دوسرے مفروضوں کی طرح سے یہ بات بھی محض مفروضہ ہو۔

یار زندہ صحبت باقی۔

[جاری ہے۔]

اپنی خاکستر سے دیپک جیون جوت جلائے

رخشندہ نوید اپنی شاعری کی چھ کتب ایک جلد میں جمع کیں اور اس مجموعے کا نام رکھا ''دیپک''۔ میری اس نام پر نظر پڑی تو شاہدہ پروین کی آواز میں ظہور نظر کا کلام سماعت میں رس گھولنے لگا:

دیپک راگ ہے چاہت اپنی کاہے سنائیں تمھیں
ہم تو سلگتے ہی رہتے ہیں کیوں سلگائیں تمھیں

....

نہ جانے اس میں کتنی حقیقت ہے مگر کہا جاتا ہے کہ تان سین نے اپنے مرشد کی موت کے صدمے سے نکلنے کو راگ دیپک گایا تھا، تو اس کا اثر الٹا ہوا، اس کے اندر جیسے آگ دہکنے لگی تھی۔ تان سین اپنے وجود کی حدت کو کم کرنے کے لیے ہندوستان میں یہاں وہاں گھومتا پھرا۔ ظہور الحق کی کتاب 'رہنمائے موسیقی' میں پڑھ رکھا ہے کہ یہ راگ فی زمانہ متروک ہے اور گانے والے اس کی جگہ شری راگ گانے لگتے ہیں۔ اسی کتاب میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ گئے دنوں میں جب یہ راگ گایا جاتا تھا تو چراغ جل اٹھتے اور آگ بھڑک اٹھتی تھی۔

اب اس راگ کو گانے سے کیا آگ دہکے گی؟

اس سوال کا جواب 'رہنمائے موسیقی' کے مصنف کے پاس یہ تھا کہ راگ تو اب بھی وہی ہے مگر اگلے زمانے کے وہ لوگ نہیں رہے جن کے گانے میں اثر تھا۔ تب ملہار سے بارش برستی تھی اور ہنڈول سے جھولا جھولنے لگتا تھا۔ اب کچھ نہیں ہوتا۔ رخشندہ نوید کا گمان ہے کہ جذبہ صادق ہو تو اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے، اسی لیے اپنے مجموعہ کلام 'خامشی کو سن رہی تھی' کی ایک نظم 'دیپک' میں انھوں نے 'رخشندہ و روشن دیپک' کی طرف دیکھا ہے اور کہا ہے:

''رخشندہ و روشن دیپک! اے میرے ہم نام
اپنی آگ میں ایک صدی تک جلنا تیرا کام''

''دیپک'' اردو اور پنجابی ادب کی ایک توانا، منفرد اور باوقار آواز، رخشندہ نوید کا ایک جلد میں چھ کتب پر مشتمل ضخیم مجموعۂ کلام ہے۔ یہ مجموعہ اپنی جسامت ہی کے سبب نہیں، اپنے فکری، جمالیاتی اور حسی پھیلاؤ کے باعث بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ لگ بھگ نو سو صفحات پر مشتمل رخشندہ نوید کی اردو شاعری کی پانچ اور پنجابی شاعری کی ایک کتاب پر مشتمل کلام کو اس کلیات میں بہم کر دیا گیا ہے۔ تاہم اس میں سے رخشندہ نے دو اہم جہات کو الگ کر لیا ہے۔ ویلنٹائن شاعری پر مشتمل کتاب ''کوچۂ جاناں'' اور بچوں کے لیے لکھی گئی نظمیں اور کہانیاں اس کلیات میں شامل نہیں ہیں۔ یوں مشمولات کے اعتبار سے یہ ایک حد تک انتخاب ہے، تاہم معنی اور تاثیر کے اعتبار سے بھرپور ہے۔

'دیپک' میں شامل کتب کے نام ہی شاعرہ کے

محمد حمید شاہد

نسائی وجود، اس کی نارسائی، اور اس کی خود آگاہی کے بیانیے کو روشن کر دیتے ہیں: ''پھر وصال کیسے ہو''، ''کسی اور سے محبت''، ''نیناں اتریں پار''، ''خاموشی کو سن رہی تھی''، ''حالی آنا دسیا نا ہیں''، اور ''رات مجھے اچھی لگتی ہے''۔ یہ نام محض عنوان نہیں، بل کہ ایک فکری اور احساس کی لطیف سطح پر سفر کی کہانی بھی ہیں؛ ایک ایسی عورت کی کہانی جو محبت، ہجر، سماج، گھر، اور ذات کے بیچ آگے بڑھنے کے لیے اپنا راستہ بناتی ہے اور اپنی ہی دھن میں آگے بڑھتی جاتی ہے۔

رخشندہ نوید بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ کہی جا سکتی ہیں، مگر ان کا مرغوب علاقہ غزل ہے: ایسی غزل جو صنف کے ساتھ کھیلتی نہیں، بل کہ اس کے اندر رہ کر اپنی وسعتیں تلاش کرتی اور اسے ایک کہانی سا بنا دیتی ہے۔ محبت دو وجودوں کی کہانی کو کیسا بنا دیتی ہے، ذرا غزل کا یہ شعر دیکھیں:

میں اُس کی خامشی کو سن رہی ہوں
وہ اظہار محبت کر رہا ہے

....

ایک اور غزل کے یہ اشعار دیکھیں اور جس سادگی اور سہولت سے مناظر کے بیان کے اندر ایک گہری بات رکھ کر گئے چنے لفظوں سے تصویروں کا البم بنا کر تاثیر بڑھا لی گئی ہے، اس کا بھی لطف لیں:

بزم میں جس طرف نظارے تھے
پوری کرسی گھما کے دیکھا تھا

....

ماہتاب اتنی دور تھا ہم سے
بادلوں کو ہٹا کے دیکھا تھا

سانولا سانولا ہوا سب کچھ
جب بھی کاجل لگا کے دیکھا تھا

....

رخشندہ لسانی یا ہیئتی تجربات کے شور میں خود کو گم نہیں کرتیں؛ ان کا تخلیقی وجدان ماضی یا مستقبل سے زیادہ حال میں قیام کرتا اور اس کی شدت کو محسوس کرتا ہے۔ ان کے یہاں خود کلامی، تخاطب اور مکالمہ؛ سب دل کی واردات بن کر سامنے آتے ہیں۔

ان کی غزلوں میں ذاتی احساسات کی عکاسی اس طرح ہوتی ہے کہ قاری کو اپنی ہی کیفیت کا عکس دکھائی دینے لگتا ہے:

در و دیوار سے جالا نہیں جاتا اماں
مجھ سے گھر بار سنبھالا نہیں جاتا اماں

میں جو آنسو کی طرح لوٹ کے پھر جا نہ سکی
یوں تو اپنوں کو نکالا نہیں جاتا اماں

....

یہ محض شکایت نہیں، ایک عہد کی تھکن ہے؛ ایک مشرقی عورت کی وہ آواز جو گھر، سماج اور ذات کے بوجھ تلے بھی وقار کے ساتھ کھڑی ہے اور اپنے دکھ کسی اور سے نہیں بس اپنی ماں سے کہتی ہے۔

رخشندہ کی شاعری میں فکر غلبہ آور نہیں ہے تاہم وہ فکر سے تہی بھی نہیں ہیں۔ ان کے ہاں شعری جمالیات کا ایک ایسا علاقہ وضع ہوتا ہے جہاں تعقل سب سے پہلے کسی پیکر میں کلام کرتا ہے۔ مختصر بحروں کی غزلیات میں ان کی گرفت خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ چند مصرعوں میں وہ ایک مکمل منظر اور کیفیت بُن دیتی ہیں:

آج کی رات سو کے دیکھیں گے
ہم سمندر کی چارپائی پہ

....

یہ سادگی دراصل گہرے حسی شعور کی علامت ہے۔ زبان عام فہم ہے، مرکبات مانوس مگر تاثیر دیرپا۔ رخشندہ کا مقصد قاری کو چونکانا نہیں، بل کہ ساتھ لے کر چلنا ہے۔ ان کے یہاں نہ محض رومان شاعری کا وظیفہ بنتا ہے، نہ ہی محض احتجاجی لحن غالب آتا ہے۔ نسائی حسیت ضرور ہے، مگر وہ مرد کو منہا کر کے نہیں، تعلق کے تناظر میں سامنے آتی ہے۔

نظم کے میدان میں رخشندہ نوید کا تنوع حیران کن ہے۔ پابند، آزاد اور معرا؛ ہر اسلوب میں ان کی نظم ایک کہانی کے قریب رہتی ہے۔ "ذرا سا گھر بڑا لو" جیسی نظم سرمایہ پرستی اور سماجی نمائش کے عہد میں انسان کی تنہائی اور آخری رسومات کی تلخ سچائی بیان کرتی ہے۔ "رات کی رات" جیسی نظم شادی شدہ عورت کی جذباتی ٹوٹ پھوٹ اور محبت کی عارضی ترجیحات کو نہایت فنکارانہ پیرائے میں پیش کرتی ہے۔

ان کے استعارے زندگی کے روزمرہ تجربات سے پھوٹتے ہیں: "آنکھوں سے بہتا ہوا درشوق، جسم کی شاخ پر کھلتا ہوا زخم" یہ سب قلبی اور روحانی تشنگی کے پیکر ہیں۔ گھر، باہر، باطن، سماج، انسانی تعلق، باہمی تکریم، یہ سب موضوعات ان کی شاعری میں زندگی کے اثبات کے ساتھ جلوہ گر ہو رہے ہیں۔

حمدیہ اور نعتیہ کلام میں بھی رخشندہ نوید روایت سے آگے بڑھتی ہیں۔ ہر مجموعے کے آغاز میں تقدیسی شاعری کو شامل کیا گیا ہے۔ یہاں محض عقیدت کا اظہار اور تقدیسی مضامین نہیں ہیں کہ اس باب میں بھی انھوں نے ذاتی تجربے عقیدے اور عقیدت کو تخلیقی عمل سے گزارا ہے تو وہ شاعری ہوئی ہے۔ مثلاً جب وہ ماں کی درود خوانی کا ذکر کرتی ہیں یا اپنی رخصتی کے وقت سایۂ قرآن تلے ہونے کے احساس کو بیان کرتی ہیں تو بالکل ایک الگ سے، اچھوتے اور ذاتی احساس کو شعر کا روپ دے رہی ہوتی ہیں۔

پنجابی شاعری میں رخشندہ نوید نے زبان کے مزاج اور آہنگ کو پوری دیانت داری سے برتا ہے۔ "حالی آنا وسیا نئیں" میں دھرتی، تاریخ، اور ذاتی شناخت کا رشتہ گہرا ہو جاتا ہے۔ پنجابی نظموں میں دھوپ، زخم، پیاس، اور ماں بولی، سب ایک ساتھ سانس لیتے ہیں۔

ان کے پہلے مجموعے سے لے کر دیپک میں جمع ہونے والے آخری مجموعے تک کے سفر میں تدریجی ارتقا اور فکری پختگی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ شاعری ہمارے پُر شور اور پراگندہ عہد میں ایک پرسکون سہارا بن جاتی ہے——اور یہی کسی بڑے شاعر کی پہچان ہے۔

آخر میں، نظم دیپک کے استعارے میں سمٹی ہوئی دعا کے ساتھ:

"رخشندہ و روشن دیپک! اے میرے ہم نام
اپنی آگ میں ایک صدی تک جلنا تیرا کام
اے میرے ہم نام!
سو برسوں تک ہجر کے نغمے رات میں اٹھ اٹھ گائے
اپنے درد میں جل کر آخر اک دن جل بجھ جائے
اپنی خاکستر سے دیپک جیون جوت جلائے"

....

امید کی جانی چاہیے کہ رخشندہ نوید کا یہ 'دیپک'، شاعری کا یہ ضخیم مجموعہ، تا دیر اردو اور پنجابی ادب کی جیون جوت جلائے رکھے گا۔

☆☆☆☆☆

میرا محسن، میرا مربی ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

سلمیٰ اعوان

1962 کا اوائل تھا۔ گھر میں اردو زبان میں ریڈرز ڈائجسٹ کے رنگ ڈھب کا ایک پرچہ آیا۔ بڑا دلچسپ اور منفرد سا لگا۔ گو میرے فکری شعور میں ابھی وہ پختگی نہیں تھی جہاں میں اداریے کی سیاسی تجزیاتی تحریر کو پرکھتی تاہم میرے لیے دلچسپی کا خاصا سامان بھی تھا کہ بڑے لکھنے والوں کی کہانیاں، نامور شخصیت کا انٹرویو، شکاریات، جاسوسی کہانی، کسی دوسری دنیا کا سفرنامہ، شعروادب، غرض کہ ہر نوع کا ذائقہ موجود تھا۔ الطاف فاطمہ سے محبت کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوا۔

ادارتی ٹیم سے تعلق ذرا بعد میں پیدا ہوا۔ الطاف حسن قریشی چونکہ ہر دفعہ کسی بڑی سیاسی یا سماجی شخصیت سے تعارف کرواتے۔ تحریر اور پیش کش کا انداز بھی بڑا منفرد، جذباتی اور وطن کی محبت و سرشاری میں بھیگا ہوا ہوتا۔ ان سے عقیدت اور محبت کا رشتہ ذرا جلدی استوار ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بھی کبھی کبھی کوئی تحریر نظر سے گزرتی۔

میرے اندر مشرقی پاکستان سے محبت، وہاں جانے اور وہاں کے بارے کچھ لکھنے کی خواہش کا محرک اردو ڈائجسٹ اور الطاف حسن قریشی تھے جن کے سلسلہ وار مضامین اردو ڈائجسٹ میں چھپ رہے تھے۔ اس وقت تک میں ایک دو کچے پکے ناول لکھ بیٹھی تھی۔

تاہم اردو ڈائجسٹ میں لکھنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ میری مرعوبیت تھی ڈھاکہ یونیورسٹی میں میری کلاس فیلو ارمانہ احمد بھی تھی۔ بہار کی اردو سپیکنگ جس نے مجھے بتایا کہ وہ اردو ڈائجسٹ میں افسانے لکھتی ہے۔ مجھے آج بھی اپنا تعجب سے بھرا ''ہیں'' کہنا یاد ہے۔ میری آنکھوں میں رشک اور حسد دونوں جذبے بیک وقت ابھرے تھے۔ میری آواز میں حسرت کا سا چھلکاؤ تھا جب میں نے کہا تھا۔ ''اردو ڈائجسٹ میں چھپتی ہو تم۔'' وہ یقیناً بڑی اونچی شے نظر آئی تھی مجھے۔

ڈھاکہ میں میرپور اور محمد پور خالصتاً اردو بولنے والوں کے علاقے تھے۔ سہیلیوں کے گھروں میں جانا ہوتا تو ہر گھر کے چھوٹے بڑے ڈرائینگ روم میں اردو ڈائجسٹ کے پرچے کا ہونا ضروری امر ہوتا۔ پرانے پرچے نفاست اور سلیقے سے بک شیلفوں میں سجے ہوئے ہوتے۔ عیدالفطر پر میں نے دھان منڈی کے اس گھر میں جانے کو ترجیح دی جہاں اردو ڈائجسٹ کے پرچے جلدوں کی صورت محفوظ تھے اور مجھے انہیں پڑھنے کی پوری آزادی تھی۔ یہیں میں نے ڈاکٹر اعجاز کو پڑھا۔ ان کے جرمنی میں قیام کی داستان نے بھی بہت متاثر کیا۔ یہ زمانہ اردو ڈائجسٹ کے عروج کا تھا۔

1971 میں سقوط ڈھاکہ ہو گیا۔ الطاف حسن قریشی کے نوحے جو محبت کا زمزم بہہ رہا ہے کے عنوان سے چھپتے تھے اور میرا درد بھرا ناول تنہا دہائیاں دیتا رہ گیا کہ یاروں کچھ تو سوچو مغربی پاکستان تنہا رہ جائے گا۔ اسے تھام کرو۔ مگر سنے کون؟

یہ 1977 کا زمانہ تھا۔ اخبار میں ایک اشتہار چھپا کہ ہفت روزہ سیاسی پرچہ ''زندگی'' جو اردو ڈائجسٹ کے بینر تلے نکل رہا تھا کے لیے خاتون رپورٹر کی ضرورت ہے۔ اب خود سے کہتی ہوں۔ ''چلو میاں شادی شدہ زندگی کے بتیرے مزے لوٹ لیے ہیں۔ بچوں کے گو موت میں اماں کے ساتھ مددگار بھی ہے۔ تو باہر نکل۔ اپنا چھ سال کا زنگ اتار۔ سمن آباد بس سٹاپ سے 121 ایکڑ سکیم پہنچنے تک میرے ساتھ ساتھ جذبات کا ایک ہجوم بے کراں بھی چلا کہ میں ایک ایسے مکتب فکر میں داخل ہونے جا رہی تھی جہاں ایک طرف دائیں بازو کے چوٹی کے صحافی پروان چڑھے تھے تو وہیں بائیں بازو کے لوگ بھی تھے سے لکھتے اور نوکریاں کرتے تھے۔ انٹرویو ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی نے لیا۔ انٹرویو کیا تھا۔ مزے مزے کی باتیں۔ مشرقی پاکستان زیادہ زیر بحث رہا۔

چند دنوں بعد ایک دن کسی نے سرگوشی میں بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کی دو بیویاں ہیں۔ خاندانی بیگم اوپر کی منزل میں رہتی ہیں اور محبت کی ڈور میں بندھنے والی بیگم کوئی سو گز پرے پچھواڑے کی کوٹھی میں مقیم ہیں - ڈاکٹر صاحب اولاد کے معاملے میں بڑے خوش نصیب ہیں۔ بڑی بھابھی کے ماشاءاللہ سے

چھ بیٹے اور دو بیٹیاں اور چھوٹی بیگم کے چھ بیٹے ہی ہیں۔

"ماشاء اللہ بارہ بیٹے۔ آنکھیں پھٹیں۔ اتنے بیٹے تو بادشاہوں کے ہی ہوتے ہیں"۔ تعجب بھرا لہجہ محسوس کرتے ہوئے مخاطب نے کہا، "بھئی ڈاکٹر صاحب بھی تو بادشاہ ہی ہیں"۔

ایک دن بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ "چلیے بھئی ہم آپ کو اپنی دوسری بیگم سے ملواتے ہیں"۔ لیجیے صاحب گھر پہنچ گئے۔ اب جو چھوٹی بیگم پر نظر پڑی تو فضا میں خوشی سے قلقاریاں سی گونجیں۔ چیخیں پڑیں کہ وہ تو میری کالج فیلو ہی نہیں انگریزی اور ہسٹری میں کلاس فیلو بھی نکلیں۔ ڈاکٹر صاحب کھڑے ہنس رہے ہیں اور ہماری چیخیاں ختم ہونے میں نہیں آ رہی ہیں۔

گیارہ بجے ان کا ٹی ٹائم ہوتا۔ وہ اکیلے چائے پینے کے عادی نہ تھے۔ اگر ان سے ملنے والے خصوصی مہمان نہ ہوتے تو پھر حاضری کا بلاوا ہمیں آ جاتا۔ اخلاق احمد دہلوی، محسن فارانی، یزدانی جالندھری، آباد شاہ پوری کے ساتھ میں بھی حاضر ہو جاتی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک مسحور کن مہک آپ کا استقبال کرتی۔ سائڈ ٹیبل پر دھری بڑی سی ٹرے میں نفاست سے سجے کپ، چیچ بسکٹ اور ٹی کوزی سے ڈھکی چائے دانی اور کمرے میں گردش کرتی خوشبو مجھے کچھ یاد دلاتی۔

بڑے ماموں یاد آتے۔ ان کا گلتی نوکر اور چائے کی پیش کش کا یہی ارسٹوکریٹک انداز۔ بڑی بھابی چائے بنانے کی ماہر۔ ہم تو لطف اٹھانے والوں میں سے تھے۔ سو وہ کپ آب حیات کی طرح پیتے۔ آدھ پون گھنٹہ ان سے گپ شپ کرتے۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ ان کے فکر و عمل پر وہی سوچ غالب تھی۔ کاروان علم فاؤنڈیشن کا قیام اور اس کے لیے ان کی حد درجہ مخلصانہ کاوشیں یقیناً ان کے ایسے ہی احساسات کی ترجمان تھیں۔ کتنے دیے روشن کیے کوئی حساب نہیں۔ اپنے کارکنوں کے ساتھ حسن سلوک کی تو میں خود گواہ ہوں۔

ملک کے نامور صحافی ہارون الرشید بھی کچھ عرصہ "زندگی" سے منسلک رہے۔ ایک بار گھر میں سفیدیاں ہو رہی تھیں۔ بہت دنوں بعد دفتر گئی۔ ہارون صاحب بڑے جز بز سے تھے۔ "اتنی چھٹیاں"۔ پوچھا گیا۔ وجہ بتائی۔ بولے "تو سفیدیاں کام کرنے سے روکتی ہیں"۔ "جی یہ تو ذرا آج جا کر بیگم سے پوچھیے"۔ اب ڈاکٹر صاحب کے پاس کھڑی بول رہی ہوں۔ "یہ کس کو آپ نے میرے سر پر لا بٹھایا ہے۔ اب یہ میری تنخواہ کٹوائے گا"۔

اور وہ مہربان سا شخص میرے غصے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "نہیں کٹے گی بھئی نہیں کٹے گی۔ پر تم بھی کسی نظم و ضبط میں تو آؤ۔ اتنے دن سے غائب ہو"۔ "تو کیا؟ کام تو دے کر گئی تھی"۔

زندگی کے ساتھ اردو ڈائجسٹ کے لیے اکثر

افسانہ لکھنا کسی سماجی یا معاشرتی مسئلے پر سروے کرنا یا کسی خصوصی نوعیت کا کوئی مضمون تحریر کرنے کو بھی اکثر کہہ دیا جاتا جس کی ادائیگی الگ سے ہوتی تھی۔ یہ طے شدہ فارمولے کے تحت فی صفحہ والے حساب کتاب کے کھاتے میں جاتا تھا۔ جو بل بنتا میں اکثر اس سے مطمئن نہ ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ جاتی۔ غصے سے بولتی۔ مضمون دیکھا ہے آپ نے۔ بل ٹھیک نہیں بنا۔ وہ مسکراتے اور کہتے تو بھئی ٹھیک کروا دیتے ہیں اور بل اکثر میری منشاء کے مطابق بن جاتا۔

یادوں کی گزرگاہ پر ان کی ذات سے وابستہ بہت سے روشن چراغ راستہ دکھاتے ہیں۔ ''تنہا'' مشرقی پاکستان پر لکھے جانے والے ناول کا چھپنا عذاب بن گیا تھا۔ سنگ میل مجھے ان دنوں چھاپتا تھا یکسر انکاری ہوا کہ انہیں جیل نہیں جانا۔ فیروز سنز کو اس پر بہت سے اعتراض تھے وہ کتاب کے حساس حصوں کا یکسر کٹاؤ چاہتا تھا۔ جس کے لیے میں تیار نہ تھی۔ خون جگر سے لکھی ہوئی کتاب کا فیصلہ تو قاری کو نہیں پڑھانا تھا مجھے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب سے کتاب چھاپنے کی درخواست کی۔ کتاب چھاپ دی۔ شاندار تعارفی تقریب بھی اپنے خرچ پر فلیٹیز میں منعقد کروا کر خالص ادبی دنیا میں میرا داخلہ کروا دیا کہ میرے ملک کے نامور ادیب ڈاکٹر رشید امجد کا یہ جملہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔

''تنہا'' ہی سلمیٰ اعوان کو اردو ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

یہ تہذیب و شائستگی، شرافت و نجابت، رکھ رکھاؤ والا وضع دار گھرانا ہے۔ جہاں کارکن فیملی ممبرز کی طرح سمجھے جاتے تھے۔ اور آج بھی ہیں۔ پیچھے لوٹ کر دیکھتی ہوں تو راہداری میں گورے چٹے سانولے سلونے پیارے پیارے بچے چھٹی کے وقت گزرتے یاد آتے ہیں جو اس وقت میرے بچوں کی عمروں جتنے ہی تھے۔ طیب، زکی، محسن، علی، کامران آج بھی یادوں میں جھانکتے ہیں۔ اس وقت یہ کاروباری اور طب کی دنیا کے بڑے نام بن چکے ہیں۔ جتنے بڑے ہیں اتنے ہی مؤدب اور بیٹے ہیں۔

نظریاتی طور پر آپ ان سے کتنا بھی اختلاف کریں۔ مارشلاؤں سے تعاون کرنے اور فائدے اٹھانے کا الزام لگائیں۔ مگر یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ انھوں نے صحافت کو نیا رنگ، نیا حسن دیا۔ ان کے ہاں فکری طور پر ایک نسل کی تربیت ہوئی جو پاکستانی صحافت کے افق پر چمکتے دن کی طرح طلوع ہوئی اور ابھی بھی چمک دمک رہی ہے۔ صحافتی زندگی کے پھولوں کے ساتھ اس راہ کے کانٹے بھی انھوں نے چنے۔ دونوں بھائیوں نے جیل کی سختیاں بھی جھیلیں۔ مزے کی بات مخالفوں کے ہاتھوں سے بھی اور ان کے ہاتھوں سے بھی جن سے تعاون کا الزام تھا ان پر۔

☆☆☆☆☆

خاور اعجاز کا ہائیکو مجموعہ ''زرد پتّوں پر شبنم''

جاپانی صنفِ سخن ہائیکو نے جتنی مختصر مدت میں اُردو ادب میں اپنی جگہ بنائی ہے وہ اِس صنف کی اُردو زبان اور اُردو دانوں کے مزاج سے ہم آہنگی کی روشن دلیل ہے۔ جہاں تک اِس صنف کے مزاج کا تعلق ہے یعنی حوالۂ فطرت اور ناتمامیت، اِس سے کسی کو اختلاف نہیں کیونکہ فطرت سے اکتساب مسرت فطری امر ہے اور اُن کی بات کو ادب میں خاص اہمیت حاصل ہے البتہ ہیئت کے حوالے سے اُردو کے ہائیکو شعرا دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ جاپان میں عہد بہ عہد سفر کرتے ہُوئے اب یہ صنف تین مصرعوں اور سترہ اصوات کی ہیئت رکھتی ہے، اِس ترتیب سے کہ پہلا اور تیسرا مصرع پانچ پانچ اور دُوسرا مصرع سات اصوات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اُردو کی بحریں چونکہ مفرد نہیں ہیں اِس لیے اُردو میں جاپانی اصوات کی پابندی ممکن نہیں البتہ کچھ لوگوں نے فعلن فعلن فع کو پانچ اصوات کے برابر قرار دیا ہے۔ کراچی کے اکثر شعرا نے ہیئت کی اِس پابندی کو قبول کر لیا ہے مگر کراچی سے باہر کے شعرا نے بالعموم مساوی الاوزان ہائیکو تخلیق کیے ہیں گویا

بشیر سیفی

انھوں نے ہائیکو کے مزاج کو تو مدِ نظر رکھا لیکن ہیئت کی قید گوارا نہ کی چنانچہ یوں ہائیکو کے دو مکاتبِ فکر وجود میں آ گئے ہیں۔ خاور اعجاز کا تعلق موخر الذکر ہائیکو نگار شعراً سے ہے اور مَیں بھی ذاتی طور پر اس بات کے حق میں ہوں کہ اُردو میں ہائیکو کے مزاج کو تو گرفت میں لینے کی کوشش کی جائے جو فطرت کے حوالے سے کسی جذبے، سوچ یا کیفیت کے علامتی شعری اظہار سے عبارت ہے مگر ہیئت کی پابندی کو لازمی قرار نہ دیا جائے تاکہ ہیئت کے سانچے میں قید ہو کر رباعی کی طرح ہائیکو بھی محض ایک ذہنی ورزش بن کر نہ رہ جائے سو مناسب یہی ہے کہ اس تجربے کو کھلی فضا میں آزادانہ پھلنے پھولنے دیا جائے۔

''زرد پتوں پر شبنم'' خاور اعجاز کا پہلا ہائیکو مجموعہ ہے۔ وہ نئی نسل کے شعراً میں اپنا مقام بنا چکا ہے۔ اُس کی شاعری کا ایک اہم عنصر مذہبی حوالہ ہے جس کی طرف میں اپنے ایک مضمون (''آنکھیں، رنگ اور خواب'' مطبوعہ ''اوراق'' لاہور) میں تفصیل سے اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔ ہائیکو میں بھی اُس کی سوچ کا یہ رُخ خاصا نمایاں ہے جو اُس کی شعری شخصیت کی اکائی کا آئینہ دار ہے:

مجھ میں سب رنگ آسمانی ہیں
اور خوشبو ہے شاخِ طوبیٰ کی
مَیں کھلا ہوں حرا کے موسم میں

....

گزر چکے ہیں ہزار موسم
مگر وہ ہجرت کا ایک لمحہ
مثال بن کر ٹھہر گیا ہے

....

کہہ رہا تھا فرات وقت سے جو
بیعتِ تیرگی نہیں ہو گی
کیا ستارہ تھا خیمۂ شب میں

....

یہ ہائیکو اس حقیقت کے بھی مظہر ہیں کہ اُردو ہائیکو جاپانی ہائیکو کا چربہ نہیں بل کہ اپنی مٹی کی بو باس اور عقائد کے شعری اور فنی اظہار کے باعث منفرد رنگ اور ذائقہ رکھتے ہیں اور یہ بات متقاضائے فطرت کے عین مطابق ہے کیونکہ کسی بھی صنف ادب کی ہیئت محض ایک تکنیکی چوکھٹا نہیں بل کہ فنکار کے عقائد و محسوسات کی تصویر بھی ہوتی ہے۔ خود جاپانی ہائیکو پر بھی بدھ مت کی تعلیمات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے چنانچہ اُردو ہائیکو میں بھی

اسلامی تعلیمات اور فکر کا پرتو بدیہی امر ہے:

جب مری زندگی کی شام آئے
کچھ بھی لکھا نہ ہو جبیں پہ مری
بس ترے نام کا ستارا ہو

....

شاعری میں تمثال کاری کی سحر آفرینی مسلّم ہے۔ اگرچہ سادہ بیانی بھی دامنِ توجہ کھینچتی ہے لیکن تمثال کی مدد سے جو تصویر بنتی ہے وہ تادیر ذہن پر مرتسم رہتی ہے۔ خاور اعجاز تمثال کاری کی اہمیت سے بخوبی واقف ہے اور اپنی شاعری کو اکثر تمثالوں سے پُراثر بناتا ہے۔ اُس کی تمثالوں میں جدت اور تازگی بھی ہے اور معنی آفرینی بھی۔ وہ صرف محسوس اشیا ہی کو مصور نہیں کرتا بلکہ احساسات و کیفیات کو بھی پیکر عطا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے:

اور تو کچھ نہیں ہُوا ہو گا
ہاتھ سورج کا تھام لینے میں
شام کے ہونٹ جل گئے ہوں گے

....

خاور اعجاز کی یہ خوبی بھی قابلِ ذکر ہے کہ اُس نے خود کو کسی خاص موضوع تک محدود نہیں کیا بلکہ زندگی کے مختلف مظاہر اور رویّوں کو اپنے ہائیکو میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اُس کے ہائیکو میں رومان کی دھوپ چھاؤں بھی ہے اور فلسفیانہ ژرف نگاہی بھی، سیاسی و سماجی مسائل کا پرتو بھی اور اخلاقی اقدار کی ترجمانی بھی اور چونکہ اُس کے خیالات میں کوئی الجھاؤ نہیں اس لیے اُسے اپنے احساسات کی ترسیل میں بھی کامیابی ہو جاتی ہے:

چیونٹیاں چل رہی ہیں زیرِ زمیں
اور کبوتر فضاؤں میں رقصاں
درمیاں اِک ہجوم لوگوں کا

....

دھوپ چمکی ہَوا کا زور رہا
کُھل کے ہوتی رہی ہے بارش بھی
جھونپڑے میں مگر وہی منظر

....

اُردو میں ہائیکو ایک نیا شعری تجربہ ہے اس لیے بہت سے نئے لکھنے والے بھی ہائیکو کی تخلیق میں سرگرم ہیں مگر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر ہائیکو کے مزاج سے آشنا نہیں تاہم خاور اعجاز کے ہاں یہ صورتِ حال نہیں ہے۔ وہ ہائیکو کے مزاج کو سمجھتا ہے چنانچہ اُس کے ہائیکو میں فنی رچاؤ بھی ہے اور موضوعاتی گہرائی و گیرائی بھی اور اُردو میں ہائیکو کو معتبر بنانے والوں میں اُس کا نام نمایاں ہے۔

☆☆☆☆☆

اردو افسانے کی نئی آواز: زویا حسن

زویا حسن نے اردو افسانے سے بطور راوی جو اپنی گہری جڑت ظاہر کی ہے تو یہ Passion کا معاملہ ٹھہرے گا۔ اس لیے کہ انھوں نے معروض کے پیش کار سماج اور بطون کی تہوں میں مخفی فرد کو دیکھنے کے لیے افسانہ نگار کی آنکھ پر تمام تر انحصار ضروری سمجھا۔ اب یہ صورت حال ایسی سادہ نہیں کہ کہانی نویسی کا ہنر اور ذرائع سے بھی سیکھا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں نان فکشن اور فکشن کو مساوی گمان کرنے کا آموختہ ازبر کراتے رہنے کا رواج بھی اکثر مستعد ملے گا۔ یہی باعث، کہ مذکور صنف وافر مقدار سے بے توقیر ہوئے جا رہی ہے۔ ضخیم ناولیں ہوں یا ڈائجسٹ میں چھپنے والی کہانیاں؛ پاپولر افسانی ادب کی ایک یورش ہے کہ خواندہ کو ہراساں کرنے پہ تلی بیٹھی ملے گی۔ اس پر مستزاد ٹی وی ڈرامے، ذوق کو پستی سے ہمکنار کرنے میں مثال نہیں رکھتے۔

مانا کہ فکشن اور نان فکشن کے بیچ خط امتیاز اضافی قرار پائے گا لیکن فکشن رائٹر اپنے ذہن میں نان فکشن کا جو بھی معیار مقرر کرے، اس کا فکشن اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے خود کو پھر لازماً علاحدہ ثابت کرے۔ یہاں چونکہ اسی کی اندرونی گواہی موثر ہوگی اس لیے وہ خود ہی کو جواب دہ ہوگا۔

زویا حسن کے افسانوں کی خواندگی نے یہ واضح شہادت فراہم کی ہے کہ وہ عبارت کی ترقیم سے لے کر بنت کاری کی تکنیک تک اپنے افسانی متن کو دیگر نثری اصناف سے ممتاز کرنے کی کلا سے آگاہ ہیں۔ وجہ اس کی ظاہر و باہر کہ وہ کسی ایسے داخلی و خارجی مظہر پہ بالعموم رکنا پسند نہیں کرتیں جس کے جوہر کو افسانیت میں جذب ہونے کی توفیق میسر نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرز احساس کے کارن زندگی کا وسیع مواد اصولی طور پر از خود مسترد ہو جاتا ہے۔ باقی جو محدود سا بچے گا بس وہی افسانہ نگار کے کام کا ثابت ہوگا۔ زویا حسن نے اسی لیے زیست کے کرب کو فوقیت دی کیونکہ طرب کی غیر سنجیدگی کا دیکھتے ہی دیکھتے تحلیل ہو جانا انوکھا واقعہ نہیں۔ یہ الم ہے جسے دوام حاصل ہوا؛ یہ دکھ ہے جو تسلسل کا ضامن بنا؛ لیکن رنج و اندوہ سے لمحاتی رفاقت کے لیے بھی مضبوط اعصاب درکار ہوتے ہیں۔ زویا کی ذاتی زندگی سے بالکل واقفیت نہیں

جمیل احمد عدیل

لیکن ان کے افسانے پڑھ کر کافی حد تک تعین ہونے لگتی ہے کہ انھیں حزن کی ماہیتوں کا محض ادراک ہی نہیں غم کے ساتھ سنگت جانے کا ملکہ بھی مہیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے افسانوں: بول میری مچھلی کتنا پانی، اسٹاپ! گمشدہ آوازوں کا تعاقب، کھڑکی میں اگا وجود، اضافی کردار حاضر ہوں ___ کی فضا ہو، ماجرے ہوں یا کردار ___ سب اشکوں کی ثروت سے معمور ہیں۔ ایسا نہیں کہ افسانہ نگار رقت سے قاری کا Catharsis کرنے کی شعوری کوشش کو اپنائے ہوئے ہیں بل کہ وہ حیات کی اطراف میں محن کی کارفرمائی سے آشنا ہیں۔ اسی لیے ابتدا میں عرض کیا گیا تھا کہ زویا کی مردم چشم واقعتاً ایک افسانہ نگار کی پتلی ہے۔ یا سے ہی سچ تسلیم کرتی ہے؛ جسے تخلیق کار کا سچ کہتے ہیں: متداول سچ سے الگ اپنا حرم تعمیر کرنے والا؛ اس تمنا سے بے نیاز کہ کوئی طواف کرتا ہے یا نہیں کرتا۔

اس تناظر میں ان کے کردار شاہد ناطق ہیں۔ جی ہاں! بالعموم وہ ودیعتی مرکزیت کے رعب سے تہی ملیں گے۔ ان کے کسی عمل سے محوری نسبت کا غرہ ظاہر نہیں ہوتا۔ وہ تو یکسر عام سے لوگ ہیں۔ زندگی کا زہر جرعہ جرعہ پیے جا رہے ہیں، جیے جا رہے ہیں۔ یہ زخم خوردہ مانس انھیں جیون کے حاشیے میں پڑے ملے، اپنی آفت بھری داستانوں سمیت۔ افسانہ نگار کی ہمدرد پلکوں نے جھک کر انھیں خود چنا اور ان کی تعذیب کو افسانہ کر دیا، سچ کی سرفراز سطح کے ساتھ۔ یہاں محبت / توجہ سے محروم Shadow Illness میں مبتلا ستم رسیدہ عورت بھی ملے گی؛ یہاں چارہ گری کے لیے سسکتا نادار وجود بھی نظر آئے گا؛ تشنہ خوابی میں مبتلا دلگیر مصور سے بھی آمنا سامنا ہو گا جس کے ملال کی شدت کو شاید کینوس اور رنگ ظاہر کرنے سے قاصر رہیں۔ زویا زیست کے ان زوایا کی پیش کنندہ ہیں جنھیں اپنی رگوں میں درد کی گردش عزیز رہی۔

زویا حسن کے افسانوں کا خاص پہلو علمی کتابی پیرائے سے فاصلہ ہے۔ وگرنہ بعض جہاندیدہ افسانہ نویسوں کے ہاں سٹیفن ہاکنگ کی کتاب کا ورق لخت ہو کر فکشن کا صفحہ بنا ہوا دستیاب ہے۔ ایک اشارے پر گوگل ڈیٹا کا انبار لگا دیتا ہے، یوں معلومات کے اس خزینے پر فکشن کی چیپی لگا کر دانشوری کی دھاک بٹھانے کی عیاری خوب سیکھ لی گئی ہے۔ اے آئی کے مخزن سے مستفیض ہوئے بغیر اپنے تخلیقی اضطراب کو امام کیے رکھنا، بلاشبہ اس نامیاتی فلیور سے سرشار ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اپنی دھن میں محو ہو کر لکھنے والی زویا کو آرائشی اسلوب نہیں بھایا، یوں کہ وہ کسی آن جان گئی ہوں گی، صداقت کسی نظریے میں نہیں بلکہ بپتی میں مخفی ہے اور وہ بپتی بھلے ہی کسی عقیدے کی ترجمان نہ بنے مگر اس کی نفی کرنا ایسا سہل نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں ان کہانیوں میں کسی مشاق افسانہ نگار کے مروج / آزمودہ کرتب اور شعبدے نہ بھی

ملیں تو کیا ہے۔ ان سطور کے بین السطور وہ کلفت بھری زندگی کا سچ ضرور متکلم ملے گا جسے سہہ جانا آسان نہیں۔ یہی ان افسانوں کا مابہ الامتیاز کہیے۔

یہاں ذرا سا ٹھہر کر زویا حسن کے افسانے: 'ایک اور کلاون اسٹیج سے اتر آیا ہے' کے متعلق دو ایک سرسری سی باتیں کرنی ہیں۔ اس افسانے کا سرفراز موضوع محتاط 'سلائی' کا متقاضی تھا۔ مصنفہ نے شروع سے آخر تک بلاشبہ کہانی کے سُر کو قائم رکھا ہے وگرنہ انقلاب کی جوشیلی رگیں آرٹ کے مطالبات کو کہاں خاطر میں لاتی ہیں! اسے عام فہم حقیقت ہی جانیے کہ دباؤ کے تغیر سے نقطۂ کھولاؤ (Boiling Point) میں نمایاں تبدیلی مشاہدے کا حصہ بنے گی۔ سماجی معاشی ناانصافی فکشن کا مضمون بنتے ہی اکثر ابال پر آمادہ دکھائی دیتی ہے کہ اس مقام پر Supressed Anger کو نکاس کا وسیلہ مہیا ہونا ایسا بعید نہیں۔ بعض افسانہ نگاروں کے تحت الشعور میں اپنے قارئین کا تزکیہ بھی مقصود بن بیٹھتا ہے کہ معروض میں بدلاؤ آئے یا نہ آئے، تحریر وسیع پسندیدگی اپنے ہاتھ سے نہ جانے دے ــــ یہ محرک قابلِ مذمت نہیں مگر یہ راستا پاپولر لٹریچر کو منزل بنا لے تو قرۃ العین حیدر کے 'آخرِ شب کے ہمسفر' ایسا شاہکار تخلیق نہیں ہو پاتا۔ اس ناول میں بھی 'انقلاب' اپنے رومان کے جملہ زاویوں کو محیط ملے گا مگر کہیں نعرے/نظریے نے فن کے کناروں سے تجاوز کی جسارت نہیں کی۔

متذکرہ افسانے میں ضبط کی مہار کا زویا حسن کے ہاتھ میں رہنا، وہ ممیز پہلو ہے جو ایک طرف ان کی فکری تربیت پر شاہد قرار پائے گا تو دوسری جانب ہوش کی بیداری پر ان کے مجاہدے کی دلیل بنے گا۔ اس جہت کی معنویت پر اصرار غالباً اس باعث ہے کہ نگاہِ بے ادب کا عینِ وصال میں بھی بہانہ جو رہنا ایک آرٹسٹ کے حواس کا اساسی اقتضا ہے وگرنہ دھرم، ثقافت، زبان، نسلی عصبیت؛ خطے کی مزعومہ تقدیس --- ایک سے بڑھ کر ایک منہ زور ریلا موجود! ادب میں 'میجسٹی' نہیں چلتی، یہاں 'بیوٹی' کا فسوں سدا موثر ثابت ہوتا رہا۔ 'جلالی موضوع' ممنوع نہیں، سورج آئینے کی Dark Coated سطح میں اتارا جا سکتا ہے۔

زویا نے انقلاب کے دف کو محبت سے مارنے کا کامیاب تجربہ کیا۔ افسانے میں دو سچائیوں کو آمیخت نہیں جذب کرنے میں وہ اپنی ریاضت بروئے کار لائی ہیں۔ ایک خواندہ کے طور پر ان اکائیوں کو علاحدہ علاحدہ دیکھنے کی کاوش کے باوجود راقم فتح یاب نہیں ہوا۔ سچ یہ ہے پڑھت کے دوران ایس ٹی کولرج کی اصطلاح Esemplastic نے رہبری کی۔ متخالف عناصر کے لیے Unified Whole کو بطور مظہر اس طرح چن لینا

کہ متخیلہ کا اثبات گریز پا نہ ہونے دے ___ بلاشبہ یہ شگفتی کے بنا ممکن نہیں۔ تخلیقی قوت اسی کا دوسرا نام ہے ___ اس افسانے پر بلاوجہ بات کرنے کو جی نہیں چاہا۔ یہاں 'انضمام' کی ایک سے زاید جھلکیاں قاری کو متوجہ ہی نہیں متاثر کرتی ہیں۔

یوں اس خیال کو بار دگر تقویت ملی کہ شبدوں/فقروں کی آڑی ترچھی قطع برید سے ارتجاط کا چٹخارہ دکھانا، مصنوعی اطراف کو ابھارنا نری پری کاریگری ہے۔ زویا نے Synthecticity سے واضح فاصلہ اپنایا کہ ان کے رنج اپنی اصلی لو دینے میں خود کفیل ہیں۔ متعارض ابعاد کو پیہم تفحص کی مدد سے طرز احساس کی وحدت میں گوندھنا، اسے یکسر مختلف سعی کہنا پڑے گا۔

زویا حسن نے آورش کے پاسبان مرد کردار کو جہد کے مدار میں برابر فعال دکھایا لیکن اس کے وجود کو انسانی منطقے کی نفی کا مرتکب نہیں ہونے دیا۔ ورنہ لوگوں سے جن اشخاص کی پوجا کرائی گئی، شعوری کوشش کے ساتھ ان کے بتوں میں سے پہلے 'فاضل مواد' نکالا، پھر اس کی جگہ ماورائیت کو بھرا، یوں وہ پرستش کے قابل ٹھہرے۔ یہ سب آسان نہیں تھا، دو دو تین تین صدیاں اس عمل پر صرف ہوئی ہیں۔

مرد نے عورت کی کوکھ سے جنم لیا، مرد کو دیکھنے کا پہلا حق بھی عورت کی آنکھ کو حاصل ہونا چاہیے۔ ایک انقلابی کو پیش کرتی ہوئی یہ ساری کہانی بھی اصولی طور پر عورت کی پتلی میں سمٹی ہوئی ہے، یہی اس کا اختصاص ٹھہرا:

تو تمھیں پرانے انقلاب کی کہانیاں سننی ہیں؟ ان انقلابیوں کی محبوباؤں کی تاریخ کے اصل حوالے تمھیں ان کہانیوں سے ہی ملیں گے -- آؤ میرے پاس، میں تمھیں انقلابیوں کی محبوباؤں کی زبانی انقلاب کی ان کہی کہانیاں سناتی ہوں۔

یہ تعبیر ناگریز ہوگی کہ یہاں عورت/واحد متکلم محض راوی نہیں بل کہ انقلابی کا قلب ہے۔ اسی دل کے آئینے میں دید ہی تو افسانے کا اصل مطلوب متعین ہوا:

میرے لیے وہ حزن کا ایسا سُر تھا، جس میں میرا لاشعور سر دھنتا تھا۔

یہیں سے دونوں کردار الگ الگ تشخص کے باوصف ایک وحدت کے پیش کار ہونے کا کرشمہ دکھاتے ہیں۔ یہ شاید کافی لطیف نکتہ ثابت ہو کہ جری مرد کے لیے یہ ایثار ممکن نہ تھا۔ یہ عورت/محبوبہ کا حوصلہ ہے کہ وہ ہر آن محبوب کے سنگ سنگ ہونے کے باوجود خود کو بلند تو کیا برابر کی سطح پر بھی نہیں لاتی:

میں خاص ہونے سے ڈرتی تھی۔ خاص ہونے کے لیے فطرت بہت سی عام چیزوں کی قربانی مانگ لیتی ہے، تو میں ڈرتی تھی۔

خود کو خوف زدہ قرار دے کر دوسروں کی بہادری کو ابھارنے والی سے زیادہ باہمت کون ممکن! اب زیرک قاری کے لیے توانائی کے مصدر کو نشان زد کرنا شاید دشوار نہ رہا ہو۔ عقبی قوتوں کی کارفرمائی نظر آنے لگے تو تعینات نئے مراحل میں داخل

ہونے لگتے ہیں۔ عام نگاہیں سورماؤں کو قائم بالذات وجود دیکھتی/سمجھتی آئی ہیں۔ اس افسانے کے بین السطور یہ صدق میسر آئے گا کہ بنانے والا اور پیش کرنے والا اگر خود کو منہا کر لیں تو جو Grandiosity مرعوب کر رہی ہے آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے، تحلیل ہو جائے۔

ایسا نہیں کہ یہ سب التباس کا مظہر سمجھا جائے۔ شخصی عظمت حقیقت میں ایگزسٹ کرتی ہے۔ سربرآوردہ، قیادت کے گنوں کا مالک بھی ہوتا ہے؛ جیسا کہ افسانے میں راہب کے اوصاف فریب نظر نہیں؛ کہیں کوئی ملمع کاری نہیں؛ وہ خود منور ہے اور دانش کا نور دان بھی کرتا ہے:

یاد رکھو زندگی کے ہر ہر دور میں اگر تم الگ طرح سے مارے جاتے ہو تو، الگ طرح سے پیدا بھی ہوتے ہو۔ ماضی کی غلطیوں کو بھول کر تمھیں حال کے مسائل پر یکجا ہونا ہے۔

یہ حال مست واقعیت کو یوں بلا واسطہ بیان کرتا ہے کہ کچھ دیر کے بعد قاری کو یوں محسوس ہونے لگے گا کہ ان بیانیوں میں عمیق رموز موثر ہیں۔ یہ سچ اتنا بھی براہ راست نہیں۔ وہ قضیے جو دراصل انسانی المیے ہیں، انھیں واشگاف ادا کر دینا زماں کے پیہم ستم کی طرف گویا گہرا اشارا ہے۔ سیاسی عمل میں مخفی واردات ہوں یا مذہبی تعبیروں میں حقائق کو محجوب کیا گیا ہو، انھیں ہٹا کر منظر نامہ سامنے لانا وقت کی روایتی تقسیم کو مسترد کرنے کے مترادف قرار پائے گا۔

اس دلیر کی آواز میں سرمدی حال متکلم ہے۔ یوں یہ نادر درک بھی خوانندہ کے شعور میں چپکے سے منتقل ہو رہا ہے کہ جبر ایک متوازی تفاعل ہے۔

اس افسانے میں جبر کا بھی استمرار عصری حسیت کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہوا ملے گا۔ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے اب بھی تخویف و تحریص کے نشانے پر ہیں کہ کائیاں مقتدرین اپنی مچانوں میں مستعد ہیں۔ افسانہ نگار نے خالص Object کو ایک بار پھر باطن کے جہان سے جوڑ کر ترفع اور توسیع سے ہمکنار کر دیا ہے کہ انقلاب توڑ پھوڑ/ ہنگامے کا عنوان نہیں۔ یہاں قلب کی تبدیلی ہی دور رس نتائج پیدا کر سکتی ہے اور انقلابی کا قلب کون ہے؟ اعادے کی ضرورت نہیں کہ یہی اس افسانے کا نقطۂ ماسکہ ٹھہرا:

انسان جس قدر اپنے اندرون کا سفر طے کرتا ہے نا چندر مکھی اس کا قد بیرون کی طرف اتنا ہی بڑھتا چلا جاتا ہے--- اپنے اندر کا سفر کبھی منقطع مت کرنا۔

نشان خاطر رہے اس سرفروش کے زریں الفاظ ہم تک پہنچانے والی اس کی پسندیدہ عورت ہے۔ جسے سنگت کا اعزاز عہد طفولیت سے حاصل ہے، یعنی اس انقلابی کو بچپن ہی سے محبت کے سائے میں نشوونما کے اسباب میسر آئے۔ جہاں اس کے جذبات بے قابو ہوئے، وہاں قدرت کی بہترین تخلیق عورت نے توازن بدوش

ہونے/رہنے کا آموختہ یاد دلا دیا۔ جہاں اس کے قدموں میں بے ہمتی ظاہر ہوئی، نئے عزم سے ہمکنار کر دیا گیا۔ رفاقت کی یہ ساری مسافت افسانے کا جذباتی ہی نہیں فکری حسن بھی ہے کہ وہ محبوبہ ریگولیٹری اتھارٹی نہیں، روحِ یگانگت کی امین ہے۔

باقی یہ تاریخ کا معلوم زمرہ ہے کہ انقلابیوں کے سپنے شکستگی سے دوچار ہوئے اور کبھی خود انقلاب کے داعی بھی بدل گئے۔ ان کے داعیات انحراف کے مظہر ہو گئے۔ شاید ہر انقلاب کی تعبیر خواب ہے۔ لا انتہائی خواب۔ استقامت کے سفر کو رائیگانی کی ہمسفری سے مامون رہنے کی ضمانت کون فراہم کرے گا؟ یہی استفہام: 'ایک اور کلاؤن سٹیج سے اتر آیا ہے' کا انجام بنا:

اور تبھی ایک ان ہونی ہوئی تھی۔ شاید وہ ہی ہوا تھا جو ہوتا آیا تھا۔ انقلاب آ گیا اور پھر انقلاب کے بعد بھی وہ ہی ہوا جو پوسٹ ریولیوشنز ہوتا آیا ہے۔ جیالوں نے لال جھنڈوں میں اپنے لیڈران کو لپیٹ لپیٹ کر دفنا دیا۔ وہ انھیں بس تقریروں کے لیے پسند تھے ____ ہاہاہا، انقلابیوں کے لیڈران یوں ہی پرچموں میں لپیٹ دیے جاتے ہیں، پھر ایک نئے انقلاب کے لیے اسٹیج تیار کرنے تک کرسی کی دھینگا مشتی ہوتی ہے۔ اسٹیبلشمنٹ سبز جھنڈے لہراتی رہی اور ____

زیست کی دھڑکتی نبض سے معمور یہ کہانی اس افسوس ناک مآل کی تقدیر سامنے لاتی ہے کہ انقلاب اور انتظار لازم و ملزوم ہیں ____ غیور اور عازم بھی آئیں گے لیکن انھیں تاریک راہوں میں مار دیا جائے گا اور انھی کی میراث کے مدعی شریکِ اقتدار ہو کر دل میں مسرور اور زبان سے نعرہ زن رہیں گے۔ جی ہاں! وسیع تر قومی مفاد کا یہی تقاضا رہا کہ اپنے ہی آبا کے قاتلوں سے مل کر Coalition Government بنائی جائے تاکہ تخت میں شراکت بھی برقرار رہے اور تختے پر چڑھانے والوں کی مذمت سے غفلت بھی سرزد نہ ہو۔ کم از کم اس لوکیل میں سیاست اسی 'Post Truth' کی علمبردار ملے گی!!

آخر میں صرف یہ کہنا ہے کہ زویا نے سوچ سمجھ کر اپنی 'ڈومین' کے اندر رہ کر لکھا ہے یعنی اجنبی دنیائیں ان کا چناؤ نہیں بنیں۔ ممکن ہے انھوں نے دوستوفیسکی سے رہنمائی لی ہو: ''اگر آدمی یہ طے کرے کہ ہر بات کو بیان کر کے رہوں گا تو چاہیے کہ وہ ہر بات کو جانتا بھی ہو، اس سے خوب واقف بھی ہو۔'' یہ اصول اپنی جگہ مسلم! اور زویا کا جہان راقم کی نظر میں قابلِ رشک قرار پائے گا کہ اس لڑکی نے جو تخلیق کیا، وہ اپنی جزئیات تک خوب دیکھا بھالا ہے بلکہ ایک حد تک برتا ہوا۔ بلاشبہ وہ سنسار سارے کا سارا اپنے اثر کے ہمراہ اس کے وجود میں ترازو ہے، یوں اس کے ہاں تحریر تاثیر کا بھرپور وصف رکھتی ہے!!

☆☆☆☆☆

''تتلی نگر'' کی باتیں

قلم سے رشتہ تحفہ خداوندی ہے۔ جس نے قلم سے وفا کی، اس نے آخرت سنوار لی۔ قلم کی نوک سے نکلی ہوئی ہر اچھی بات قلم کار کی بخشش کا ذریعہ ہے۔ قلم کی پاس داری کرنے والا کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ الحمدللہ، اس وقت بہت سارے ایسے قلم کار موجود ہیں، جو قلم کا مثبت استعمال کر کے اپنی آخرت اور قوم کا مستقبل سنوار رہے ہیں اور بچوں کے لیے اصلاحی، اخلاقی اور تعمیری کہانیاں تخلیق کر رہے ہیں۔ ان میں ایک معروف لکھاری سلمان یوسف سمیجہ بھی ہیں۔

سلمان یوسف سمیجہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے کم عمری میں ہی بچوں کے لیے کہانیاں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ سلمان یوسف سمیجہ 5 ستمبر 2005 کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے پہلی کہانی ستمبر 2016 میں لکھی، جو ماہنامہ ہمدرد نونہال میں شائع کی گئی۔

ملک بھر کے اخبارات و رسائل میں اکثر ان کی کہانیاں چھپتی رہتی ہیں۔ ان کی کہانیاں بڑی دلچسپ اور سبق آموز ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ بچے ان کی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ سلمان یوسف سمیجہ کی کہانیاں سبق آموز، دلچسپ اور مزاح سے بھرپور ہوتی ہیں۔ ادب اطفال میں ایسی کہانیاں بہت پسند کی جاتی ہیں۔

زیر نظر کتاب ''تتلی نگر'' مصنف کی تیسری کاوش ہے۔ ''تتلی نگر'' میں مزے مزے کی کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ ان میں سے اکثر کہانیاں میں نے مختلف رسائل میں پڑھ رکھی ہیں۔ یقیناً بہت سے بچوں نے بھی پڑھ رکھی ہوں گی۔ جا بجا بکھری ہوئی کہانیوں کو مصنف نے بچوں کی سہولت کے لیے یکجا کر کے ''تتلی نگر'' میں سجا دیا ہے۔ سرورق کہانی ''تتلی نگر'' بہت پُرکشش ہے۔ ''تتلی نگر'' میں پرندوں، جانوروں، حشرات اور درختوں کے کرداروں پر خوب صورت کہانیاں شامل ہیں۔

سلمان یوسف سمیجہ کی پہلی کتاب ''کہانیوں والی چڑیا'' ادب اطفال میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب رہی۔ ان کی دوسری کتاب ''جنگل میں دنگل'' کو بھی بچوں اور بڑوں نے داد و تحسین سے نوازا، اسے ادب اطفال میں خوب سراہا گیا۔

''تتلی نگر'' مصنف کی تیسری کتاب ہے، جس میں بہترین کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ اللہ رب العزت نے اس کتاب کو بھی بہت مقبولیت دی ہے اور کامیابیوں سے ہم کنار کیا ہے۔

میں سلمان یوسف سمیجہ کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے قلم کی روانی کو برقرار رکھے اور وہ ادب اطفال میں اسی طرح اپنے حصے کی شمع روشن رکھیں۔ آمین۔

غلام زادہ نعمان صابری

سورج کو دھندلاتا چراغ ـــــ نبیل قیصر

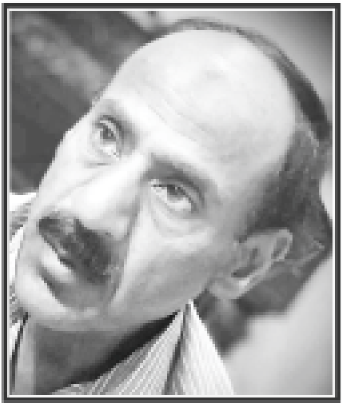

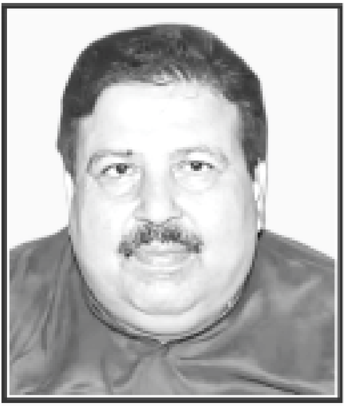

احباب انسانوں کے اپنے پیمانے ہیں مگر انسانیت کے اپنے انسانوں کے پیمانے تو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں مگر انسانیت کے پیمانے مستقل بنیادوں پر ازل سے ابد تک چلتے رہتے ہیں ہماری سماجی زندگی کی اونچ نیچ برج خلیفہ کی کثیر المنزلہ وسیع وعریض عمارت کی سیڑھیوں کی طرح ہے جس سے ہم جیسے دنیا دار اپنے جیسے دنیا داروں کی حیثیت کا تعین کرتے ہیں اور یہی پیمائش کا پیمانہ ان کی عزت کے لیے مخصوص ہے مگر ایک پیمانہ خدائے بزرگ و برتر اور محسن انسانیت نے صدیوں پہلے طے فرما دیا بڑا وہ جو تقویٰ میں بڑا اس پیمانے کی اپنی ترتیب سعودی اور نزولی ہے یعنی ہیڈ آف دی سٹیٹ بھی چھوٹا اور ادنیٰ ہو سکتا ہے اور اپنے فرائض کی بجا آوری ایمان داری سے کرنے والا خاکروب وارڈ بوائے چپراسی بھی اعلیٰ وارفع ہو سکتا ہے

ہم نے پہلے بھی کئی بار عرض کیا ہے کہ ہماری ادبی سماجی زندگی میں محترم احمد جلیل اوکاڑہ میں ریڈار کا درجہ رکھتے ہیں یعنی عملی زندگی کے علاوہ ہمارے میل جول میں آنے والے احباب کی کثیر تعداد جلیل کے توسط سے ہمارے دائرہ شناسائی میں داخل ہوئی جس کے لیے ہم تمام عمران کے ممنون رہیں گے اٹھاسی نواسی ء کی بات ہے ہم ساہیوال روڈ برانچ میں تھے جو جلیل صاحب کے راستے میں پڑتی وہ جاتے ہوئے تو نہیں البتہ واپسی پر ہمیں اکثر عزت بخشتے چائے کی پیالی پر ڈھیروں گپ شپ ہوتی ایک دن انھوں نے غائبانہ طور پر ایک باادب نوجوان سے متعارف

مسعود احمد

کروایا جو ہماری بستی کے نواح میں موجود چک ترپن ٹو ایل سے تعلق رکھتا ہے اور راجپوت راو برادری سے تعلق رکھتا ہے کتابوں کی دکان پر گول چوک بازار میں پرائیویٹ نوکری کرتا ہے نام سلامت اللہ ہے مگر شاعری نبیل قیصر کے نام سے کرتا ہے مصوری خطاطی اور لکڑی پہ تصاویر کندہ کرنے کے علاوہ پنسل سے اسکیچ بھی مہارت سے بناتا ہے اس کے علاوہ انتہائی مؤدب اور فرمابردار بچہ ہے جلیل صاحب کی معلومات کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں ہم کبھی بھی نہیں رہے انھوں نے ادب میں باقاعدہ اپنی انٹیلیجنس کی دھاک بٹھا رکھی تھی انھوں نے اور ان کے سائیکل نے ایک دوسرے کی رفاقت میں اوکاڑہ سے کینٹ تک کا پورا حلقہ ماپا ہوا تھا دوسرا وہ ایک توانا ادبی حلقہ کے کرتا دھرتا کوئی ادبی تخلیقی چوں چراں ان کے علم میں لائے بغیر اوکاڑہ اور اوکاڑہ کینٹ میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھی اور ہم بھی اس حوالے سے قبلہ گاہ کے دست نگر تھے ہم نے بھی کتابوں کاپیوں کے لیے اسی دکان کا رخ شروع کر دیا جہاں راو سلامت اللہ روزی روٹی کشید کرتا تھا پھر ایک دن اس عزیز نے ہمارا بھی اسکیچ بنایا ہماری نذر کیا ہم نے تشکر آمیز لہجے میں اس کا شکریہ ادا کیا پھر ہمارا تبادلہ غلہ منڈی برانچ ہو گیا اب تو یہ برانچ بند ہو چکی ہے مگر تب یہ برانچ غلہ منڈی کے اندر چوہدری اکرام الحق (مرحوم) کی آڑھت کے ساتھ ان کی عمارت میں ہی ہوتی تھی پنجاب یونیورسٹی اور لاہور بورڈ کے اکاؤنٹ بھی وہیں تھے اس لیے وہاں شدید بھیڑ لگی رہتی محاورہ کی رو سے نہیں ہمیں سچ مچ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی صبح سے شام ہو جاتی ساری بینکنگ تب مینویل ہوتی ایک دن شدید بھیڑ میں نوجوان سلامت اللہ ہمارا لکڑی پر کندہ اسکیچ لے کر بینک آیا ایف اے کے داخلوں کی آخری تاریخیں چل رہی تھی برانچ کے اندر باہر بھیڑ ہی بھیڑ تھی اس نے اسکیچ ہمارے سپرد کیا ہم نے شکریہ کے ساتھ رکھ لیا مگر اس بھیڑ میں ہم سے غلطی یہ ہو گئی کہ بطور منیجر ہم شاعر ہونے کے باوجود شاعرانہ احساسات سے عاری ثابت ہوئے سلامت اللہ چلا گیا مگر مجروح انانیت کے ساتھ ہم کام میں جت گئے ایک دو دن بعد جلیل صاحب تشریف لے آئے آتے ہی شدید غصے کے عالم میں بولے تم نے سلامت اللہ کے ساتھ جس بے اعتنائی اور سرد مہری کا رویہ اختیار کیا ہے بطور شاعر تمہیں زیب نہیں دیتا تھا ہم نے صورت حال کی نزاکت اپنی پیشہ ورانہ مجبوریاں گنوائی مگر عدالت جلیلہ ذرا ٹس سے مس نہ ہوئی جلیل صاحب ایک تو اوکاڑہ کے ادبی ڈان دوسرا کینٹ میں ایک تعلیمی ادارے کے سربراہ جن کا سارا دن مینڈکوں اور توپوں کے سایہ میں گذرتا ایک سویلین ان کی ناراضگی کا متحمل کیسے ہو سکتا تھا ٹھنڈے دل سے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ہمیں بھی محسوس ہوا جتنا بھی رش تھا ہمیں اس نوجوان کے لیے کچھ وقت نکال کر ایک کپ چائے کی پیشکش ضرور کرنی چاہیے تھے چنانچہ بینک سے فارغ ہو کر ہم نبیل قیصر کے پاس پہنچے تب یہ اپنے گاؤں میں پوسٹ آفس کی

ایک فرنچائز چلانے لگا تھا معذرت کی اپنی مجبوریاں بیان کیں عرض کیا بھائی میاں بینک میں ہم بھی ایسے مزدور ہیں جیسے آپ اس دکان پر بعض اوقات گھر سے کوئی بہن بھائی آ جائے تو ایسے ہی توجہ کے شاکی ہو جاتے ہیں ہمارا گھر حاضر ہے کبھی چھٹی کے دن تشریف لائیں چائے بھی پئیں گے اور غزل و غزلی بھی ہو لیں گے فنکار عموماً طور پر سلیم الفطرت گداز دل ہوتے ہیں ان کا شیشہ دل اتنا گداز نہیں ہوتا جو دھویا نہ جا سکے پھر جلیل صاحب کے توسط سے ہم ان کی شاعری سے مستفید ہونے لگے۔

نبیل قیصر کی شاعری میں بھی ہمارے سماجی رویوں معاشی معاشرتی ناہمواریوں کھوکھلے پن اور خانگی معاملات پر لطیف طنز ہوتا ہے بسا اوقات وہ اپنے قطعات کے کوزوں میں سمندر بند کر دیتا ہے تبسم کی کلیاں قاری کے لبوں پر بکھر جاتی ہیں جیسا ہم نے بیان کیا ہے کہ نبیل قیصر شاعر کے علاوہ مصور بھی پینسل سے اسکیچ بھی بناتا ہے اور لکڑی میں تصاویر کی کندہ کاری کرتا ہے اس حوالے سے نبیل نے امجد اسلام امجد جعفر شیرازی زاہد فخری ڈاکٹر سعید اقبال سعدی مرزا اسکندر بیگ احمد جلیل راقم اور بہت سارے احباب کے اسکیچ پینسل کے ساتھ اور لکڑی پر بھی بنائے انیس سو اٹھانوے میں نبیل کی شادی ہو گئی مزے کی بات ہے نبیل کی اہلیہ بھی پینسل ورک اور کندہ کاری میں اتنی ہی مشتاق ہیں جتنا نبیل قیصر خود نبیل نے بی اے تو گورنمنٹ کالج اوکاڑہ سے کیا ہوا تھا پروردگار کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے امجد اسلام امجد صاحب کو اس گداز دل شاعر نے نبیل قیصر کو محکمہ ڈاک میں پوسٹ مین بھرتی کروا دیا یوں اس عزیز کی چھوٹی موٹی نوکری کا بندوبست ہو گیا ہماری نوکری بھی اوکاڑہ میں ہی تھی اور کوریئر کمپنیوں سے پہلے ہماری بینکوں کی ڈاک محکمہ ڈاک کے توسط سے آتی اس سبب نبیل قیصر سے ملاقات کے مواقع پیدا ہو جاتے برانچ میں جب جلیل صاحب آتے تو کبھی وہ نبیل کو طلب فرماتے جلیل کے صوتی چراغ رگڑنے کی صورت نبیل قیصر لمحوں میں حاضر ہو جاتا ہماری کبھی کوئی ذاتی ڈاک رسالہ ادبی کتاب کہیں سے آتی تو چھانٹ کر رکھ لیتا اور شام کو گھر پہنچا دیتا کوشش یہی ہوتی کہ باہر سے ہی دے کر چلا جائے الغرض نبیل قیصر نے اپنی سرکاری نوکری کو بھی سماجی خدمت میں ضم کر لیا نبیل کا بنیادی وصف یہی رہا کہ اس نے نوکری کے دنوں میں اپنے طرز عمل سے یہ باور کروایا کہ احباب کو نوازنے کے لیے لوگوں کے کام آنے کے لیے سماجی خدمت کے لیے بڑا افسر ہونا ضروری نہیں آپ جذبہ اور اخلاص سے کسی بھی حیثیت میں بھی خدمت کر سکتے ہیں نبیل قیصر نے دفتر میں بھی اتنی ترقی کی پہلے وہ چک سے ڈاکخانہ پیدل جاتا تھا وہاں سے ڈاک لے کر پورے علاقے میں بانٹتا جب سائیکل کی عیاشی میسر آتی تب تک نبیل کو پوسٹ مین کی حیثیت سے ہی اعزازی طور پر کاؤنٹر پر بٹھا دیا گیا بے شک بی اے پاس تھا مگر تھا تو عامیوں میں ہمارے ہاں عامی ہونا بھی خامیوں میں شمار ہوتا

ہے بے شک اگر بندہ ایمانداری سے نوکری کرے تو یہ بھی عبادت کی ارفع قسم ہے بھلے کسی حیثیت میں بھی ہو۔ اہل اوکاڑہ جانتے ہیں کہ نبیل قیصر نے شدید گرمی ہو سردی ہو بارش ہو دھند ہو اپنی نوکری ہمیشہ دیانت داری اور وقت کی پابندی سے کی بسا اوقات بیماریوں نے بھی آلیا سائیکل کے چھوٹے موٹے حادثے بھی ہوئے مگر سوائے سرکاری چھٹی کے کبھی چھٹی نہیں کی بلکہ بعض اوقات کام کے لوڈ کی وجہ سے سرکاری چھٹی بھی گلیوں محلوں میں ڈاک بانٹتے گزر جاتی ماشاء اللہ پروردگار نے نبیل کے تین بیٹے اور ایک بیٹی دی ہے بیٹی ہماری زندگی میں کس اہمیت کی حامل ہوتی ہے یہ کسی باپ کو بتانے کی ضرورت نہیں پچھلے سال نبیل کی بیٹی کی شادی تھی آفرین اس کی فرض شناسی کے یہ اس دن بھی پہلے نوکری پر گیا اور پھر بارات کے استقبال کے لیے استقبالیہ سے کچھ دیر پہلے شادی ہال پہنچا یقیناً عصر حاضر میں اس مستعدی کو حماقت کے سوا کچھ قرار نہیں دیا جا سکتا نبیل قیصر ماشاء اللہ اپنی ملازمت کی اننگز پوری طرح کھیل کے اکتیس دسمبر کو ریٹائر ہو چکا ہے نبیل کے کولیگز نے جس محبت سے بینڈ باجے بارات سمیت گاڑی میں بٹھا کر اس کے گھر رخصت کیا یہ کرسیوں کو سلام کرنے والوں اور کرسیوں کو مضبوط سمجھنے والے بزر جمہروں کے لیے لمحہ فکریہ ہے ہم نے ویڈیو پر ڈاکخانہ سے نبیل کے گھر تک بینڈ باجے میں اس کی رخصتی کا منظر تو دیکھا مگر افسوس ہم ہماری بھابھی کے ردعمل سے آگاہ نہیں ستائیس سال بعد نبیل کو دوبارہ دلہا بنے دیکھ کر ان کے دل پر کیا گزری ایک ادبی کارنامہ جو نبیل قاصر عرصہ دراز سے اوکاڑہ کے ادبی حلقوں کے لیے کر رہا ہے یہ ادبی مجلہ بیاض کا مقامی سہولت کار ہے سارے شہر کے اہل قلم کی نگارشات اکٹھی کر کے یہ بیاض کے صدر دفتر بھیجتا ہے اس مستقل مزاجی سے کہ ہم جیسا غیر مستقل مزاج بھی باقاعدگی سے فنون کے بعد اب بیاض میں چھپ رہا ہے اور پھر مجلے کی پی ڈی ایف اہل قلم کو بے لوث انداز میں واٹس ایپ کرتا ہے ایسے دیوانے آج کل کہاں ملتے ہیں آج بھی ڈاکخانہ گیا ہوا تھا استدلال یہ کہ ابھی اس کی جگہ بندہ نہیں آیا اور پوسٹ آفس کی کسٹمرز سروس خراب ہو رہی ہے بے شک کوئی بھی کسی سیٹ سے ناگزیر نہیں ہوتا جو یہ سمجھتے ہیں قبرستان انہیں ناگزیروں سے بھرے پڑے ہیں مگر ہمارا ذاتی نقصان یہ ہوا کہ نبیل قیصر کے ریٹائر ہونے سے پوسٹ آفس میں کھلی ہماری ذاتی ونڈو بند ہو گئی ہے نبیل قیصر کے بارے میں اتنا ہی عرض ہے ہمیں یہ تو نہیں پتہ کہ قائداعظم نے پاکستان کے بارے میں کیا سوچا تھا مگر اتنا ضرور یقین ہے بانی پاکستان نے نوزائیدہ مملکت میں سرکاری اہلکار ضرور نبیل قیصر جیسے سوچے تھے اوپر سے نیچے تک چراغ سے چراغ جلتا ہے مگر آندھیوں میں ایسا ضبط تحمل کہاں کہتے ہیں اکیلا چنا کیا بھاڑ جھونکے گا مگر نبیل جیسے پر عزم کو دیکھ کر لگتا ہے اکیلا چنا بھی بھاڑ جھونک سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

عام فکری مغالطے

وحید احمد

رخشندہ نوید نے اپنی غزلوں کی کتاب کا عنوان "رات مجھے اچھی لگتی ہے" اپنی نظم سے چنا ہے، ایسے ہی میں نے اس مضمون کا عنوان علی عباس جلالپوری کی معرکتہ الآراء کتاب سے مستعار لیا ہے۔ علی عباس جلال پوری نے اپنی کتاب "عام فکری مغالطے" میں ہمارے دانش کے حلقوں میں پھیلے ان بنیادی مضامین اور نظریات کا از سرِ نو جائزہ لیا ہے جو کسی خاص نقطہ نظر یا تعصبات کے باعث ہمارے ہاں مقبول ہوئے مگر درحقیقت ان کی نوعیت مختلف ہے۔ ہمارے ہاں ایک فکری مغالطہ یہ ہے کہ گمبھیر موضوعات کے لیے شاعر کا لہجہ اور ڈکشن بھی گمبھیر ہی ہونا چاہیے۔ اب اس میں سبکِ ہندی یا صنعتِ حسنِ تعلیل کا کتنا عمل دخل ہے، یہ بحث اپنی جگہ ہے۔ کیا شعر میں تہ داری معانی کی شدت اس قدر ہو کہ قاری کے اوسان خطا ہو جائیں - یہ الگ معاملہ ہے۔ کیا شکوہِ الفاظ سکندرِ اعظم اور مغلِ اعظم کی یاد دلائے، یہ الگ سلسلہ ہے۔ مگر یہ سب کچھ ہماری شاعری میں عرصہ دراز سے رائج ہے اور منظورِ نظر ہے۔ ہمارے شعر و سخن کی تاریخ میں بہت کم شعرائے کرام ہیں جن کے کلام میں شگفتگی، تازگی، رجائیت اور مثبت پیرائے کا عکس ہے۔ صدیوں کی محرومی، بھوک، تسلط اور احساسِ کمتری کی وجہ سے ہماری تہذیب و تمدن کا عمومی مزاج اداسی اور گریہ وزاری ہے۔ کہیں کہیں جب رنج والم کے اس بحرِ بے کراں میں خوشی اور انبساط کے جزیرے نظر آتے ہیں تو خوشگوار حیرت ہوتی ہے اور ان جزیروں پر کچھ دیر ستانے کو جی چاہتا ہے۔ جیسے حضرت امیر خسرو کے گیت، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں ہیں۔ جیسے نظیر اکبر آبادی کے متنوع مضامین سے بھری چہکتی ہوئی شاعری ہے۔ جیسے حیدر علی آتش کے اشعار کی رجائیت اور بے باکی ہے۔ جیسے داغ کی بے تکلفی اور بے ساختگی ہے۔ موجودہ دور میں رخشندہ نوید اس شگفتہ اور روشن سلسلے کی رخشاں و تاباں کڑی ہیں۔ ہمارے ادب کی لرزہ خیز گھمبیرتا میں خوشی کی نوید ہیں اسی لیے وہ رخشندہ نوید ہیں۔ اسم بامسمیٰ ہیں۔ مثال کے طور پر لامتناہیت (Infinity) فلسفے اور ادب کی بنیادی موضوع ہے۔ جتنا بڑا یہ تصور

ہے اتنی ہی گنجلک اس کی تفہیم ہے اور مشکل تر اس کا شعری شکل ہے۔ مگر رخشندہ نوید بڑی بے ساختگی سے اسے اپنے مخصوص انداز میں سمجھا جاتی ہیں۔ جیسے:

آج کی رات سو کے دیکھیں گے
ہم سمندر کی چارپائی پر
یا دیکھ لی رات بھر زمینِ حیات
اب فقط آسمان بچا ہوا ہے

....

ہمارے ہاں، خزاں کو اکثر و بیشتر ویرانی اور وحشت کی علامت کے طور پر باندھا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ میدانی علاقے کے شاعروں کی اجارہ داری تھی۔ میدانی علاقوں کی خزاں واقعی وحشت انگیز ہوتی ہے، مگر کیا کسی نے ہنزہ، سُست، سکردو، چترال، کیلاش اور ناران کی خزاں دیکھی ہے۔ درخت کے پتوں کے اتنے رنگ ہوتے ہیں جیسے موسم جنگل میں ہولی کھیل رہا ہو۔ رخشندہ نوید اس بت کو توڑتی ہیں جب کہتی ہیں:

گرے ہیں پتے کہ مور پر ہے
خزاں بھی اب تو حسین تر ہے

....

ہمارے ہاں لٹھے کا ذکر آتے ہی کلمہ شہادت کا ورد شروع ہو جاتا ہے۔ کفن، دفن، قبر کا عذاب اور مرنے کے بعد کیا ہوگا، جیسے خیالات رونگٹے کھڑے کرتے ہیں۔ عجیب فکری مغالطہ ہے۔ لٹھے جیسے شاندار پاکیزہ، اور نفیس پارچے پر اب کون بات کرے، تو رخشندہ نوید کرتی ہیں:

کورے لٹھے سا اُن سلا چہرہ
دکھ کی حالت میں چاند سا چہرہ

....

ہمیں کچھ اچھا لگے تو ستائش کے بجائے چپ اختیار کر لیتے ہیں۔ مبادا تعریف ہماری پُر حکمت شخصیت کو داغ نہ کر دے۔ رخشندہ نوید کی جو بات اچھی لگتی ہے، بے ساختہ اور برملا اس کی تعریف کھل کر کرتی ہیں۔ جیسے:

مرے خیال میں گُم، بے حساب پیتے ہوئے
تم اچھے لگتے ہو مجھ کو شراب پیتے ہوئے

یا گھپ اندھیرے بھی اچھے لگتے ہیں
چپ سویرے بھی اچھے لگتے ہیں

....

یہ اور اس طرح کی بہت سی شگفتہ اور رجائیت بھری مثالیں رخشندہ نوید کی شاعری میں جا بجا ملتی ہیں تو پڑھ کر خوشی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ادب عالیہ قاری میں زندہ رہنے کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ رخشندہ نوید ہر فرضِ کفایہ ادا کرتی ہیں تاریخ میں بہت کم خواتین ہیں جو بت شکن ہیں Iconoclaust ہیں صرف feminism کا جھنڈا اٹھا کر توجہ حاصل نہیں کرتیں بلکہ عام فکری مغالطوں کا جواب دیتی ہیں۔ جیسے قدیم یونانی شاعرہ سیفو نے دیا تھا۔ جیسے فروغ فرخ زاد یا قراۃ العین طاہرہ نے دیا تھا۔ میں رخشندہ نوید کو مبارک پیش کرتا ہوں کہ ان کی شاعری رخشندہ ہے اور آنے والے شاعروں کے لیے خوشی کی نوید ہے۔

☆☆☆☆☆

صحرائی شاعر کی سحر انگیز شاعری

ایس ایم معین قریشی

چار پانچ ماہ قبل کی بات ہے، مَیں اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے مقامی دفتر میں ریذیڈنٹ ڈائریکٹر جناب قادر بخش سومرو کی دعوت پر ان کے دفتر میں منعقدہ ہفتہ وار مشاعرے میں (بہ طور سامع) شریکِ محفل تھا۔ شعرائے کرام آ رہے تھے اور اپنے اپنے حصے کی داد سمیٹ کر رخصت ہو رہے تھے۔ اسی دوران ریاض ندیم نیازی نام کے ایک شاعر کو سٹیج پر بلایا گیا۔ سومرو صاحب نے بتایا کہ موصوف کا تعلق سبی (بلوچستان) سے ہے۔ مَیں اس اطلاع کے تناظر میں ان صاحب کے کلام کے معیار اور انھیں ملنے والی بھرپور داد پر ششدر رہ گیا۔ میں ہمیشہ سے اُن حضرات کی ادبی کاوشوں (خواہ وہ شعری ہوں یا نثری) سے متاثر رہا ہوں اولاً جن کی مادری زبان اردو نہیں اور ثانیاً جنھوں نے پاکستان میں اردو کے (نام نہاد) ادبی مراکز سے دور رہتے ہوئے اردو کو اظہار اور ابلاغ کا ذریعہ بنایا۔ ریاض ندیم نیازی اِن دونوں "اوصافِ حمیدہ" سے متصف نظر آئے۔ پھر اُن کی شخصیت کے عجز، انکسار، نکھار اور شائستگی نے مجھے کسی رسمی تعارف کے بغیر اُن کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ مشاعرہ ختم ہُوا تو میں نے حسبِ عادت سومرو صاحب کی چائے/ پکوڑوں سے دست بردار ہو کر واپسی کی راہ لی۔

میں بہ مشکل اکادمی کے بیرونی دروازے تک پہنچا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہی نیازی صاحب تھے جن کے کلام کے سحر سے میں ابھی تک باہر نہیں نکل پایا تھا۔ وہ مجھ سے بڑے خلوص سے ملے اور میرا شکریہ ادا کیا کہ میں ان کے کلام کی کھل کر داد دے رہا تھا۔ میں نے اُن سے کہا "بھائی، آپ کی غزل ہی ایسی تھی جس میں خیالات کی تازگی اور الفاظ کی سادگی نے مجھے متاثر کیا تھا۔ بولے "سرزبان تو

میری اس لیے سادہ ہے کہ میں مشکل لکھ ہی نہیں سکتا اور خیالات میں تازگی شاید اس لیے ہے کہ میں صحرائی آدمی ہوں۔" لیجیے، وہ نثر میں شاعری کرنے لگے۔ میں نے اُن کا شانہ تھپتھپایا اور شاہراہِ ادب پر اُن کی مزید کامیابیوں کی دعا کرتے ہوئے ان سے رخصت چاہی۔ البتہ میں نے اُن سے غیر معمولی گرم جوشی سے مصافحہ کیا کیوں کہ میرا خیال تھا کہ مستقبل قریب میں اُن سے دوبارہ ملاقات کا موقع شاید ہی میسّر آئے۔ میرا سبی جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور ان کا کراچی آنے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ پہلے زمانے میں کہا جاتا تھا کہ خط سے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ آج کل خط کی جگہ ایس ایم ایس نے لے لی ہے بلکہ وہ تو خط سے آگے بڑھ گیا ہے۔ آپ مجھے ایس ایم ایس کریں تو یہ آدھی ملاقات ہوئی اور میں اس کا جواب دوں تو یہ پوری ملاقات ہوگئی۔ اپنے گھر لوٹ کر نیازی صاحب نے ہر روز صبح سویرے مجھے سلام اور "صبح بخیر" کا پیغام بھیجنا اپنا معمول بنا ڈالا۔ میری طرف سے بھی فوری جواب جاتا ہے اور یوں قادر بخش سومرو صاحب کے توسط سے ہم دونوں کے درمیان جو ذاتی رابطہ قائم ہوا تھا وہ ایک برقی ذریعۂ ابلاغ کی صورت میں تا حال برقرار ہے۔ رسمی تعارف کے بعد میں نے دیکھا کہ نیازی صاحب ادب کی دنیا میں کوئی ایسی غیر معروف شخصیت بھی نہیں ہیں۔ پاکستان کے مقتدر ادبی جرائد میں ان کا کلام شائع ہوتا ہے اور دیگر اہلِ قلم ان کی شاعری پر مضامین لکھتے ہیں۔ چناں چہ ستمبر ۲۰۱۹ کے ماہ نامہ "تخلیق" (لاہور) میں ایک مضمون بہ عنوان "ریاض ندیم نیازی... ایک صوفی شاعر" نظر سے گزرا جس میں نیازی صاحب کے فن اور شخصیت پر مختصر اظہار خیال کرتے ہوئے مصنف (نذیر قیصر) رقم طراز ہیں "جب تک ندیم نیازی جیسے اچھے لوگ اور پیارے لوگ علم وادب کی دنیا میں ہیں، یہ دنیا آباد اور شاداب رہے گی۔" میں چاہوں تو ان توصیفی الفاظ پر صاد کر کے گفتگو ختم کردوں:

لیکن ع مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

....

ریاض ندیم نیازی کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد لگ بھگ ایک درجن ہے۔ ان میں پانچ نعتیہ مجموعے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے نعت گوئی سے انھیں خصوصی شغف ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ نعت کے حوالے سے متعدد تنظیموں سے وابستہ ہیں اور بلوچستان میں نعت گوئی کے فروغ میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں۔ نعت، محسنِ انسانیت سے عقیدت ومحبت کے اظہار کا وسیلہ اور ہم سب کا جزوِ ایمان ہے۔ نیازی صاحب نے نعت میں خوش گوار تجربے بھی کیے ہیں۔ ان کی ایک کتاب "جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے

ہیں" کلی طور پر اُن نعتوں پر مبنی ہے جو غالب کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ غالب جو اردو شاعری میں سب پر غالب ہیں، کی زمین میں کوئی دو نعتیہ شعر لکھ دے تو یہ بڑی بات ہے کجا کہ ستر نعتوں پر مشتمل کتاب معرضِ وجود میں آ جائے۔ اس کتاب کی ہر نعت کا ہر شعر پُرکیف اور ایمان افروز ہے۔ نعتوں کا معیار اتنا اعلیٰ ہے کہ اشعار کا انتخاب امر محال ہو گیا ہے۔ چناں چہ میں تین مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ پہلے غالب کے مصرع "عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" کا یہ نعتیہ جلوہ دیکھیے:

حاصلِ عشق ہے اُس در کا گدا ہو جانا
زیست کا بندشِ کلفت سے رہا ہو جانا

....

"سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں" کے تعلق سے یہ دل گداز شعر ملاحظہ کیجیے:

آ گیا جس وقت بھی مجھ کو خیالِ مصطفےٰ
اپنی قسمت پر مری سوچیں بھی نازاں ہو گئیں

....

"ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا" پر یوں طبع آزمائی کی گئی:

نام کے مسلماں ہم رہ گئے ہیں اب آقاؐ
راستے بدلتا ہے روز کارواں اپنا

ریاض ندیم نیازی کا کلام، ریاضِ سخن کا بہترین نمونہ ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی اور دونوں اصناف میں اپنی مہارت اور صلاحیت کا لائقِ ستائش مظاہرہ کیا۔ ان کی شاعری میں جذبات کی فراوانی، محاکات کی رنگارنگی اور لفظیات کی گُل کاری رچی بسی ہے۔ معاملاتِ حسن و عشق کے بیان میں ان کے قلم کے جوہر کھل کر سامنے آئے ہیں اور وہ ہمیں ایک پختہ کار شاعر کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ ان کا تصنّع سے پاک، سچا اور کھرا لہجہ اُن قارئین کو حیران کر دیتا ہے جو اسلوب میں ملمع کاری دیکھنے کے عادی ہیں۔ ندیم صاحب نہ تو رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں اور نہ فراقِ یار میں آنسو بہاتے ہیں اگرچہ ہجر اور خون کی کیفیات ان کے کلام میں جا بہ جا ملتی ہیں۔ اس لحاظ سے انھوں نے، اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے، عصرِ حاضر کے تقاضے بہ خوبی نبھائے ہیں۔ انھوں نے غزل کے پرانے اور "پیٹنٹ" موضوعات کو بھی نئے نئے زاویوں سے شعر کے قالب میں ڈھال کو جدّت اور روایت کے سنگم پر لا کھڑا کیا ہے۔ انھیں پڑھ کر یہ یقین ایمان کی حد تک مضبوط ہو جاتا ہے کہ دورِ حاضر میں دورِ نو کا سکہ ہی چلے گا۔ جو شعرا اس بدیہی امر کو تسلیم نہیں کرتے اور لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں زمانہ انھیں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ تاہم ندیم کوئی افسوں پھونک کر ہوا کا رخ بدلنے کا زعم نہیں رکھتے۔ وہ انقلاب (Revolution) کے بہ جائے

ارتقا (Evolution) کے داعی ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام ''تمھیں اپنا بنانا ہے'' ان کے اس طرزِ فکر کا عکاس ہے جیسا کہ اس شعر سے عیاں ہے :

یہ سماں بدلنا ہے آخرش ذرا آندھیوں کو تو رُکنے دے
کہ ہوا ہے تیز بہت ابھی سو دیا جلانے کی ضد نہ کر

....

''تمھیں اپنا بنانا ہے'' کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ رومانوی شاعری کا مجموعہ ہے۔ ندیم کو جس لفظ سے بہت محبت ہے وہ ''محبت'' ہے۔ بے شمار اشعار میں یہ لفظ آیا ہے۔ ایک مکمل موضوعاتی غزل محبت کے مختلف روپ پیش کرتی ہے۔ اس غزل کے تین اشعار بہ طور مثال پیش کیے جاتے ہیں:

محبت زندگی کا ذائقہ ہے
محبت ہی حقیقت میں خُدا ہے
محبت ہے محبت کی ضرورت
محبت ہی محبت کا صلہ ہے
محبت اک تسلسل ہے مُسلسل
نہ کوئی ابتدا یا انتہا ہے

....

ندیم محبت کو ایک فطری جذبہ سمجھتے ہیں۔ درج ذیل شعر میں بیان کردہ سچائی سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے:

لوگ کریں مجھ سے بھی محبت، پیار ندیم
کون سا دل ہے جس میں یہ ارمان نہ ہو

....

ایسی ہی ایک غزل میں کسی اجنبی حسینہ سے اظہارِ محبت کے ساتھ ساتھ ایک طرف اس سے شکوے کرتے ہیں اور دوسری طرف اسے بزرگانہ نصیحتیں بھی کرتے ہیں:

ترا خیال مری زندگی ہے اے لڑکی
عجیب بات کہ تو اجنبی ہے اے لڑکی

سنگھار کر، مگر اک بات ذہن میں رکھنا
کہ اصل حُسن تو بس سادگی ہے اے لڑکی

....

تغزل کے شانہ بہ شانہ ندیم کی غزل میں زندگی کی تلخ حقیقتیں بھی بڑے اہتمام سے بیان کی گئی ہیں۔ وہ شاعر دنیائے ادب پر اپنا دیرپا اثر نہیں چھوڑ سکتا جو ان سے چشم پوشی کرے۔ حالی کے مطابق ایک شاعر کا یہی کام نہیں کہ ہمیشہ لطیف اور خوش گوار باتیں کرتا رہے، اس کا یہ بھی فرض ہے کہ اگر تلخیوں کی ضرورت محسوس کرے تو وہ بھی پیدا کرے۔ ندیم کے مندرجہ ذیل اشعار اس قولِ فیصل کے آئینہ دار ہیں:

جُدا سینے سے کر کے دل کے ٹکڑے بیچ دیتے ہیں
اِسی دُنیا میں اپنے لوگ بچے بیچ دیتے ہیں

....

موت کی نیند اُسے کوئی سُلا ہی دے گا
قتل کی کون عدالت میں گواہی دے گا

....

اخلاق کے مضامین اُردو غزل کا ''اٹوٹ

انگ" ہیں اور ندیم اس ضمن میں بھی اپنے فرائض سے بہ خوبی آگاہ ہیں :

جہاں تک ہو سکے محفوظ رکھنا ہے بھرم اپنا
کہ اپنے ہاتھ سے پامال خودداری نہیں کرنی

....

حُسنِ کردار کی توقیر سمجھتے ہی نہیں
لوگ تو جبّہ و دستار میں کھو جاتے ہیں

....

ہم کیسے اُسے صاحبِ کردار سمجھ لیں
جس شخص کے ہوں صاحبِ کردار مخالف

....

اس مضمون کے ابتدائی حصے میں ریاض ندیم نیازی کا ایک " اقبالی بیان" درج ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ وہ مشکل زبان لکھ ہی نہیں سکتے۔ یہ بات اس حد تک تو درست ہے کہ ان کے ہاں لچھے دار زبان نہیں ملتی لیکن شوکتِ الفاظ سے ان کا کلام یک سر عاری نہیں۔ یہ اشعار میرے اس مشاہدے کی گواہی دیں گے:

ہم کسی مسند و خلعت کے طلب گار نہیں
جاہ و حشمت سے ہمیں کوئی سروکار نہیں

....

دیا گیا ہے جو ترتیب نسلِ نو کے لیے
بہ چشمِ حیرت و وحشت، نصاب دیکھتے ہیں

....

میرا لہو بھی مشعلِ دار و رسن رہا
ہیں سب مرے قبیلے کے یہ سربُریدہ لوگ

مکیں بنیاد ہی سے منحرف ہونے لگے ہیں
کہ جیسے نقطۂ پرکار نکلا جا رہا ہے

ندیم کی غزلیں صنائع و بدائع سے بھی مالامال ہیں۔ ان میں منظوم محاورات، تشبیہات، استعارات اور تلمیحات اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ شاعر کا مطالعہ وسیع ہے اور وہ اپنے لکھے کو قاری کے لیے موثر اور پُرکشش بنانے کا فن جانتا ہے۔

پہلے محاورہ بندی کے رنگ ملاحظہ کیجیے:

آدمی بیچ باچ کر گھوڑے
بے خبر ہو کے سو گیا ہے کیا

....

نبھے گی کس طرح یہ تیری میری دوستی آخر
وہیں گے کیسے وہ فتنے جو اپنا سر اٹھاتے ہیں

اور اب، مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کردہ تلمیحات پر غور فرمایئے:

مرا مولا اگر چاہے، ثبوتِ بے گناہی میں
پنگوڑے میں پڑا معصوم بچہ بول سکتا ہے

....

کہہ دو یزیدِ وقت سے امتحان لے
سولی پہ حق کا برملا اظہارِ عشق ہے

....

پہلے شعر میں اُس روایت کی جھلک ہے کہ جب عزیزِ مصر کی بیوی، زلیخا نے حضرت یوسفؑ پر خواہشِ نفسانی کی تہمت رکھی تو ایک بچے نے گواہی دی کہ اگر ان کی قمیص سامنے سے پھٹی ہوئی ہے تو زلیخا سچی ہے اور یوسفؑ (معاذ اللہ) جھوٹے ہیں اور اگر پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو حضرت یوسفؑ سچے ہیں اور زلیخا جھوٹی ہے۔ اس پیمانے پر

یوسفؑ بے گناہ ثابت ہوئے۔ دوسرے شعر میں منصور کے سُولی پہ چڑھ جانے کے واقعے کا ذکر ہے۔ کہیں کہیں ندیم کے کلام میں واقعاتی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ یہ شعر دیکھیے :

سُنا ہے اب جہاز میں بھی ہوتے ہیں مشاعرے
کہ ہو رہی ہے اب تو گویا بادلوں میں شاعری

....

جی ہاں، یہ اچھوتا کارنامہ ہمارے مزاح گو ہم دم ضیاالحق قاسمی (مرحوم) سے سرزد ہوا تھا۔ انھوں نے ۱۹۸۹ میں لاہور سے کراچی آنے والی پی آئی اے کی ایک فلائٹ میں مزاحیہ مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ ایسا ہی ایک مشاعرہ بحری جہاز پر منعقد کیا گیا تھا۔ انھوں نے ایک مزاحیہ مشاعرہ ساحلِ سمندر پر بھی کرایا تھا۔

(حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا)

اور یہ "نظریاتی" اشعار دیکھیے :

گھل جائیں گی اشکوں میں، دبیں گی جو کراہیں
جو کرب نہ ہو پائے رقم بول پڑیں گے

....

ہو جائیں گے مظلوم سب اِک روز ہم آواز
بے ساختہ پھر ہو کے بہم بول پڑیں گے

ریاض ندیم نیازی کی نظمیں اظہار کی روانی اور تخیل کی بلندی کا مرقع ہیں۔ "ماں"، "بیوی"، "بیٹی" اور "بہن" ایسی نظمیں ہیں جنھیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اس لیے کہ یہ رشتے سب کے "سانجھے" ہیں۔ ہر شخص کو ان نظموں میں اپنائیت کا احساس ملے گا۔ ندیم نے مختلف پہلوؤں سے ان رشتوں کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے ان کے لیے دل میں پہلے سے موجود محبت کو مہمیز بخشی ہے۔ دیگر نظموں میں "اداسی کی چادر" ۲۰۱۰ کے سیلاب کے موضوع پر ہے اور ایک میں دہشت گردی کے واقعے کی خوں چکاں داستان ہے۔ ایک نظم میں منیر نیازی اور ایک میں پروین شاکر کی شاعرانہ عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ دونوں کے لیے (بالترتیب) ایک ایک شعر ملاحظہ ہو:

کب ہے محدود اُس کا فن، اِس دور تک ہی اے ندیم
سارے ادوار زمانہ میں گزر اُس نے کیا

....

لہجہ و اسلوب نے کچھ رنگ ایسا بھر دیا
اُس کی جو بھی سوچ تھی وہ دل کشی میں ڈھل گئی

شعروادب کی شاہراہ پر ریاض ندیم نیازی جس سبک رفتاری سے گام زن ہیں، میں امید کرتا ہوں کہ بہت جلد ان کا شمار قادرالکلام شعرا کی صف میں ہونے لگے گا۔ بہ ہرحال، اس وقت بھی ان کا کلام ہم عصر شاعروں میں انفرادیت کا حامل ہے۔ مجھے ان کے اس قول کی صداقت میں ذرہ برابر شک نہیں:

میں پرو دیتا ہوں جذبات کو لفظوں میں ندیم
دل بھی رکھ دیتا ہوں کاغذ پہ میں اشعار کے ساتھ

☆☆☆☆☆

عصرِ حاضر کا عظیم شاعر اعتبار ساجد

لفظ ہمارے وجود کا پیرہن ہیں۔ لفظوں سے جملے اور جملوں سے موضوعات تشکیل پاتے ہیں۔ اردو شاعری کی پیشانی پر رومانوی شکنیں، پڑھنے کے لیے کسی قابل اعتبار تجربات و مشاہدات سے مزین خیالات کا تجزیہ کرنے کے لیے اعتبار ساجد کی شاعری ہمارے سامنے بطور مثال موجود ہے۔ خواب وہ نہیں جو نیند کے دوران آتے ہیں خواب تو وہ ہیں جو ہمیں سونے نہ دیں۔ اداس بھری شام بھی شاعر کے حُسنِ تخیل سے آفتاب کی صورت چمکنے لگتی ہے۔ قوس قزح کے سارے رنگ شاعر کے پندار کا حصہ بن جاتے ہیں۔

کسی کو اعتبار آئے نہ آئے یہ بات سو فیصد سچ ہے کہ اعتبار ساجد اپنے وقت کا ایک بڑا، کھرا، سچا اور کامیاب ترین شاعر ہے۔ اس کی شاعری زبان زد عام ہے۔ اس کی غزل میں اتنی غنائیت اور گداز ہے کہ ان کے شعر پڑھتے ہوئے عجب سرور اور سرشاری کی کیفیت در آتی ہے۔ اعتبار ساجد کی غزل میں جو حسن اور فکری جولانیاں دکھائی دیتی ہیں دراصل وہ ان کی ایک طویل ریاضت اور محنت شاقہ کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے شعری پودے کو خون جگر سے سینچا ہے۔ اسی لیے اب اس پر پھول اور پھل آئے ہیں۔ جو فنکار اپنے فن کے ساتھ انصاف کرتا ہے اسے وقت دیتا ہے اور خلوص دل کے ساتھ محنت کرتا ہے اس کی محنت کبھی ضائع نہیں جاتی۔ اعتبار ساجد کی شاعری پر اسی لیے اعتبار آتا ہے کہ انھوں نے فنی محاسن پر دسترس حاصل کی ہے۔ ان کا محبتوں بھرا شعری مجموعہ ”مجھے کوئی شام اُدھار دو“ کو بہترین اور بیسٹ سیلر گردانا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے ۲۴ سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ اس کی پسندیدگی کی ضمانت

ہارون الرشید تبسم

ہے کہ یہ مجموعہ بار بار منظرِ عام پر آیا ہے۔ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل یہ گلدستۂ محبت اعتبار ساجد کی نہ صرف پریم کہانی ہے بلکہ قاری اسے اپنے دل کی آواز سمجھتا ہے۔ کتاب کے ناشر زبیر احمد نے اس کتاب کی اشاعت پر فخر و انبساط کا اظہار کیا ہے۔ اس کا چوتھا ایڈیشن شفیق پبلی کیشنز نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ ان کی غزلیں قاری کو اپنے کلاوے میں پوری طرح سے جکڑ لیتی ہیں۔ ان کی کلام میں ایسی تاثیر ہے کہ ایک غزل پڑھنے کے بعد اسے دوبارہ پڑھنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ ان کی غزل میں کلاسیک غزل کے خدوخال کے علاوہ جدید یت بانہیں کھولے قاری کا استقبال کرتی محسوس ہوتی ہے۔ مذکورہ مجموعہ کی اوپننگ چار اشعار حالات کی پچ پر بیٹنگ کرتے نظر آ رہے ہیں:

تمھیں جب کبھی ملیں فرصتیں، مرے دل سے بوجھ اتار دو
میں بہت دنوں سے اداس ہوں مجھے کوئی شام ادھار دو

مجھے اپنے روپ کی دھوپ دو کہ چمک سکیں مرے خال و خد
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دو، مرے سارے زنگ اتار دو

کسی اور کو مرے حال سے نہ غرض ہے کوئی نہ واسطہ
میں بکھر گیا ہوں سمیٹ لو، میں بگڑ گیا ہوں سنوار دو

وہاں گھر میں کون ہے منتظر کہ ہو فکر دیر سویر کی
بڑی مختصر سی یہ رات ہے اسی چاندنی میں گزار دو

....

”مجھے کوئی شام ادھار دو“ کی غزلیں نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکنیں ہیں کیونکہ ان غزلوں میں ان کے خواب، خواہشیں، تمنائیں اور آرزوئیں چھپی ہوئی ہیں۔ اسی لیے وہ ان کی غزلوں کے دیوانے ہیں۔ اعتبار ساجد نے نسلِ نو کے ٹوٹے خوابوں کو اپنے لفظوں میں ایک سائبان عطا کیا ہے۔ وہ رفاقت کی بات کرتے ہیں تو کہیں انا کے غرور کے گرد دائرے لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کفِ افسوس ملتے ہوئے چاہتوں کے گلاب راہوں میں بچھانے کی تمنائی بھی ہیں۔ وہ اپنے منتشر جذبے آنکھ کی پتلی میں محسوس کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں اعتبار ساجد ان ساعتوں کے متلاشی ہیں جہاں امید کے گلستاں پھل پھول مہیا کرتے ہوں۔ چراغِ شب اس انداز سے روشن کرتے ہیں کہ محبت ان کے دروازے پر دستک دے گی۔ اعتبار ساجد کو ان لوگوں پر اعتبار نہیں ہے جو ان کے خواب چھین کر ان کی سوچوں پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔ خود غرض ماحول نے وہ چپ کی بکل اوڑھے اپنے محبوب کی راہ تکتے رہتے ہیں۔ انھیں

محبوب سے تو کوئی شکایت نہیں حالات کی چیرہ دستیاں ان کے پاؤں کی زنجیر نہیں۔

''شام'' ان کی شاعری کا ایک استعارہ ہے وہ اپنے آپ کو شام ڈھلے سلگانا شروع کرتے ہیں اس امید پر کہ کبھی تو آگ بھڑکے گی اور کبھی تو روشنی ہوگی۔

ان کی غزل میں سادگی اور روانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ مشکل اور ثقیل لفظوں سے پرہیز کیا ہے اس کے بجائے انھوں نے آسان اور سادہ لفظوں کو برتا ہے۔ اس کے ساتھ ان کی غزل میں تہذیبی وثقافتی عناصر بھی بھرپور انداز میں موجود ہیں۔ وہ ہندو دھرم کی تہذیب وثقافت کو بھی اپنی غزلوں میں سمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک غزل کے تین اشعار ملاحظہ ہوں:

ترے جیسا میرا بھی حال تھا، نہ سکون تھا نہ قرار تھا
یہی عمر تھی مرے ہمنشیں کہ کسی سے مجھ کو بھی پیار تھا

میں سمجھ رہا ہوں تری کسک، ترا میرا درد ہے مشترک
اسی غم کا تو بھی اسیر ہے، اسی دکھ کا میں بھی شکار تھا

کبھی لمحہ بھر کی بھی گفتگو مری اس کے ساتھ نہ ہو سکی
مجھے فرصتیں نہیں مل سکیں، وہ ہوا کے رتھ پہ سوار تھا

....

تیسرے شعر میں ''رتھ'' کا لفظ باندھا گیا ہے جو کہ ہندی کلچر اور ثقافت کی نمائندگی کر رہا ہے۔ غزل میں جب یہ لفظ آیا ہے تو وہ پورے سماج، تہذیب اور ثقافت کو بھی ساتھ لے آیا ہے۔ جب آپ برگر کھاتے ہیں تو اس کے ساتھ ہمیشہ کولڈ ڈرنک لیں گے۔ لسی نہیں مانگیں گے لیکن جب آپ ساگ کھاتے ہیں تو مکئی کی روٹی، مکھن اور لسی کی آرزو کریں گے۔ ہر چیز اپنی تہذیب و ثقافت ساتھ لے کر آتی ہے۔ جب ''رتھ'' کا لفظ آتا ہے تو وہ ہندی تہذیب وثقافت کی اساطیر کو بھی اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔

اعتبار ساجد کی غزلیں محبت میں لپٹی ہوئی ہیں کہیں ہجر، فراق اور کہیں ملن اور وصال کی گھڑیاں اور لمحات ملتے ہیں۔ کسی کو پا لینے کی خواہش میں تھکے مسافر کی طرح انگڑائیاں لینا شروع کر دیں تو یہ خواہش ایک کسک بن جاتی ہے یہی کسک دل کی دھڑکن تک پہنچ کر وفا، حیا، آرزو اور اعتبار کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور یہی کسک ان کی غزلوں اور نظموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ کسی منزل پر پہنچتے پہنچتے کسی کا رہ جانا، کسی سے ہاتھ ملاتے ملاتے رہ جانا، کبھی ہنستے ہنستے رونے والی کیفیت ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں یادِ ماضی مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہے۔ غزلوں اور

نظموں میں ایک ہی طرح کے مضامین موجود ہیں۔ یعنی دونوں اصناف میں محبت اور محبت کی ناکامی کی داستانیں ملتی ہیں، جو مختلف صورتوں میں اپنی چھب دکھاتی ہیں۔ ایک نظم "پہلی محبت یاد آتی ہے" کی آخری چند سطریں ملاحظہ ہوں:

شام خزاں جب تنہا تنہا
باغ میں سیر کو جاتا ہوں میں
کسی اداس سی لڑکی کو جب
بینچ پہ تنہا پاتا ہوں میں
جانے کیوں یاد آجاتا ہے
ایک خزاں کی شام کا منظر
جب ہم دونوں جدا ہوئے تھے!

یہ کیفیت ان کی کئی دیگر نظموں میں موجود ہے۔ جدائی اور فراق کے قصے اور داستانیں ان کی نظموں میں بار بار ملتی ہیں۔ وہ اپنے شاندار ماضی میں کھو جاتے ہیں۔ حسین مناظر انہیں بار بار یاد آتے ہیں۔ وہ کسی حسین منظر کو دیکھتے ہیں تو فلیش بیک کے ذریعے ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتے ہیں۔ ایک نظم "ہجر کی چوتھی سالگرہ" کی یہ چند سطریں ملاحظہ ہوں:

اب اس چاند کو کیا دیکھوں میں؟
تم جو میرے ساتھ نہیں ہو
کیک پہ شمعیں روشن کر کے
دھیرے دھیرے گِلہ کرتا ہوں
تالی تو میں بجا نہیں سکتا
بس ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوں
آج تمہارے ہجر کی چوتھی سالگرہ ہے

سید اعتبار حسین ساجد یکم جولائی ۱۹۴۸ ملتان میں سید علمدار حسین کے ہاں پیدا ہوئے۔ ایم اے اردو، کی پہلی پوزیشن نے اعتبار ساجد نت نئے موضوعات سے ہم کنار کیا۔ تدریسی منازل بخوبی طے کر کے اسسٹنٹ پروفیسر ریٹائر ہوئے۔ تقریباً چھ معروف کالجوں میں تدریس سرگرمیوں میں کامیابی کے علاوہ انھوں نے طالب علموں کے اذہان میں ادبی شعور بیدار کیا۔ انھوں نے بطور پرنسپل اپنی انتظامی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ متاثر کن بات یہ ہے کہ ان کی شعری تخلیقات کے عنوانات منفرد اور پُرکشش ہیں۔ نثری تخلیقات بچوں کا ادب، طنز و مزاح بھرپور کہانیاں، ٹی وی ڈرامے، ٹیلی فلم، ریڈیو اور صحافت سے وابستگی ان کی شہرتِ دوام میں شامل ہے۔ اعتبار ساجد کی صلاحیتوں کا اعتراف پاکستان اور پاکستان سے باہر بھی ہوتا رہا ہے۔ ان پر کئی تحقیقی مقالہ جات لکھے جا چکے ہیں۔ اور بہت سے

محققین ان کے فکر وفن پر اپنی محبت کا اظہار کر رہے ہیں۔ زیر تذکرہ، حسن و عشق کا وجد آفریں ہے۔ زندگی میں سب کچھ خریدا جاسکتا ہے لیکن فرحت بخش لمحات کسی قیمت پر ادھار نہیں لیے جاسکتے۔ اعتبار ساجد دھیمے لہجے کے انسان ہیں۔ خلوص کی فراوانی رکھتے ہیں۔ بااصول اور زود رنج بھی ہیں اگر محبوب مسلسل بے رُخی کا مظاہرہ کرے تو وہ محبت کی دہلیز پر اسے طلاق رجعی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ان کی محبتیں سب کے لیے لیکن کسی کو نفرت کے حصار میں نہیں رکھتے۔ انھوں نے قرطاس وقلم کو جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ وہ لفظوں کے امیں ہیں اور محبت کی نظریاتی سرحدوں پر عشق کی شمشیر تھامیں لفظوں سے اپنے مدمقابل پر حملہ کرنے کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ اعتبار ساجد عجیب شاعر ہے کبھی کبھی تو وہ خود جان بوجھ کر جدائیوں کی تمنا کرنے لگتا ہے بھلا ایسے بھی کوئی کرتا ہے لیکن اعتبار ساجد نے کر دکھایا ہے۔

تری قربتیں نہیں چاہئیں مری شاعری کے مزاج کو
مجھے فاصلوں سے دوام دے، تری فرقتیں مجھے چاہئیں

....

یہ برسوں کا تعلق توڑ دینا چاہتے ہیں ہم
اب اپنے آپ کو بھی چھوڑ دینا چاہتے ہیں ہم

بس گھڑی دو گھڑی کو ذرا ساتھ ہو، اس سے بڑھ کر سعادت نہیں چاہیے
عمر بھر کے لیے اور غم ہیں بہت، عمر بھر کی رفاقت نہیں چاہیے

....

مذکورہ اشعار میں حسنِ تضاد اور مراۃ النظیر کا خوب صورت سنگم موسیقیت اور صوتی آہنگ پیش کر رہا ہے۔ زندگی کے دیگر شعبہ جات کی طرح ادب میں بھی جدیدیت پروان چڑھ رہی ہے۔ شعری تجربات کا ظہور ہے۔ چند سال پہلے غزل میں مکالماتی انداز در آیا۔ شعراء کرام نے ان غزلوں میں محبوب سے محوِ کلام ہونے کی کوشش کی۔ کئی شعری مجموعے بھی منظر عام پر آئے۔ عدیم ہاشمی نے ''مکالمہ'' کے نام سے شعری مجموعہ اردو ادب کا حصہ بنا۔ راقم السطور نے مکالمہ کی تقریب رونمائی کا اہتمام فیصل ہال سرگودھا میں کیا۔ پروفیسر ریاض احمد شاد اور ڈاکٹر وزیر آغا نے اس مجموعہ کی خوب ستائش کی۔ عاشر وکیل راؤ کا ایک شعری مجموعہ ''تم ہو، نا'' زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ اسی طرح دیگر شعرا نے بھی مکالماتی غزلیں کہہ کر اپنے آپ کو منوانے کی بھرپور کوششیں کیں۔ اعتبار ساجد کے انداز پر بھی نظر دوڑائیے:

کہا: دن کو بھی یہ گھر کس لیے ویران رہتا ہے
یہاں کیا ہم سا کوئی بے سروسامان رہتا ہے

کہا: کیا اس کے رشتہ دار بھی ملنے نہیں آتے
جواب آیا: یہ صحرا رات دن سنسان رہتا ہے

کہا: کیا اس محلے میں نہیں پرسان حال اس کا
جواب آیا: خیال اس کا مجھے ہر آن رہتا ہے

....

مرحلہ زیست میں ماں محبت کا خزینہ ہے۔ ماں کی محبت کے بغیر زندگی بے سود ہے۔ دیگر شاعروں کی طرح اعتبار ساجد محبت کی بارگاہ میں ماں کے درجے کو بہت اہم سمجھتے ہیں

ماں کا رشتہ سب رشتوں پر حاوی ہوتا ہے۔ بے لوث محبت کا ایک ایسا عظیم پیکر ہے جو اپنے بچوں کے لیے بے پایاں محبت رکھتا ہے۔ اعتبار ساجد نے اپنی ماں کے حوالے سے دو شاندار نظمیں لکھی ہیں۔ جس میں انھوں نے اپنی ماں کے حضور محبت اور عقیدت کے جو پھول نچھاور کیے ہیں وہ قابل تحسین ہیں۔

مرے چاروں طرف ہے دشت بے پایاں کہاں ہو تم
مرے ماتھے پہ بوسہ دینے والی ماں کہاں ہو تم

مجھے جھلسا رہی ہے زندگی کی دھوپ برسوں سے
مری امید، میری زیست کا ساماں کہاں ہو تم

خراشیں ڈال دی ہیں دل کے آئینے پہ دنیا نے
مرے ہر دکھ، مرے ہر درد کا درماں کہاں ہو تم

اردو ادب میں قطعہ، رباعی اور چومصرعے کہنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ اعتبار ساجد نے بھی چومصرعے کہہ کر اس صنف کو وقار بخشا ہے۔ ان کے چومصرعوں میں جو مضامین ملتے ہیں ان میں وہ وقت، سیاست، حاکم اور لوگوں کے رویوں پر طنز کی ہے۔ ایک چومصرعہ ملاحظہ ہوں:

وقت و حالات بھول جاتے ہیں
ایک اک بات بھول جاتے ہیں

ہم نے دیکھا کہ لوگ پل بھر میں
اپنی اوقات بھول جاتے ہیں

....

ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور اور تخلیق فیملی نے اعتبار ساجد کی بیماری سے صحت کی بحالی کے ضمن میں افوش کلب میں تقریب کا اہتمام کیا۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے احباب نے ان کی بحالی صحت پر انھیں مبارک باد دی۔ ان سے کلام سنا اور بھرپور داد دی۔ اعتبار ساجد نے بھی پیار بھرے لفظوں سے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اسی موقع پر انھوں نے راقم السطور (ہارون الرشید تبسم) کو اپنی تین کتب ''مجھے کوئی شام ادھار دو''، ''امتزاج'' اور ''اعتبار ساجد: فن اور شخصیت'' عنایت فرمائیں۔

☆☆☆☆☆

حامد یزدانی کی غزل میں سماجی شعور کی جھلکیاں

طارق کامران

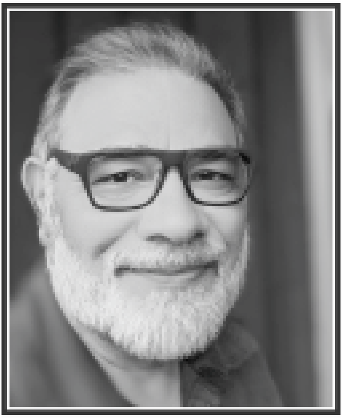

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

....

میرے نزدیک یہ شعر دولتِ تیقن سے محروم کوئی شاعر نہیں کہہ سکتا، تو، ہمارے فیض صاحب دولتِ یقین و امید سے مالامال شاعر ہیں جن کی فکر تاریخی اور عصری بصیرت سے روشنی حاصل کرتی ہوئی ایک پُرامید اور پُرامن مستقبل کی منزل پر ٹھہرتی ہے۔ اُن کا درجِ بالا شعر بھی اُن کے اُس گہرے سماجی شعور کا آئینہ دار ہے جس کا منبع ان کا فہمِ تاریخ تھا اور یہ یقین کی دولت ہی تھی جس نے انھیں طویل 'شبِ ہجراں' کے کٹھن لمحات میں بھی رجائیت کی صبح کے روشن احساس سے دُور نہ ہونے دیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عہد ساز شاعری ماضی کے آئینہ میں جب حال کے خدوخال سنوارنے میں مگن ہوتی ہے تب بھی اُس کی دُوررس نگاہ مستقبل کے دل کش رُخ سے کسی پل ہٹتی نہیں۔ اس ضمن میں میر وسودا و غالب واقبال کے سدا بہار شعری خزانے سے بھی حوالے دیے جاسکتے ہیں اور فیض صاحب ہی کی طرح حبیب جالب، ظہیر کاشمیری، یزدانی جالندھری، احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، افتخار عارف، خالد احمد اور اسلم کولسری کے سرمایۂ غزلیات سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

تاہم یہاں بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تخیل اور وجدان کے پروں پر اُڑنے والے شاعر کو بھلا غمِ زمانہ سے کیا غرض؟ اُس کی تخلیقی اشتہا کی تسکین تو رزقِ تصور ہی کرسکتا ہے۔ زورِ تخیل پر کی گئی اسی شاعری کو بعض نقاد 'خالص شاعری' قرار دینے پر مصر رہے اور ہیں۔ مگر ممتاز نقاد شمیم حنفی کے الفاظ میں:

''خالص شاعری'' کا راگ الاپتے ہوئے لوگ اس حقیقت کو بھلا بیٹھتے ہیں کہ دنیا کا

بڑے سے بڑا ادیب بھی اپنے ماحول سے بے گانگی کی روش اختیار نہیں کرسکتا۔"
اور شمیم حنفی صاحب کی بات میرے دل کو لگتی ہے۔ وجہ یہ کہ دنیا میں بسنے والے دوسرے انسانوں کی طرح شاعر بھی تو اپنے ماحول سے، اپنے معاشرہ سے اور اپنے اردگرد وقوع پزیر ہونے والے واقعات و حادثات سے، ٹوٹتی پھوٹتی روایات سے اور نت نئی ایجادات سے یعنی معاشرتی تبدیلی کے مضمرات سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک عام انسان اور شاعر میں فرق بس یہ ہوتا ہے کہ شاعر تخلیق کار ہونے کے سبب مشاہدے اور مطالعے میں آنے والے عناصر و عوامل کو ایک ٹھوس حیثیت سے یا ان کی حقیقی صورت میں دکھانے کے بجائے انھیں اپنے تخلیقی شعور یا وجدان کی کٹھالی میں پگھلا کر حرف حرف سنہرے مصرعوں میں ڈھالتا ہے۔
اس ضمن میں لینگسٹن ہیوز کی نظموں پر بات کی جاسکتی ہے جو امریکا میں سیاہ فام باشندوں، تارکینِ وطن اور مفلس گورے باشندوں کی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے شہری آزادیوں اور برابر کے حقوق کا نعرہ بلند کرتی ہیں۔ انگلستان کی جانب دیکھیں تو ولیم بلیک کی شاعری میں ہمیں مغرب کے صنعتی انقلاب کے سائے میں پلتی مفلسی اور محرومی کی داستانیں سنائی دیتی ہیں۔
عالمی ادب میں ایک طرف ہمیں ایڈون مارکھم اور ڈوڈلی رینڈل محنت کشوں کے استحصال اور نسل پرستی کے خلاف آواز اُٹھاتے دکھائی دیتے ہیں اور دوسری طرف کلاڈ میکے جبر اور ناانصافی پر اور کینیڈا کے شعرا آلڈن نولن اور مارگریٹ ایٹ ؤڈ انسان کو قدرتی آب و ہوا اور فطرت سے قُرب کی حامل فضا میں لوٹ آنے کی ترغیب دیتے سنائی دیتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ کہ حساس شاعر کہیں کا بھی ہو وہ اپنے اردگرد سے بے خبر ہرگز نہیں ہوسکتا۔
اس سب کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم اردو کے استاد شاعر جناب یزدانی جالندھری کے صاحب زادے، کینیڈا میں مقیم جدید لب ولہجہ کے پاکستانی شاعر حامد یزدانی کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم پر منکشف ہوتا ہے کہ اُن کی غزلیات کے اشعار میں بھی جا بہ جا معاشرتی یا سماجی شعور کی جھلکیاں بکھری ہوئی ہیں۔
سوشیالوجی یعنی معاشریات اور سوشل ورک میں تعلیمی اور پیشہ ورانہ پس منظر رکھنے والے اس شاعر کے اشعار میں جہاں ذاتی کرب کی ترجمانی ملتی ہے وہاں معاشرتی موضوعات کی بھی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔
میری خوش بختی کہ میں کلاسیکی اور جدید عالمی ادب کے رسیا حامد کے لگ بھگ سارے ہی تخلیقی سفر کا گواہ ہوں جس کا آغاز غالباً ستر کے عشرہ کے اواخر میں ہوا

تھا جب انھوں نے کہا تھا:

گھر سے وہ نکلی ہے یوں پیلا دوپٹہ اوڑھ کر
چاند نکلے جس طرح چہرے پہ ہالا اوڑھ کر

....

لیکن اُن کا شعری ذوق جب پیلے دوپٹے کی نرم رومانوی چھاؤں سے آگے بڑھ کر دشتِ فکر کی پہنائیوں سے آشنا ہوا تو وہی حامد کہنے لگے:

دیکھیے، دشت میں کھلتے ہیں کہاں لالہ وگل
دیکھیے، پاؤں کہاں آبلہ پا رکھتا ہے

....

مجھے یاد ہے جب حامد نے پہلی بار یہ شعر پاک ٹی ہاؤس میں سنایا تھا تو اسرار زیدی، خالد احمد، سراج منیر، نجیب احمد، محمد خالد، علی اکبر عباس اور ہم سب نوجوان شعرا یعنی ڈاکٹر جاوید انور، عباس تابش، اصغر عابد، آفتاب حسین، غضنفر علی ندیم اور ضیا الحسن نے اسے خوب داد دی تھی اور اس کے ساتھ ایک بڑے شعری امکان کی امید بھی وابستہ کر لی تھی۔

مقام مسرت ہے کہ حامد بزرگوں اور دوستوں کی توقع پر پورا اُترا اور وہ شعر کی وادی کی سیر کرتے ہوئے پھر کہیں رُکا نہیں۔ برابر قدم آگے بڑھاتا رہا۔ وقتی داد و تحسین سے بے نیاز، ادبی گروہ بندیوں سے کوسوں دُور --- بہ ظاہر کبھی یورپ گردی میں مشغول، کبھی لاہور کے شب و روز جھیلنے میں مگن اور کبھی کینیڈا، شمالی امریکا کے برف زار عبور کرنے میں مصروف --- مگر بہ باطن وہ تخلیقی خطے ہی کی دشت نوردی کرتا رہا۔ اُس کی شاعری رنگا رنگ خیال پیش کرتی رہی جس میں ذات کے دکھوں کے ساتھ ساتھ کائنات کے اسرار کے رنگ بھی نمایاں ہیں۔ اپنی داخلی تخلیقی واردات کو بیان کرتے ہوئے بھی وہ اپنے شعر میں عصری اور سماجی شعور سے صرفِ نظر نہیں کرتا۔ کر بھی کیسے سکتا ہے کہ شاعر تو ہوتا ہی باشعور ہے۔ حامد کا تخلیقی شعور یا وجدان اسے اب اس مرحلے پر لے آیا ہے:

میں تلاوت کر رہا ہوں رحلِ نسیاں پر تمھیں
تم بھی تسبیحِ فراموشی پہ دہرانا مجھے

....

حامد یزدانی کے تینوں اردو شعری مجموعے "وہ بھی اک خواب رہتا ہے"، "ٹھہری شام کی بیلیں" اور "ہم ابھی رستے میں ہیں" اس حقیقت کے شاہد ہیں اور میرے دعوے پر دلیل کہ ان کے اشعار کے موضوعات کا دائرہ کربِ ذات، معاشرتی ناانصافی، افلاس، طبقاتی تفریق، ثقافتی تغیر، احساسِ بیگانگی، عدم مساوات اور سماجی جبر جیسے موضوعات تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ معاشرہ کو تشکیل دینے والے بنیادی سماجی اداروں یعنی خاندان، مذہب، معیشت، تعلیم، سیاسیات وغیرہ کے وظائف اور ان کی اثر پذیری کو بھی ہم پر تخلیقی انداز میں اجاگر کرتا ہے۔

مثال کے طور پر خاندان، جس میں بچہ اپنی ماں کی گود میں ابتدائی انسانی تربیت حاصل کرتا ہے، بدلتی ہوئی اقدار کے مقابل اپنا وجود بچانے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ بعض نوجوان اپنی امنگوں اور نئی دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے ماں کی آغوش کا حق ادا کرنا ہی بھول جاتے ہیں۔

ہمارے اسلم کولسری کہتے ہیں نا کہ:

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

....

اس لیے کو حامد یزدانی کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

ذرا سے پر نکلتے ہی پرندے بھول جاتے ہیں
انھیں کس ماں نے پالا تھا یہ بچے بھول جاتے ہیں

یا پھر یوں:

وہ بڑھیا راتوں کو سویٹر بنتی تھی
جس کا بیٹا دن بھر سپنے بنتا تھا

....

نئے زمانے کے نئے آدمی نے دیہات کی سادہ زندگی پر شہری زندگی کی ظاہری چکا چوند اور آسائشوں کو ترجیح دینا پسند کیا اور یہ بھول گیا کہ اس زندگی کی قیمت اسے تنہائی اور احساسِ بیگانگی سے ادا کرنا ہوگیا۔ اور نقل مکانی کی صعوبتیں الگ سے۔ اس صورتِ حال کو حامد یوں بیان کرتے ہیں:

میں تنہا پھرتا ہوں شہر کی سڑکوں پہ
سر پہ ایک ستارا تنہا تنہا ہے

گھر سے نکلے تھے پانے کو منزل ترے جمال میں ہم
لیکن آج بھی اَٹے ہوئے ہیں گردِ ملال میں ہم

....

نہ چھت، نہ دیوار تھی فقط در بنا لیے تھے
یہ ہم نے کیسے عجب سے گھر بنا لیے تھے

....

ابھی رختِ سفر باندھا تو آیا دھیان جی میں
کہ ساری عمر ہم کیسے مکانوں میں رہے ہیں

....

منزلوں، منزلوں بیگانہ روی ہے، حامد
ایک رستا بھی نہیں ہے جسے اپنا کہہ لیں

....

شہروں کے تنگ و تاریک مکانات فضائی آلودگی اور تارکول کی سیاہ سڑکوں نے انسان کو اس کے اصل سرسبز ماحول سے کتنا دور کر دیا ہے اس کا احساس بھی ہر صاحبِ دل کو تڑپا کر رکھ دیتا ہے۔ ٹریفک کے بے ہنگم شور میں وہ کبھی کبھی اپنے دل کی یہ پکار ضرور سنتا ہوگا:

چہرے کیا، اِس شور سے سوچیں آلودہ ہیں
آؤ، شہر کی خاطر جنگل ڈھونڈ کے لائیں

....

پکی عمارتوں میں مرا گاؤں کھو گیا
حدِ نگاہ تک کوئی کچا مکاں نہیں

....

اس میں کوئی شک نہیں کہ گلوبل وارمنگ عصرِ حاضر کا ایک ایسا بڑا مسئلہ ہے جس نے بنی نوع

انسان کو کرۂ ارض کے مستقبل کے حوالہ سے فکر مند کر رہا ہے۔ زمین کے بچاؤ کے لیے ضروری ہے کہ اس پر انسان، پیڑ، پودے، پرندے، پہاڑ، پانی سب ایک تناسب سے موجود رہیں کیوں کہ ان کے تال میل سے ہی اس سیارہ پر زندگی کی بقا ممکن ہے۔ ان باتوں کی روشنی میں ذرا یہ اشعار دیکھیے:

یہ مُردہ شہر کا منظر جواب بھی زندہ ہے
ضرور اس میں کہیں پر کوئی پرندہ ہے

....

نوید صبحِ طرب کون دینے آئے گا
کسی شجر پہ پرندہ کوئی تو رہنے دو

....

یہ کیا کہ آج کا دن بھی ہے سُرمئی، حامد
یہ کس نے دھوپ نگر میں دھواں اتار دیا

....

انسانی مسائل گلوبل وارمنگ تک ہی محدود نہیں۔ معاشرتی اور سیاسی نظام کی خرابیوں کی بھی ایک طویل فہرست اس میں شامل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا شاعر اپنے عہد میں عدل و انصاف کی عدم فراہمی پر بھی شکوہ کناں ہے اور اہلِ معاشرہ کو اس ضرورت کی جانب توجہ دینے پر مائل کرتا بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

اربابِ ادب جھوٹ کا بیوپار بکھیریں
ہر سمت، یہ ہر کوچہ و بازار بکھیریں

....

دنیا نہ سہی عدل و مساوات کی قائل
کچھ لوگ تو انصاف کے انوار بکھیریں

اپنے ارد گرد ظلم، زیادتی اور جبر کی کارروائیاں دیکھ کر کوئی بھی سوچنے والا ذہن اور محسوس کرنے والا دل کیونکر متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔ معاشرہ کی بے حسی اور سیاسی، سماجی دباؤ کی چکی میں پسنے والے افراد کی حالت زار دیکھ کر حامد یزدانی کا قلم بھی شمشیرِ احتجاج میں ڈھل جاتا ہے:

اٹھیں گے ایک دن سوال بن کے دوستو
جو سر ڈھلک گئے ردا کے انتظار میں
بپا بھی حشر ہو چکا کہ وقت سو چکا
ہیں لوگ جانے کس صدا کے انتظار میں

....

انصاف کے تقاضوں پر بات کرتے ہوئے وہ محض کسی ایک طبقے کو اس صورت حال کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا بلکہ خود احتسابی کا عمل ہر فرد کے لیے لازم سمجھتا ہے:

قصور وار ہیں سب اعتراف کون کرے
سزا کا فیصلہ اپنے خلاف کون کرے

کھڑی ہے راہ میں کہنہ روایتوں کی فصیل
ہے کس میں حوصلہ، اس میں شگاف کون کرے

....

سماجی اقدار کی تبدیلی کے بارے میں آگاہی بھی عصری سماجی شعور ہی کے زمرے میں آتی ہے۔ نام نہاد ترقی یافتہ معاشروں میں ترقی کے نام پر کم لباسی یا عریانیت کے فیشن کو بھی کچھ لوگ جدید زندگی کا لازمہ قرار دیتے ہیں مگر روایتی

دینی معاشروں میں اس کا تصور بھی شرم ناک ٹھہرتا ہے۔ اس موضوع پر حامد یزدانی کا ایک شعر:

پشتِ حوا بڑھ رہی ہے دورِ ماضی کی طرف
کل پھرے گی دیکھ لینا ایک پتہ اوڑھ کر

....

قدرتی اور سیاسی فضاؤں میں بڑھتی ہوئی آلودگی سے ذرا ہٹ کر دیکھیں تو آج انسانی رشتوں میں بھی منافقت در آئی ہے جو حامد کے دل کو بہت دکھ دیتی ہے۔ اسی لیے تو وہ کہتا ہے:

حامد، اک سے ایک بڑھ کر ہے یہاں بہروپیا
کون پھرتا ہے نہ جانے کس کا چہرا اوڑھ کر

....

ہم اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتے کہ مادی وسائل کی نامناسب تقسیم نے معاشرہ میں جو درجہ بندی قائم کر دی ہے اس نے انسانی زندگی کے حُسن کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نئی معاشی نظام نے امیر کو اور بھی امیر اور مفلس کو مفلس تر بنا دیا ہے۔ اب تو حالات اس ڈگر پر آ گئے ہیں کہ لوگوں کے لیے اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ ایسے میں محنت کش طبقے پر کیا گزر رہی ہے اس صورت حال کا ترجمان ایک دُکھ بھرا شعر ملاحظہ ہو:

ننھے ہاتھوں میں امید کی گڑیا دے کر
اپنی بچی کو سُلاتا ہے کھلونے والا

اور یہ بھی:

اک تازہ مگر سادہ سی خبر، جو شام کے اخباروں میں نہ تھی
سانسوں کے بوجھ سے ہستی کا لرزاں لرزاں پُل ٹوٹ گیا

....

دانا چگنے آئے کبوتر قیدی بن گئے
جال سے باہر بھوک تماشا دیکھ رہی تھی

....

معاشرہ میں عدم تحفظ کا احساس ایک خوف ناک احساس ہے جو ہماری آج کی زندگی اور سوچ کا مستقل حصہ بن چکا ہے۔ لڑائی جھگڑائی، تشدد، منافرت اور لاقانونیت کے ماحول میں نہ کوئی گھر کی چار دیواری میں مکمل محفوظ محسوس کرتا ہے اور نہ باہر۔ یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ کہیں چادر اور چار دیواری کی حرمت کی باتیں ہو رہی ہیں اور کہیں صنفی امتیاز کے خلاف نعرہ زنی ہو رہی ہے مگر عملی طور پر انسان کی ناموس اور اس کا وقار مسلسل مجروح ہو رہا ہے۔ ایسے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک لڑکی جانے کب سے اپنے ہی گھر کی دہلیز پر کھڑی ہے۔ وہ باہر قدم نکالنے سے ڈر رہی ہے، جانے کب سے! اس کیفیت کو حامد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

پھر زندگی دہلیز پہ بیٹھی ہی نہ رہ جائے
یہ سوچ کے وہ گھر سے نکلتی ہی نہیں ہے

....

آج جب ساتھ ساتھ واقع گھروں کے

ملکیں باہم دست و گریباں ہیں، ہمسایہ ممالک ایک دوسرے پر اسلحہ باری کررہے ہیں، ملکوں کے اندر بھی بدانتظامی کا دور دورہ ہے، سیاسی انتقام لیے جا رہے ہیں، ادارے اداروں کے خلاف محاذ آرائی کر رہے ہیں، سیاسی وابستگیاں عدم برداشت کو ہوا دے رہی ہیں، مہنگائی کی طرح فضائی آلودگی بھی آسمان کو چھو رہی ہے، بے روزگاری، تشدد اور جبر جیسے مسائل سانپوں کی طرح پھن پھیلائے ہوئے ہیں۔ ایسے میں ہم دعا ہی کرسکتے ہیں کہ کہیں سے امن وسکوں، رواداری اور تحمل و دانش کی کوئی کرن، کوئی پرندہ نمودار ہو جو ہمارے اس کرۂ ارض کے لیے اچھے مستقبل کا پیام بر ثابت ہو۔ ورنہ زندگی کا کیا ہے! وہ تو ہے ہی ایک سفر سے عبارت۔ ایک خواب سے مشابہ۔ ایک ایسی حقیقت جو خواب نما ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو انسان ایک نئے خواب، ایک نئے سفر کی دہلیز پر کھڑا ہوتا ہے۔ یزدانی جالندھری فرماتے ہیں:

سانس کے قافلے کا رک جانا
ابتدا اک نئے سفر کی ہے

....

اور ہمارے حامد یزدانی کا کہنا ہے:

کہ پھر کانوں میں آغازِ سفر کی گھنٹیاں گونجیں
ابھی تو آئے تھے، دہلیز پر سامان رکھا تھا

....

حامد یزدانی کے اشعار کی منفرد دل کشی کی داد دیتے ہوئے مجھے اپنے اس احساس کا دیانت دارانہ اظہار بھی کرنا ہے اس کے شعروں کی بنت میں کہیں کہیں اس کے سینئر شعرا فیض احمد فیض، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، شہزاد احمد اور خالد احمد کی مصرع سازی کی ارادی یا غیر ارادی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ اپنے سینئر معاصرین سے حامد کی یہ تخلیقی قربت مجھے تو بہت بھلی اور فطری سی محسوس ہوئی۔ ہم سب ادب کے عصری قافلے کا حصہ ہی تو ہیں؛ وہ بھی جو چلتے چلتے ہم سے بچھڑ گئے اور وہ بھی جو اب بھی سرگرم سفر ہیں اور استقامت کے ساتھ اگلے موڑ کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

میں بھی اپنے مضمون کا سفر اسی موڑ پر ختم کرنا چاہوں گا۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہر موڑ سے آگے ایک نیا راستہ ہوسکتا ہے؛ کسی نئی منزل کی جانب رہنمائی کرتا راستہ، کسی دشتِ امکاں کی جانب بلاتا راستہ۔

نت نئے امکانات اپنے دامن میں سمیٹے حامد یزدانی کی شاعری اپنے سفر کے اگلے موڑ پر کس راستے کا انتخاب کرے گی، کیا معلوم! مگر ایک اس بات کا پختہ یقین ہے کہ اس کا تخلیقی سفر اسی شان دار طور جاری و ساری رہے گا۔ ان شاء اللہ

☆☆☆☆☆

شاہی دربار سے دور اپنی کٹیا کا شہزادہ

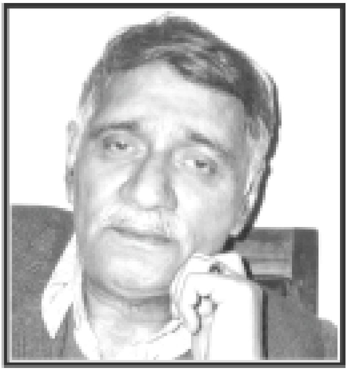

ترقی پسند غزل کے بعد غزل کی نئی روایت نے اپنی تفہیم کے علاحدہ زاویے بھی مرتب کیے اور ان تقاضوں کی تکمیل بھی کی اور یوں جدید غزل نے اپنے ظہور کا جواز نامہ بھی پیش کیا۔ نجیب احمد بھی جدید غزل کے آہنگ دار شاعروں میں شامل ہیں۔ ان کی غزل کا مجموعی مزاج حسنِ توازن کی مثال ہے۔ وہ کسی محدود نظامِ فکر سے زیادہ تفکر کے ایک ارتقائی سفر کی شعری حسیات کے شاعر ہیں۔ وہ اس فکری مدار کے اثر سے باہر ہیں جس کی عکاسی ترقی پسند نظریہ شعر نے کی۔ اس کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ ان کی غزل سماجی فکر کی روشنی سے علاقہ نہیں رکھتی۔ ان کے پہلے مجموعے ''عبارتیں'' سے تادمِ تحریر آخری مجموعے ''گریزاں'' تک نظر ڈالیں تو یہ فکری ارتقا کا تخلیقی عمل نظر آتی ہے۔ یہ شاعری فرد کے داخلی کائنات میں محرومیوں کے گرتے ستاروں سے کائنات کے وسیع منظرنامے میں شاعر کے ذہنی میلانات، اعتقادات اور اپنے سماج کی شکستگی تک ایک باخبر تخلیق کار کا بیانیہ ہے۔ گویا یہ شاعری اپنی خاک اور اپنے ظاہری اور باطنی موسموں سے جڑے ہوئے فرد کی شاعری ہے۔ نجیب احمد کے شعری مزاج کی وضاحت کرتے ہوئے اختر حسین جعفری (مرحوم) نے بڑے پتے کی بات کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک کے معنوی تسلسل میں شعری روایت کی ایک شکل نجیب احمد کو ورثے میں ملی۔ جسے تنقیدی اصطلاح میں نئی عصری کلاسیکیت کہا جاتا ہے۔ نجیب احمد نے غزل کی اس روایت میں خود اپنے عہد

اسحاق وردگ

کی فکری صداقتوں کی آمیزش کار سے مسلسل بیس برس کی ریاضت کے بعد ایک انتہائی خوب صورت شعری طریقِ کار وضع کیا ہے۔ جسے ہم معاصر بڑی شاعری کی بلیغ ترین مثال کے طور پر پیش کرسکتے ہیں“

اختر حسین جعفری کی اس رائے میں کلیدی تصور ”خوب صورت شعری طریق کار“ کی سمت قاری کی رہنمائی کرتا ہے۔ نجیب احمد نے لسانی تشکیلات کے رجحان کے دور میں زبان کے نو کلاسیکی روپ میں نئے رنگوں کے امکانات دریافت کیے۔ یوں لسانی سطح پر نجیب احمد کی غزل مروجہ شعری اسلوب کے نئے امکان کو سامنے لاتی ہے۔ فکری مزاج کے تناظر میں ان کی غزل آگہی کو چھوٹے فکری رویوں میں مرتب کرتی ہوئی، فرد کی حسیات سے شعر کشید کرتی ہے۔ یہ فرد لاسمتیت کے حصار میں اور اپنے عہد کے جبر تلے اپنے اختیار کے کم ہوتے ہوئے دائرے پر حیرت اور سکتے کی کیفیات سے گزر رہا ہے۔ یوں نجیب احمد کی شاعری بیسویں صدی کی سچائیوں کی عکاس ہے۔ جدید غزل کی بنیادی حسیت میں فرد کے باطنی اضطراب اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا اظہار بھی شامل ہے۔ یہ خوف دراصل آزادی سے وابستہ امیدوں کے ٹوٹنے اور نئے نظامِ جبر کا حصہ بننے سے جنم لیتا ہے۔ یہ رویہ ان اشعار میں ملاحظہ کیجیے:

ہر گلے میں طوق ہے، ہر پاؤں میں زنجیر ہے
ہر قدم تیغ رواں کی داستاں ہے سامنے

یہ تہی دست نیند کس کی ہے
کوئی آنکھوں میں دور دور نہیں

ان زمینوں سے بچوں تو آسماں ہے سامنے
میں کدھر بھاگوں کہ سیلِ بے اماں ہے سامنے

دن نکلتے ہی نکل آئے تھے کس کی کھوج میں
شام ڈھلتے ہی چلے آئے ہیں گھر کس کے لیے

یہی دن رات اکثر سوچتا ہوں
میں کیا تھا اور اب کیا ہو گیا ہوں

مجھے بھی چاٹ گئی ریت ان زمینوں کی
کہ میں بھی صورتِ دریا رواں دواں تھا کبھی

باطنی کیفیات اور درونِ ذات کی منظر نگاری نجیب احمد کی غزل کا اہم رویہ ہے اور ان کے ہاں خارجی موضوعات کی سمت پیش قدمی بھی مذکورہ رویے سے شروع ہوتی ہے۔ جن میں ایک اہم رجحان شہری زندگی کی طرف ہونے والی ہجرت کی ناکامی ہے۔ ان کے نظامِ شعر میں ”شہر“ کی علامت پسِ دیوار کی سماجی سچائیوں کا اظہار ہے۔

کہیں کہیں ”شہر“ کی علامت تفکر کا نتیجہ اور کہیں کہیں جذباتی ردِعمل کی مثال بن کر شعریت کی صورت گری کرتی ہے۔ ”شہر“ نجیب احمد کے ہاں حاضر و موجود سے بیزاری کی علامت ہے:

چنگاری کو سورج بنتے دیکھا ہے
انگاروں کو شہر نگلتے دیکھا ہے

....

عمر بھر ساعتِ فرصت کو ترستے دیکھے
کیا عجب لوگ ترے شہر میں بستے دیکھے

....

شہر خاموش ہو گئے کیوں کر
لوگ کس اضطراب سے نکلے

....

ہمارے عکس ترے شہر میں رہے آباد
کہ اس جگہ تو فقط آئنے بدلتے ہیں

....

وحشت سے شہر میں تنہائی کے ڈر سے آئے
شہر میں بھی یہی کھٹکے سے لگے رہتے ہیں

....

''شہر'' نجیب احمد کے تصورِ سماج کے منظرنامے سے بھی وابستہ ہے۔ ''جاگنے کا عمل'' اور اس کی امیجری بھی ان کی غزل میں مسلسل ظہور کرتی ہے۔ جاگنے کی نفسیات کو انھوں نے ایک ذہنی اذیت کے طور پر شعر کا حصہ بنایا ہے۔ ان کی ایک غزل کی ردیف ''جاگتے جاگتے'' مذکورہ جہت کی معنویت کو وسعت دیتی ہے:

آنکھ پتھرا گئی جاگتے جاگتے
ہم کو نیند آ گئی جاگتے جاگتے
خون کی موج بھی درد کی لہر تھی
قصرِ جاں ڈھا گئی جاگتے جاگتے
جسم کی چاپ جاگی تھی پاتال میں
روح پہ چھا گئی جاگتے جاگتے

مجھے اندھی سحر بھائے تو کیوں کر
کہ ساری رات کا جاگا ہوا ہوں

....

ہر اک قندیل بجھتی جا رہی تھی
مگر ہم کو سحر تک جاگنا تھا

....

نجیب احمد کی غزل قومی سانحوں کو بھی اپنے وجود میں جذب کرتی ہے۔ اس تناظر میں ان کی شاعری میں ''خون'' کی علامت جمہوریت کے عظیم سانحے سے فکری رویہ اخذ کرتے ہوئے سماج کے بگڑتے خدوخال کو ظاہر کرتی ہے:

رات فصیلِ شہر میں ایک شگاف کیا ملا
خوں کی اک لکیر سی صبح نظر نظر میں تھی

....

''خون'' کی علامت کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ یہ پھیلتے پھیلتے مزاحمتی طرزِ احساس میں ڈھل کر جمہوریت کی آواز کا روپ دھار لیتی ہے:

ہوا کی انگلیوں سے رس رہا تھا
مری مٹی میں کس کا خوں ملا تھا
وسعتِ افلاک میں رنگِ سحر کھل کر رہا
آدمی کے خون کا کچھ خوں بہا ہونا ہی تھا

....

نجیب احمد کا مزاحمتی شعر احتجاج کی چیخ سے آگے بڑھ کر ضمیر کی صدا کے طور پر سفر کرتا ہے۔ اس موڑ پر ان کے موڈ میں آگہی کی تاثیر بھی محسوس ہوتی ہے یہ رویہ سماج کے عدم تحفظ کی نفسیات اور

رائیگانی کے احساس کا ترجمان ہے:

ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں
ہمارے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے
بنامِ عدل خنجر کے جلو میں
محافظ تخت آرا ہو رہا ہے

....

کتنے محفوظ تھے گلی کوچے
جب فصیلوں پہ چوب دار نہ تھے

....

نجیب احمد کی غزل کئی زمانوں میں سانس لیتی ہے۔ وہ ماضی کو گم شدہ ورثے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ جس کا رشتہ حال سے ٹوٹ چکا ہے۔ ناسٹلجیا حال کے نامہربان موسموں سے پناہ گاہ کے طور پر ان کی غزل کا حصہ ہے۔ ان کی کئی ردیفوں میں تھا۔۔ تھے۔۔ تھی۔۔ کی لفظیات اس رجحان کا اثبات ہیں۔ ''عبارتیں'' میں لگ بھگ پندرہ غزلوں کی ردیفوں میں ماضی کی کیفیات برتی گئی ہیں۔ گویا ان کے شعری مزاج میں ماضی کی سمت پلٹ کر دیکھنے اور اس میں سانس لینے کا عمل اپنے عہد کے احساسِ رائیگانی کا اظہار ہے، جناب احمد ندیم قاسمی نے مذکورہ احساس اور نجیب احمد کی غزل کے تعلق کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

''صنفِ غزل کی جملہ خصوصیات کو نجیب احمد نے نہایت حیرت انگیز ایچ اور انفرادیت سے برتا ہے۔لفظیات بھی وہی ہیں، علامات بھی وہی ہیں مگر جس نفسیاتی واردات کو اس نے اپنے فن میں کھپایا ہے، وہ اس عہد کی واردات ہے جو نجیب احمد کا عہد ہے اور ہم سب کا عہد ہے''

اس پورے عہد کا اجتماعی طرزِ احساس اپنے پس منظر کے ساتھ نجیب احمد کے ہاں موضوع بنا ہے۔ سماج کے احساسِ خودی اور اَنا کو بری طرح مجروح کرنے والے عوامل کے ذکر سے نجیب احمد نے سماج اور شاعری کے رشتے کو بھی معنویت دی ہے۔ ان کے تازہ مجموعے ''گریزاں'' تک سماج کی بدلتی صورت حال اور شعر سے انسلاک کو انھوں نے عمدگی سے نبھایا ہے:

عجب اک معجزہ اس دور میں دیکھا کہ پہلو سے
یدِ بیضا نکلنا تھا مگر کاسہ نکل آیا

....

وہ ہرے دن وہ بھرے موسم تو کب کے جا چکے
ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں اب شجر کس کے لیے

....

اُدھر ظلمت مجسم ہو رہی ہے
مہ و انجم سے خالی آسماں ہوں

....

یکدم کسی نے ریل کی زنجیر کھینچ دی
گاڑی رکی تھی دشت میں ہم بھی اتر گئے

....

جدید غزل کا عروج سماجی زوال کے ملبے سے اٹھا ہے۔ زوال کے زیرِ اثر فرد کے تصورِ زندگی نے بھی کروٹ لی۔ اور یوں زوال پذیر سماج میں زندگی کرنا خانہ پری کے عمل کے طور پر قبول کرلیا گیا۔ نجیب احمد کے ہاں اُن ذہنی پیچیدگیوں کو شعر کے روپ میں دیکھیے:

وہی رشتے، وہی ناتے، وہی غم
بدن سے روح تک اکتا گئی تھی

کس لیے سانس کی زنجیر سے باندھا ہے مجھے
اور کچھ صورت تذلیل نہیں ہو سکتی

....

نہ جانے کس گلی کی دھول اٹھ کر
ہوا کے ساتھ گھر میں آ گئی ہے

....

اکیسویں صدی میں زندگی نے جس طور اور جس رنگ سے کروٹیں بدلی ہیں۔ اور اب سماج اور فرد کی کہانیوں میں جہاں کبھی راستے تھے وہاں اب دیواریں ہیں۔ نجیب احمد کے تازہ مجموعے "گریزاں" میں یہ سارے سانحے آواز میں ڈھلتے ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں انھوں نے پرانے مضامین بھی دہرائے ہیں۔ تاہم انھوں نے ان میں تازگی کا رنگ بھی دکھایا ہے۔ "گریزاں" کی اہم خوبی یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں جمہوریت اور اسٹیبلشمنٹ کی کشمکش نے عام آدمی کی زندگی کو احساس کی سطح پر جو حبس اور گھٹن دی ہے، اس مجموعے میں اس کشمکش کی سچی تصویریں ملتی ہیں:

یہ ہم کن پستیوں میں گر چکے ہیں
کسی کو اس کا اندازہ نہیں کچھ
میں اک اک چیز گروی رکھ چکا ہوں
مرے گھر میں تو اب رکھا نہیں کچھ

....

گرتے لہو نے برسرِ دربار یہ کہا
اس طشت میں تو شاہ کا سر ہونا چاہیے

....

کبھی خود سے متاثر ہو رہے ہیں
یہاں ہر شخص ہے اپنے اثر میں

کوئی سنتا ہی نہیں، کوئی سمجھتا ہی نہیں
گھر میں بھی مجمعِ اغیار لگا رہتا ہے

....

یہ کس ماں کی رگوں میں بہہ رہا تھا
یہ کس کا خون بکھرا ہے ڈگر میں

....

اگر سازش کی برفیلی ہوائیں ہی رواں ٹھہری
قوی امکان ہے اس شہر کے نابود ہونے کا

....

کون ترتیبِ زماں روز بدل دیتا ہے
پھر سے دربان مرے، تخت پہ آ بیٹھے ہیں

....

نجیب احمد کا نظامِ شعر اس شہر کے نابود ہونے کے خوف میں مبتلا سماج سے وجود میں آیا ہے۔ وہ سماج کے خواب کدے میں تعبیر کے دیے جلانے والے شعر قبیلے میں شامل ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری کے زاویے آگہی کے منظرنامے تخلیق کرتے ہیں۔ نجیب احمد مشینی زندگی کے بڑھتے ہوئے اثرات پر اُداس ہیں۔ لیکن مایوس نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کی قرأت کے دوران میں بار بار روشنی ہم سفر بنتی ہے۔ یہ روشنی نجیب احمد کی ذات سے شعر کے روپ میں نکلتی ہوئی اپنے خارج کے فرد اور سماج کے ٹوٹے تعلق کو دوبارہ سے جوڑتی ہے۔ تاکہ فرد کا زندگی پر اعتماد بحال ہو اور تازگی کا احساس گھٹن زدہ معاشرے میں جمود کو توڑ سکے۔

☆☆☆☆☆

فکری توسن طبع......اور ڈاکٹر نثار ترابی

میں میت ریت کے راول میں سانس لیتا ہوں
یہ میرا رنگِ روانی سواں* سے ملتا ہے

....

یہ شعر شعری مجموعہ ''ہر صدا مسافر ہے'' کے خالق معروف شاعر ڈاکٹر نثار ترابی کا ہے، جن کا غزلیہ مجموعہ 2004 میں شائع ہوا تھا، جب کوئی لکھاری اپنا تعارف اتنی خوب صورتی سے کسی سے مشابہ صورت کروا دے تو پھر کئی پرتیں اس شخصیت کی عقدے کشا کرنے لگتی ہیں، احوال حال صورت بات کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ تہذیب وتمدن ہر انسان کی اساس ہوتا ہے۔ وہ آب وہوا اور موسموں کی ترنگ میں رنگا جاتا ہے، چاک سے اُترنے کے بعد اس کے اپنے نقوش الگ سے پہچان کی سعی کرنے لگتے ہیں۔

ایسے میں زمانے کی ہَوا کے مقابل اپنی سوچ اور فکر کے چراغ رکھنے کی اٹھان جنوں خیزی میں ڈھلنے لگتی ہے تو پھر اس کی ذات کا ادراک اس دن کی پہچان بن جاتا ہے۔ جیسے کہ نثار ترابی اپنے پہچان آپ رکھتے ہیں، جو کئی کتب کے خالق ہیں، ان کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو غزل کے عصری رویے'' کے عنوان سے تھا، وہ ایک کہنہ مشق مزاج رکھتے ہیں، انھوں نے کئی ادبی حوالوں سے اپنی اردو اور پنجابی میں پہچان بنائی، جنھوں نے پنجابی ماہیے کی صنف کو اردو میں ''بارات گلابوں کی'' کے نام سے متعارف کروا کے ایک نیا حوالہ رقم کیا۔ جب کہ پنجابی شعری مجموعہ ''اپنی چھاں دا سیک'' بھی داد وصول کیے

پروین سجل

* سواں: راول پنڈی سے گزرنے والا دریا۔

عرصہ ہو چکا۔ پھر ایک اور اہم کام ”تخلیق اور تحقیق زاویے“ جو مختلف ادبی مشاہیر کے متعلق مضامین پر مشتمل ایک نثری کاوش ہے۔ ان کے لکھے یہ مضامین بڑے عرق ریز اور سیر حاصل اہمیت کے حامل ہیں جو ادبی تحقیق میں اپنا تراز ور کھتے ہیں۔

آج ایک نئے شعری مجموعے ”خوشبو آواز دیتی ہے“ کی مہک نے اپنے حصار میں اطراف کو لے رکھا ہے تو کئی گلستاں اپنی اپنی داستاں لیے سراحالت دکھائی دیتے ہیں، جس میں روز وشب کی تھکن کے ساتھ مشاہدات اور تجربات کی بھٹی نے بھی اپنا کام خوب کیا...... کیا کیا نکات اور جہات پہلو کشا ہیں ان کی اپنی ایک آواز اور دنیا ہے۔ جب کہ شاعر کی حقیقت پسند طبع دیکھیے کیا کہتی ہے:

گھسیٹتے ہی چلے ہیں حیات پکھی واس
گزار دیں گے کہیں پر بھی رات پکھی واس
ابھی تو کاٹ رہے ہیں زمیں پہ قیدِ حیات
کریں گے پار بھی یہ پُل صراط پکھی واس

....

مذکورہ اشعار نے کیسے انسانی حیات کی اصل کو آئینے کے سامنے رکھ دیا ہے، پکھی واس کی تشبیہ نے ذات کو ایسے عیاں کیا جیسے انسان کی تخلیق کی بنیاد ایک لوتھڑے پر منحصر ہے جو اس کی ساری اکڑ فوں کو پانی پانی کرنے کے مترادف ہے۔ یہ قرآنی حوالہ جس سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں، پھر پُل صراط کا قرآنی تلمیحی حوالہ مزید حیات کی حقیقت کو بیان کرتا ہے جو ایک ترازو کی مثال صورت بھی ہے۔

”خوشبو آواز دیتی ہے“ کا استعارہ جو آفاقی خیال آرائی کو مہمیز کرتا ہے، جو بانگِ درا صورت اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ خوشبو مجاز اور حقیقی کے حجاب سرکاتا ہے، پھر اس خوشبو رسائی میں اِس عمر سے اُس پار کون جائے، اس کی چاپ دل دھڑکن پر کون رکھے، یہ نثار ترابی جیسی گیانی طبع کا خاصا ہے، انھوں نے اس خوشبو کو دل وجاں میں حلول کیا اور پھر اس احساس وجذبے کو ایک نام دے کر اس بلیغ استعارے کو اپنی سخن آرائی کی زینت بنایا اور اپنے اطراف کو لطیف احساس سے معطر کیا۔ جب کہ ویسے حقیقت ہے، جتنا آساں ہم اسے سمجھتے ہیں ایسا نہیں ہے مولانا حافظ شیرازی نے کیا خوب کہا:

بداں کمر نرسد دستِ ہر گدا حافظ
خزینہ بکف آور گنج قاروں بیش

ترجمہ: اے حافظ اس کی کمر تک ہر فقیر کا ہاتھ نہیں پہنچتا ہے۔ قاروں کے خزانے سے بڑا خزانہ حاصل کر۔“

اس بات سے مفر نہیں کہ عناصرِ فطرت میں ربط وباہم اپنے اپنے دائرہ کار میں تکمیل کی شکل اختیار کرتی جاتی ہے۔ یہ مختلف انواع اپنی جداگانہ حیثیت رکھنے کے باوجود ایک اکائی کی

صورت دکھائی دیتی ہے، اسی طرح جب کوئی خیال اپنی کونپل کو سر اٹھاتا ہے تو اپنی ذات میں مکمل حواس کا سانچہ لیے ہوتا ہے۔ ’’خوشبو آواز دیتی ہے‘‘ کے شاعر نے بھی اپنے گمان و خیال کی آرائش میں ایک کڑی ڈور تھامے رکھی جس میں یہ شبنمی تراوٹ سے بھرے پھول پروے گئے، جن کے ساتھ کانٹوں کا ہونا ایک فطری تقاضہ ہے۔ جس باعث معاشرتی درجہ بندی اور انسانی رویے بھی کڑوے گھونٹ کی طرح ہیں، یہی گھونٹ جن کو میسر آیا وہ حیات جاوداں میں ڈھل گئے۔

غزل ہو یا دیگر ادبی سخن، ان کی اثر آفرینی اسی میں ہے کہ اس پر ممکنہ حد تک دسترس ہو اس کے صنائع بدائع اور دیگر محاسن کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے کیوں کہ ہر شے اپنے اپنے سانچے میں ڈھل کر ہی گلدستہ بنتی ہے، آج کی یک رنگی میں وہ فکری گہرائی اور گیرائی کا احساس کم کم دکھائی دیتا ہے...... کیوں کہ جتنی تیزی سے ٹی وی سکرین بدل رہی ہے خیال تک رسائی کا آنچل پہلے ہی سرک چکا ہوتا ہے۔ تو ایسے میں ’’خوشبو آواز دیتی ہے‘‘ کا احساس کہاں جاں گزیں ہوگا۔ یہ عنایت بھی نسبت سے ہما آور ہوتی ہے۔ آیئے یہ اشعار دیکھئے، بحر مضارع، مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن۔

اک دشت میں غزال نے زم زم سخن کیا
خوش رو و خوش جمال نے چھم چھم سخن کیا

شاہِ نجف نے اس پہ عنایت اُتار دی
جب بھی کسی ملنگ نے دم دم سخن کیا

....

ڈاکٹر نثار ترابی کے یہ اشعار بھی دیکھئے، جو نیکی کر دریا میں بہانے کے مترادف ہے۔ کیا خوب سہولت اور رواں سلاست سے کہے ہیں اور ردیف قافیے میں اپنا معیار رکھے ہوئے نا کہ صرف قافیہ پیمائی میں سرگردانی کی۔ بحر مجتث، مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن۔

بہا رہا تھا کوئی پھول خشک دریا میں
وہ ایک شخص جو پانی میں چل کے آیا تھا

تلاشِ روح کی محنت بھی رائگاں ہی گئی
بدن بھی شکل پرانی میں چل کے آیا تھا

....

شاعری ہو یا فکشن، ناول ہو یا افسانہ کوئی بھی صنف ہو، اس کی فکر رسائی ہی اصل اثاثہ ہے ورنہ وقتی واہ واہ تو پھر چلتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایک شاعر اپنی آنے والی نسل کو کیا دے رہا ہے، آج کا لکھاری تنگی حالات کے ساتھ مشکل سے سمجھوتا کرتا ہے، فکر معاش اس کے قوت تخیل پر حاوی رہتا ہے، لیکن اس نے خود بھی یہ راہ اختیار کر رکھی ہے۔ ورنہ ادب تو وہ تحیر مزاج ہے جس

میں گوناگوں رنگوں کی آمیزش ہے، پھر اس میں سب سے اہم بات کہ شاعری میں جو فلسفہ، منطق کی ہمہ گیریت پائی جاتی ہے اور یہی بات دوام بخش ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی رومی، حافظ، خسرو، غالب اور اقبال اور فیض جیسے زندہ ہیں۔

کسی نے کیا خوب تجزیہ شاعری، فلسفہ اور سائنس کے ضمن میں دیا: ''حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اور شاعری میں قوت تخیل کی یکساں ضرورت ہے۔ یہی قوت تخیل ہے جو ایک طرف فلسفہ میں ایجاد اور انکشافِ مسائل کا کام دیتی ہے اور دوسری طرف شاعری میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے، چونکہ اکثر سائنس دان شاعری کا مذاق نہیں رکھتے اور شعرا فلسفہ اور سائنس سے نامانوس ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ قوت تخیل کو فلسفہ اور سائنس سے تعلق نہیں، لیکن یہ صحیح نہیں، بلاشبہ عام سائنس یا فلسفہ جاننے والے جن میں قوت ایجاد نہیں قوت تخیل نہیں رکھتے، لیکن جو لوگ کسی مسئلہ یا فن کے موجد ہیں ان کی قوت تخیل سے کون انکار کرسکتا ہے۔ نیوٹن اور ارسطو میں اسی قدر زبردست قوتِ تخیل تھی جس قدر ہومر اور فردوسی میں، البتہ دونوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں اور دونوں کی قوتِ تخیل کے استعمال کا طریقہ الگ الگ ہے۔ فلسفہ اور سائنس میں قوت تخیل کا استعمال اس غرض سے ہوتا ہے کہ ایک علمی مسئلہ حل کردیا جائے۔ لیکن شاعری میں تخیل سے یہ کام لیا جاتا ہے کہ جذبات انسانی کو تحریک ہو۔ فلسفی کو صرف ان موجودات سے غرض ہے جو واقع میں موجود ہیں۔ بخلاف اس کے شاعران موجودات سے بھی کام لیتا ہے جو مطلق موجود نہیں ہوتے، فلسفہ کے دربار میں، ہما، سیمرغ، گاوِ زمین، تختِ سلیمان کی مطلق قدر نہیں، لیکن یہی چیزیں ایوان شاعری کے نقش و نگار ہیں۔ فلسفی کی زبان سے اگر سیمرغ زریں پر کا لفظ نکل جائے تو ہر طرف سے ثبوت کا مطالبہ ہوگا، لیکن شاعر اس قسم کی فرضی مخلوقات سے اپنا عالمِ خیال آباد کرتا ہے اور کوئی اس سے ثبوت کا طالب نہیں ہوتا، کیونکہ فلاسفر کی طرح وہ کسی مسئلہ کی تعلیم کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ وہ ہم کو صرف خوش کرنا چاہتا ہے اور بلاشبہ وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے۔''

مذکورہ فکر انگیز پہلو کو دیکھیں، تو آج جہاں شاعری ایک اخبار کی خبر صورت بن کے رہ گئی، ظاہر ہے جب کسی فکری اپچ کو کوہ ہمالہ جانا جائے گا، جب ذہن میں مشاعرے کی تالیوں کی گونج رہے گی وہاں، تلمیحات، تشبیہات اور استعارات کو بھاری بھرکم جانا جائے گا، وہاں ابہام کو عیب سمجھا جائے گا،

کیوں کہ سامنے بات جو پلیٹ میں رکھی نظر آئے وہی اچھی لگے گی، اب تو جدیدیت کے نام پر لسانی پہلو بدل چکے ہیں بہر کیف ''خوشبو آواز دیتی ہے'' کے شاعر یہ اشعار اسی دکھ اسی کیفیت کی ترجمانی کرتے دکھائی دیتے ہیں:

کیا سوچ کے یہ نسل کرے فخر کہ جس کے
ریشم تو کجا، ترکے میں شیشم بھی نہیں ہے

دربار کا دربار قصیدے میں لگا ہے
حالاں کہ شہِ والا تو برہم بھی نہیں ہے

....

لان جائی نس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس کا نظریہ ادب ارسطو اور افلاطون سے مختلف سوال لیے ہوئے ہے۔ وہ ارفع ادب کی تکون کچھ اس طرح متعین کرتا ہے کہ: ''گہرائی، بلندی اور وسعت سے عظمت پیدا ہوتی ہے، گہرائی جذبات کے ذریعے، بلندی خیالات کے ذریعے اور وسعت زبان و بیان کی صناعیوں سے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ادب میں ارفعیت کی عمارت کی بنیاد جذبات ہیں، بلند دیواریں عظمتِ خیال ہے، اور احاطے کی وسعت یا رقبہ اظہار و بیان کی قوت و صلاحیت ہے۔ (مغربی تنقید کا مطالعہ۔ افلاطون سے ایلیٹ تک'' عابد صدیق)

'' خوشبو آواز دیتی ہے'' میں شاعر کا مغربی نقاد لان جائی نس کی تکون کے مطابق ہونا ضروری نہیں، کیوں کہ شاعر کے ہاں اپنی خیال آرائی ہے، جو اس کے رہن سہن اور معاشرتی اطوار کی عکاسی کرتی ہیں، وہ اپنے انسانی رویوں کی بات کرتا ہے، اس کے ہاں مستعار نہیں، نہ ہی توارد محسوس ہوتا ہے۔ بل کہ نثار ترابی کے ہاں..... اپنی فکری توسنِ طبع کا جہان ہے جہاں وہ محوِ پرواز ہے، کسی ابہام کے بنا یہ شاعری جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی دکھائی دیتی ہے، اس مجموعے میں زبان و بیاں اور مضامیں کو سہل انداز اور عمدگی سے باندھا گیا ہے، ابہام کے ضمن میں کیا خوب معروف شاعر جو کئی کتب کے خالق نسیمِ سحر صاحب کہتے ہیں:

تخلیق کا ابلاغ بھی لازم سہی، لیکن
تھوڑا سا ضروری بھی ہے ابہام کا عالم

جب کہ ''خوشبو آواز دیتی ہے'' کے پیچھے پیچھے بھاگنا ایسے ہی جاں جوکھم میں ڈالنے والی بات ہے، ایسے کون اپنی سانس بحال رکھنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو۔ بہر حال ادب کے قاری کا حوصلہ آزماتے ہیں وہ اس خوشبو کو کیسے اپنی مٹھی میں رکھنے کی سعی کرتا ہے، آخر میں مرزا غالب کے تعلیانہ شعر کے ساتھ اجازت:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

☆☆☆☆☆

انتظار حسین: اردو ادب کی نامور شخصیت

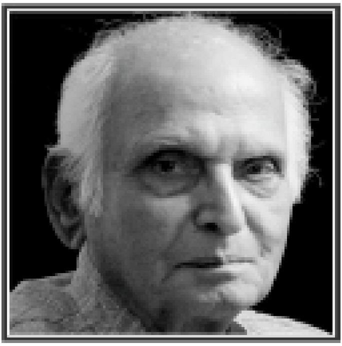

انتظار حسین اُردو ادب کی نامور شخصیت کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، تنقید نگار اور کالم نگار کے طور پر شناخت رکھتے ہیں۔ اُردو کے افسانوی ادب میں وہ اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں میں علامتی اور استعاراتی انداز کو اختیار کیا اور اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے دنیائے ادب میں عزت و شہرت حاصل کی۔

انتظار حسین 7 دسمبر 1925 کو ڈبائی ضلع بلند شہر میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ لاہور تشریف لائے اور جامعہ پنجاب سے ایم اے اردو کیا اور شعبہ صحافت سے وابستہ ہوئے۔ انتظار حسین کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گلی کوچے'' 1953 میں شائع ہوا۔ اُن کی دو کتابوں ''بستی'' اور ''خالی پنجرہ'' کا فارسی زبان میں بھی ترجمہ ہوا، جو سمیرا گیلانی نے کیا تھا۔ انتظار حسین کے کالم ایک طویل عرصہ تک روزنامہ ''مشرق'' میں ''لاہور نامہ'' کے عنوان سے شائع ہوتے رہے بعد ازاں انھوں نے روزنامہ ''جنگ'' میں کالم لکھے ۔ اُنھوں نے انگریزی زبان میں بھی کالم لکھے اُن کی دیگر کتابوں میں ناول ''آگے سمندر، بستی، چاند گہن اور ناولٹ ''دن'' شامل ہیں جب کہ

محمد نوید مرزا

افسانوی مجموعوں میں آخری آدمی، خالی پنجرہ، خیمے سے دور، شہرِ افسوس، کچھوے، کنکرے اور گلی کوچے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آپ بیتی ''چراغوں کا دھواں اور ''دلّی تھا جس کا نام، جل گرجے (داستان) اور تنقیدی کتاب ''نظریے سے آگے'' بھی شائع ہوئیں۔ انتظار حسین کے لکھے ہوئے ڈرامے پی ٹی وی سے نشر ہوتے رہے اور بعد ازاں کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ ڈراموں کی ان کتابوں میں ''خوابوں کے مسافر''، ''درد کی دوا کیا ہے'' نفرت کے پردے میں'' اور ''پانی کے قیدی'' شامل ہیں۔ انتظار حسین کو اُن کی علمی وادبی خدمات کے اعتراض میں بہت سے اعزازات سے نوازا گیا اُنھیں حکومت پاکستان کی طرف سے ستارۂ امتیاز اور اکادمی ادبیات کی طرف سے کمالِ فن ایوارڈ بھی عطا ہوا تھا۔ وہ پاکستان کے پہلے ادیب تھے جن کا نام مین بکر پرائز کے لیے ادیبوں کی فہرست میں شامل ہوا تھا۔ حکومت فرانس کی طرف سے بھی اُنھیں افیر آف آرڈر آف آرٹس کا اعزاز ملا۔

انتظار حسین بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے اُنھوں نے ناول، افسانہ، تنقید اور کالم نگاری میں یکساں طور پر خود کو منوایا وہ جب تک زندہ رہے ادب سے جڑے رہے۔ پاک ٹی ہاؤس میں اپنی مخصوص نشست میں اُن کی موجودگی بہت سے لوگوں کے لیے باعث مسرت اور ایک اعزاز ہوتا تھا۔ اُنھیں اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کو سحر میں جکڑ لینے کا فن آتا تھا وہ عام قاری کے لیے قدرے مشکل پسند ادیب تھے تاہم ادب کا سنجیدہ قاری اُن کے فن کی گہرائیوں تک پہنچ سکتا تھا اُن کے افسانوں کو داستانوی ادب کی بہترین مثال کے سمجھا جاتا تھا۔ بقول ذوالفقار احسن، ''داستانوی ادب کے ایک آخری افسانہ نگار انتظار حسین تھے جنھوں نے قدیم داستانوی ادب کو اپنے افسانوں میں زندہ رکھا، وہ قدیم داستانوی ادب کے ایسے پاس دار تھے جنھوں نے اساطیر کو متروک نہیں ہونے دیا۔ زمانہ جدید میں اُنھوں نے اس روایت کو کسی نہ کسی طور اپنائے رکھا۔ وہ بڑے پختہ کار اور تجربہ کار افسانہ نگار تھے۔ کہانیاں اُن کے اندر سے پھوٹتی تھیں اُن کی لکھی ہوئی کہانیاں قاری کو پوری طرح

اپنی گرفت میں لے لیتی تھیں۔"
انتظار حسین جب تک زندہ رہے، شہر لاہور میں مرکزِ توجہ رہے لوگ اُن سے مل کر فخر محسوس کرتے تھے۔ 2 فروری 2016 کو جب اُن کا انتقال ہوا تو اُن کے جنازے میں پورا شہر اُمڈ آیا۔ اُنھوں نے طویل عمر پائی 91 برس کی عمر پانے والی اس عظیم شخصیت نے تمام عمر بڑے وقار کے ساتھ گذاری اور علمی ادبی حوالوں سے دُنیائے ادب کی بڑی بڑی شخصیات سے اُن کی ملاقاتیں رہیں۔ انتظار حسین کی تخلیقات بڑے بڑے اداروں سے شائع ہوئیں اور اُن کی تحریریں آج بھی ادب کے طالب علموں میں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں وہ عام قاری کی سمجھ میں آنے والے ادیب نہیں تھے بلکہ ایک مخصوص طبقہ ہی اُن کی لکھی ہوئی تحریروں سے فیض یاب ہوتا رہا ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ بقول عقیل حسین جعفری، "انتظار حسین اُردو افسانے کا ایک معتبر نام ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اسلوب، بدلتے لہجوں اور کرافٹنگ کے باعث آج بھی پیش منظر کے افسانہ نگاروں کے لیے بڑا چیلنج ہے۔ اُن کی اہمیت یوں بھی ہے کہ اُنھوں نے داستانوی فضا۔ اس کی کردار نگاری اور اسلوب کا اپنے عصری تقاضوں کے تحت برتا ہے، اُن کی تحریروں کی فضا ماضی کی داستانوں کی بازگشت ہے۔"
اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ انتظار حسین اپنی طرز کے ایک منفرد اور غیر معمولی ادیب تھے، جن کی تحریروں میں چھپی معنویت تک پہنچنے کے لیے ذہنی جست لگانی پڑتی ہے بقول گوپی چند نارنگ، "انتظار حسین کا یہ کارنامہ معمولی نہیں کہ اُنھوں نے افسانے کی مغربی ہیئت کو جُوں کا توں قبول نہیں کیا۔ بل کہ کتھا کہانی اور داستان وحکایت کے جو مقامی سانچے مشرقی خراج عامہ اور افتاد ذہنی صدیوں کے عمل کا نتیجہ تھے اور مغربی اثرات کی یورش نے جنھیں رد کر دیا تھا۔ انتظار حسین نے اُن کی دانش وحکمت کے جوہر کو گرفت میں لے لیا اور اُن کی مدد سے مروج سانچوں کی تقلیب کر کے افسانے کو ایک نئی شکل اور نیا ذائقہ دیا۔"

☆☆☆☆☆

نوے گبرئیل کی تین نظمیں

علی حسن اویس

پچھلے دسمبر کی بات ہے، شام کا وقت تھا اور ناصر باغ میں ہلکا ہلکا کہرا چھایا ہوا تھا۔ اصغر ندیم سید کا ناول ''دشتِ امکاں'' پڑھتے پڑھتے ایسا مگن ہوا کہ خیالوں کے گھوڑے دوڑاتے دوڑاتے فرانس جا پہنچا، پیرس کے قہوہ خانوں کا منظر آتے ہی فرانس میں مقیم دوست کی یاد آئی، جھٹ فون نکالا اور دوست کو میسج کیا ''بھئی ناصر باغ میں بیٹھا ہوں اور تجھے یاد کر رہا ہوں''، شاید میسج پہنچے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے کال کی اور ہم لگے گپیں ہانکنے۔ باتوں باتوں میں اس نے ذکر کیا کہ ''فرانس کا ایک شاعر ہے جس کی حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے، سوشل میڈیا کی دنیا سے یکسر کٹا ہوا ہے، ایک قہوہ خانے میں اس سے ملاقات ہوئی، اس نے میرا ادبی ذوق بھانپتے ہی بیگ کھولا، کتاب نکالی اور مجھے تھماتے ہوئے کہا اگر پسند آئے تو ایک چائے میرے ساتھ ضرور پینا''

دوست نے بتایا کہ دو تین ہفتے وہ کتاب کو نہ دیکھ پایا، ایک شام جب فضا بوجھل تھی اور معمول کی زندگی سے اکتاہٹ عروج پر، خیال آیا کہ اس شاعر کی کتاب کو دیکھنا چاہیے، شاید شام گزارنے کو کوئی ڈھنگ کی نظم ہاتھ لگ جائے۔ کتاب ٹیبل پر سے اُٹھائی، سرورق پر نیم عریاں دوشیزہ کی ایسی مصوری ہے جس سے جنسی شہوت کے بجائے حسی تسکین ملتی ہے، کتاب کا عنوان ''نامانوس مانوسیت'' اور شاعر کا نام لکھا ہے ''نوے گبرئیل'' دوست نے بتایا کہ ایک آدھ گھنٹے کی مغز ماری کے بعد اس نے زیادہ تر نظموں کو سطحی اور ادبی لطافت سے

عاری پایا۔ البتہ دو تین نظموں نے دیر تک
اچنبھے میں ڈالے رکھا۔ شاید یہی اچنبھا تھا
جس نے اسے مجبور کیا کہ وہ ان نظموں کا
بیشتر حصہ انگریزی میں ترجمہ کر ڈالے۔ یہ
بات سنتا تھا کہ میں نے (جسے انگریزی اور
اردو تراجم کے توسط سے نئے نئے متون تک
رسائی ہوتی ہے) تراجم بھیجنے کو کہا۔ آپ کے
ذوق کی تسکین کے لیے انگریزی تراجم کا اردو
ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ (یہ نظموں کے کچھ
تراشے ہیں، ممکن ہے خلا کا احساس ہو اور
اُدھوری داستان سے اکتاہٹ در آئے)

(1)

ہاتھ کی لکیروں میں
دریا رک گئے ہیں
چہرے کے آئینے میں
عکس چلو بھر پانی ہو گیا ہے
یہ سب ہونا
بے حسی نہیں ہے
بلکہ حواس کی ایک ایسی قوس قزح ہے
جو سفید ہو چکی ہے

(2)

رات کے ہونٹوں پر پگھلتا ہے لال ریشم
چپکتی ہے عرق کی خوشبو دیواروں سے
یہ وحشت نہیں، فقط ایک سوال ہے بدن کا
کون سا نصف ہے زیادہ برہنہ — وہ
جو عیاں ہے
یا وہ
جو پنہاں ہے؟

(3)

رات اپنی سیاہی میں ڈوبتی ہے گہرائیوں تک
اور ہاتھ چھوتے ہیں وہ مقام جہاں الفاظ ختم ہوتے ہیں
یہ رسائی نہیں، فقط ایک سوال ہے
ایک غیر معلوم جغرافیہ کی دریافت کی مانند
جسم — زمان و مکان کا وہ قطعہ ارض
جہاں رقص کرتی ہیں یادوں کی شاخیں
ہر مسّے میں دھڑکتا ہے ایک الگ وقت
ہر سانس میں سلگتی ہے ایک نئی تاریخ

☆☆☆☆☆

عورت

عورت ربِ لم یزل کا وہ حسین شاہکار ہے جس کے وجود میں ایک پوری داستان پوشیدہ ہے۔ آپ جس لمحے بھی، جس زاویے سے بھی عورت کے وجود پر غور کریں، ہر بار ایک نئی سوچ، نیا ولولہ اور نیا مفہوم سامنے آتا ہے۔ عورت دنیا کی سب سے زیادہ کشش رکھنے والی تخلیق ہے۔ خدا نے اس کے وجود میں ایسی دلکشی رکھ دی ہے جو نہ صرف رنگ و روپ سے ماورا ہے بل کہ اس کی خوبیاں دلوں کو مسخر کر لیتی ہیں۔ جس دل نے عورت کو قبول کر لیا، اس کے لیے عورت خود بخود خوب صورت ہو جاتی ہے۔

عورت کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے، جیسے عورت، زن، نساء وغیرہ، مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ بیشتر زبانوں میں عورت کے لفظ کے معنی "چھپانے" سے جڑے ہوئے ہیں۔ یعنی ایسی ہستی جسے تحفظ میں رکھا جائے۔ بعض مقامات پر عورت کو کمزوری کے معنی میں بھی لیا جاتا ہے، مگر میرے نزدیک کمزوری سے مراد وہ نازک شے ہے جسے سنبھال کر رکھا جائے، نہ کہ حقیر سمجھا جائے، جو چیز نازک ہو، اسے چھپایا اور محفوظ کیا جاتا ہے — یہ کمزوری نہیں، نزاکت ہے۔

میرے نزدیک عورت کی تخلیق کا مقصد کائنات کو خوب صورتی عطا کرنا تھا اور ساتھ ہی مرد کو ایک ایسی رفیقِ حیات دینا جو سکونِ قلب بھی ہو اور تسلسلِ حیات کا سبب بھی مگر افسوس کہ ہم عورت کی اصل حیثیت اور اس کے حقیقی مقصد سے ناآشنا ہیں۔

علامہ اقبال نے عورت کو کائنات کی رنگینی قرار دیا اور ان کے اشعار میں بھی ایک گہرا شعور پوشیدہ ہے:

نعمان حیدر حامی

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

....

فریڈرک نطشے، انیسویں صدی کا جرمن فلسفی، شاعر اور ثقافتی نقاد، عورت کو خدا کی ''دوسری غلطی'' قرار دیتا تھا مگر تاریخ کا دلچسپ تضاد یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے آخری گیارہ سال دو عورتوں کے سہارے گزارے۔ خود کو طاقت کا پیامبر کہنے والا یہ شخص، عورت کو کمزور اور محتاج سمجھتا تھا، مگر عمر کے آخری حصے میں خود بے بس ہو کر عورت ہی کا محتاج بن گیا۔
سن 1889 میں تورین کی ایک گلی میں گھوڑے پر ظلم ہوتے دیکھ کر نطشے گھوڑے سے لپٹ کر رو پڑا اور اسی لمحے اس کی ذہنی حالت بگڑ گئی۔ وہ فالج کا شکار ہو گیا اور زندگی بھر صحت یاب نہ ہو سکا۔ ڈاکٹروں نے صاف کہا کہ اگر اسے زندہ رکھنا ہے تو دو عورتوں کی مسلسل دیکھ بھال ضروری ہوگی۔ یوں وہی عورت، جسے وہ کمزور کہتا تھا، اس کی زندگی کی ضامن بن گئی۔
آخر کار 1900 میں وہ اس خدا کے حضور چلا گیا جسے وہ اپنی فلسفۂ حیات میں ''مردہ خدا'' کہتا تھا۔
یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ عورت نہ صرف مرد کی زندگی کی ضرورت ہے بل کہ کائنات کے وجود کے لیے بھی لازم و ملزوم ہے۔ شاعری ہو، ناول ہو، محبت ہو یا حسن — انسانی تہذیب کی تقریباً ہر خوب صورت چیز عورت کے وجود سے جڑی ہوئی ہے۔ بل کہ خود انسان کا وجود بھی ایک عورت کا مرہونِ منت ہے۔
عورت معاشرے میں وہ کردار ادا کر سکتی ہے جو شاید مرد کے نصیب میں بھی نہ ہو۔ وہ نسلیں سنوار بھی سکتی ہے اور بگاڑ بھی سکتی ہے۔ اگر عورت کو معاشرے کی استاد کہا جائے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ تاریخ اس کی گواہ ہے۔
میرے نزدیک عورت ایک مقدس ہستی ہے، مگر المیہ یہ ہے کہ ہم نے اسے صرف جسم تک محدود کر دیا ہے۔ اگر عورت فحاشی کے بازار میں کھڑی ہے تو سوال یہ نہیں کہ وہ وہاں کیوں ہے، بل کہ سوال یہ ہے کہ ہم اس بازار کے گاہک کیوں بنتے ہیں؟ ہم اس کی عصمت کے خریدار کیوں بنتے ہیں؟ اگر معاشرہ چاہے تو پابندی، رہنمائی اور ہمدردی کے ذریعے اسے عزت کی راہ دکھا سکتا ہے، مگر ہم ایسا کرنا نہیں چاہتے۔
جب بھی عزت کا سوال آتا ہے، اس کا بوجھ ہمیشہ عورت کے کندھوں پر ڈال دیا جاتا

ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے؟

کہا جاتا ہے کہ اگر مرد اور عورت کے مقدر کے ستارے مل جائیں تو خدا کے سوا کوئی انہیں جدا نہیں کر سکتا، کیونکہ محبت دلوں کی قبولیت کا نام ہے۔

مشہور کولمبین مصنف گابریئل گارشیا مارکیز اپنی زندگی کے آخری حصے میں ڈیمنشیا کا شکار ہو گئے تھے۔ ایک دن ان کی اہلیہ نے ان سے پوچھا: "کیا تم جانتے ہو میں کون ہوں؟" مارکیز نے جواب دیا: "میں یہ نہیں جانتا کہ تم کون ہو، مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔"

عورت دراصل محبت کا دوسرا نام ہے۔ مگر یہ اعزاز ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا۔

اللہ نے عورت میں عقل بھی رکھی ہے اور عشق بھی، اور مرد میں بھی یہی دونوں عناصر رکھے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ عورت اپنی عقل سے خود کو سنبھال لیتی ہے۔ شاید اسی لیے تاریخ میں عورت کی محبت میں خودکشی کی مثالیں کم ملتی ہیں، جبکہ مرد اس معاملے میں کمزور ثابت ہوتا ہے۔

یقیناً عورت ایک بہادر، مضبوط اور فطری لیڈر ہے، مگر معاشرتی بے توجہی اور نظراندازی نے اسے کمزور بنا دیا ہے۔

لیڈی گوڈیوا کی مثال آج تک زندہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کی شرط پوری کرنے کے لیے خود کو ننگے ہو کر عزت کو قربان کیا تاکہ عوام کو ظالمانہ ٹیکس سے نجات ملے۔ چاہے یہ واقعہ حقیقت ہو یا روایت، عورت کی جرأت اور قربانی سے انکار ممکن نہیں۔

عورت وہ ہستی ہے جو کائنات کے وہ سب دکھ سہہ جاتی ہے جن کا تصور بھی ایک مرد شاید پوری شدت سے نہ کر سکے۔ وہ جتنی نازک دکھائی دیتی ہے، اس سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ اس کی قوت شور میں نہیں، خاموشی میں پنہاں ہوتی ہے۔ یہ کتنا عجیب المیہ ہے کہ جس معاشرے میں عورت زندگی کو جنم دیتی ہے، وہی معاشرہ اس کے لیے غلاظت بھرے الفاظ گھڑ لیتا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں، اگر گالی ماں اور بہن کے نام پر دی جا سکتی ہے تو پھر باپ اور بھائی کو کیوں اس سے مستثنیٰ سمجھا جاتا ہے؟ غلاظت اگر ہے تو اس کی ذمہ داری بھی برابر کی ہے۔

عورت کوئی گالی نہیں، کوئی کمزوری نہیں— وہ تو خود ایک مکمل کائنات ہے۔

اگر مرد، عورت کو صرف "عورت" سمجھ لے، ملکیت یا عزت کے تصور سے الگ

ہو کر، تو شاید معاشرے میں فساد کی جڑیں خود بخود سوکھ جائیں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ مرد کی نظر میں عورت کی عزت صرف انہی چند عورتوں تک محدود ہو جاتی ہے جو اس کے گھر کی چار دیواری میں سانس لیتی ہیں۔ باقی عورتیں جیسے انسان ہی نہیں ہوتیں۔ عورت جب دل شکستہ ہوتی ہے تو وہ راتوں کو سڑکوں پر نہیں نکل سکتی، وہ اپنے دکھ سگریٹ کے دھوئیں میں تحلیل نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے غصے کو بھی کھل کر نہیں جتا سکتی، کیونکہ گھر کا سکون، گھر کی فضا — سب عورت ہی سے وابستہ کر دیے جاتے ہیں۔

وہ تو بس رات کا انتظار کرتی ہے، جب سب سو جائیں، اور وہ اپنے آنسوؤں کو تکیے کے حوالے کر دے۔ مرد کی دنیا اس کے بالکل برعکس ہے — اسے فرار کے کئی راستے میسر ہیں۔ معاشرے میں عورت کو ہمیشہ دبی ہوئی آواز سمجھا گیا ہے۔ نہ وہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کر سکتی ہے، نہ اپنی مرضی سے جینے کا حق حاصل کر پاتی ہے۔

اسی تلخ حقیقت کو عصمت چغتائی نے ایک سادہ مگر گہری مثال کے ذریعے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ ایک دن ان کی والدہ نے انہیں کھانا بنانا سکھانا چاہا۔ انھوں نے انکار کر دیا اور سوال اٹھایا کہ بھائی کھانا کیوں نہیں بناتے؟

ماں نے جواب دیا: ''ان کی بیویاں آئیں گی، وہ بنا دیں گی۔''

عصمت نے فوراً کہا: ''اگر وہ مر گئیں یا بھاگ گئیں تو پھر بھائی کیا کھائیں گے؟''

جب والد صاحب آئے اور گفتگو سنی تو بولے:

''بیٹی، سسرال جا کر کیا کرو گی؟ کیا وہاں کچھ نہیں پکاؤ گی؟''

عصمت نے پورے اعتماد سے جواب دیا:

''اگر امیر گھر میں شادی ہوئی تو باورچی رکھ لوں گی اور اگر غریب گھر میں ہوئی تو کھچڑی بنا لوں گی — مگر میں کھانا بنانا نہیں سیکھوں گی۔''

باپ سمجھ گئے کہ بیٹی کا فیصلہ اٹل ہے۔ پوچھا: ''پھر کیا کرو گی؟''

جواب آیا: ''میرے سب بھائی پڑھتے ہیں، میں بھی پڑھوں گی۔''

عصمت چغتائی کے نزدیک عورت کے لیے تعلیم محض ایک سہولت نہیں بل کہ ایک ضرورت ہے۔ کیونکہ ایک غیر تعلیم یافتہ عورت اکثر عمر بھر اپنے شوہر سے جہالت اور نادانی کے طعنے ہی سنتی رہتی ہے۔

عصمت کا ماننا تھا کہ عورت کو خود مختار ہونا

چاہیے، اسے اپنی مرضی کے مطابق جینے کا حق ملنا چاہیے۔ مگر یہ ظالم معاشرہ اس حق کو کب تسلیم کرے گا — یہ فیصلہ شاید وقت ہی کرے گا۔

عورت صرف دکھ سہنے والی ہستی نہیں، وہ مرد کی زندگی میں علاج بھی ہے۔

نفسیات میں Entrainment Theory کے مطابق انسان کتنا ہی پریشان کیوں نہ ہو، کتنی ہی مصیبتوں میں گھرا کیوں نہ ہو — ایک خاص آواز ایسی ہوتی ہے جو اس کے دل کی دھڑکن کو سکون میں بدل دیتی ہے، اس کی تھکن اتار دیتی ہے۔

میرے نزدیک مرد کی زندگی میں وہ آواز، عورت کی آواز ہوتی ہے۔

عورت ماں بن کر دعا ہے، بہن بن کر حوصلہ، بیوی بن کر رفاقت، اور بیٹی بن کر امید۔

عورت اگر کمزور ہوتی، تو یہ دنیا کبھی قائم نہ رہتی۔

مضمون کے سابقہ حصے میں عورت کی خوب صورتی پر بات ہو چکی ہے۔ بہت سے پہلو زیرِ بحث آ چکے ہیں، مگر ذرا یہ سوچو:

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شے خوب صورت ہو اور اس کی طلب رکھنے والا کوئی نہ ہو؟

یقیناً نہیں۔

پھر بازار کی مثال دیکھ لو۔ اگر کوئی نئی کوالٹی کا برانڈ آئے، کوئی چیز رکھی جائے جو خوب صورت بھی ہو، اعلیٰ خصوصیات کی حامل بھی ہو، تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا کوئی خریدار نہ ہو؟

آپ کا جواب بھی یہی ہوگا: نہیں۔

بالکل اسی طرح کائنات کی تصویر میں عورت بھی ایک خوب صورت رنگ ہے۔ عورت ہو اور اس سے، یا اس کے وجود سے، کسی بشر کو محبت نہ ہو — یہ تو بالکل سفید ہاتھی والی بات ہے۔

انسان تو ویسے ہی جذبات کا حسین مجسمہ ہے، اور ان جذبات میں عورت اور مرد دونوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

یہ کہ زیادہ خطرناک جذبات کس کے ہوتے ہیں — میں اس بحث میں نہیں پڑتا، کیونکہ جذبات کو ٹھیس پہنچانا میرے نزدیک ایک نہایت گندی حرکت ہے۔

دل تو کعبہ ہوتا ہے: اسے گرانا نہیں، اس کی قدر کی جاتی ہے۔

جذبات سے یاد آیا، نطشے نے کہا تھا:

"In Revenge and In love woman is more barbaric then man is"

عورت کی حساسیت تو ہر کوئی جانتا ہے، مگر اس کے جذبات کی وحشت کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اس تجربے سے گزر چکا ہو۔

جب عورت محبت کرتی ہے تو وہ روح کو روح
سے جوڑتی ہے، جبکہ مرد اکثر جسمانی تعلق
کے دائرے میں بندھا رہتا ہے۔
یہ سچ ہے کہ جسمانی زخم سے کہیں زیادہ گہرا
زخم روح کا ہوتا ہے۔
آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اگر عورت
کسی مرد سے روحانی وابستگی چاہتی ہے
تو اس کے جذبات کا زخم بھی اتنا ہی گہرا
ہوگا۔
کیونکہ روح ہی جسم کی زندگی ہے—
اور اگر روح نہ ہو تو جسم بے حس، بے
حرکت، بالکل کسی بے جان شے کی
مانند ہو جاتا ہے۔
اسی لیے جذبات سے جڑے بدلے میں
عورت سے بچنا ہی بہتر ہے۔
جب مرد جسمانی طور پر عورت سے جدا ہوتا
ہے تو اس کے سامنے کئی راستے کھلے ہوتے
ہیں؛ وہ خود کو اچانک الگ کر سکتا ہے۔
مگر عورت — وہ جذبات کے قتل سے
گزرتی ہے۔
اور جب عورت بدلہ لینے پر آتی ہے تو مرد
دنیا کے محلات سے فٹ پاتھ پر،
محلات سے جھونپڑی میں،
اور کبھی محلات سے میخانے تک آ جاتا ہے۔
یہ سب کیسے ہوتا ہے؟

ذرا حوصلہ رکھیں... ابھی بتاتا ہوں۔
اتنی جلدی بھی کیا ہے؟
جب عورت بدلہ لیتی ہے تو وہ شور نہیں
مچاتی— وہ خاموش ہو جاتی ہے۔
وہ اسی شخص کے سامنے خاموش ہو جاتی ہے
جو اس کے لیے پانی کی خاطر سلطنت کا سودا
کرنے کو تیار تھا۔
وہ اسے نظرانداز کر دیتی ہے۔
اور یہ نظراندازی ایسا گہرا زخم ہوتی ہے
کہ انسان دوبارہ اپنے مقام تک نہیں
پہنچ پاتا۔
یہ زخم اتنا گہرا ہوتا ہے کہ نہ وہ شخص خود کو پھر
سے پا سکتا ہے،
اور نہ ہی وہ عورت کسی اور کی ہو پاتی ہے، یا
کسی اور کو خود دے سکتی ہے۔
نظراندازی کے بعد المیہ یہ بھی ہے کہ وہ
شخص اسے چھوڑ بھی نہیں پاتا۔
اسی لیے تو کہا گیا ہے:

"Man break bone in revenge but woman break soul."

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

تمھاری قدر کرتا ہوں اس پہ ناز مت کرنا
مجھے تم قتل کر دینا، نظرانداز مت کرنا

☆☆☆☆☆

اسد رضا سحر ایک سحر انگیز شخصیت

علمی وتہذیبی دھرتی سے تعلق رکھنے والے باکمال شاعر اسد رضا سحر کی شخصیت کا احاطہ کرنا میرے لیے مشکل ہی نہیں بل کہ کسی حد تک ناممکن بھی ہے اپنی علمی بساط کے مطابق ہمہ جہت شخصیت رکھنے والے شاندار انسان کا بحیثیت شاعر تعارف پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں اسد رضا سحر کا تعلق اس زرخیز دھرتی سے ہے جس نے ادبا، شعراء، علما اور سکالرز پیدا کیے اسد رضا سحر کی شخصیت میں فکری استحکام، تخلیقی بالیدگی کے ساتھ ساتھ سچا سچا اظہار پوری شان سے موجود ہے ان کا پہلا شعری مجموعہ 2011 میں ''ہمیں کر گئے تنہا'' کے نام سے منظر عام پہ آیا دوسرا غزلیہ مجموعہ کلام اور مجموعہ سلام طباعت کے مراحل میں ہے احمد پور سیال میں کسی بھی ادبی تنظیم کا سہرا انہی کے سر جاتا ہے 2011 سے باقاعدہ طور پر ادبی تنظیم ''بزم قلم احمد پور سیال'' معرض وجود میں آئی جو کہ تا حال علم و ادب کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہے اس میں اسد رضا سحر کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

اسد رضا سحر ایک سحر انگیز شخصیت رکھتے ہیں ان کی علمی وادبی خدمات پر انہیں بے شمار ادبی اعزازات اور ایوارڈز سے بھی نوازا گیا اسد رضا سحر کی شاعری نے ادبی ادارہ سازی، فکری رہنمائی اور تہذیبی شعور کی تشکیل کے ذریعے بھی ادب کو بے شمار نئی سمتیں عطا کیں ہیں اسد رضا سحر کی شخصیت اور شاعری روایتی اور جدید عناصر کی امتزاج ہے آپ ایک ایسے منفرد قلمکار ہیں جو احمد پور سیال کی ثقافتی میراث کو زندہ رکھنے اور سماجی مسائل پر روشنی ڈالنے میں مصروف ہیں۔

اسد رضا سحر کا اسلوب سخن نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ آپ کا فکری سفر کسی وقتی تحریک یا عارضی رجحان کا نتیجہ نہیں بل کہ شعور مسلسل کی روشنی میں تیار ہونے والی وہ کوشش ہے جسے پہلے دن سے ہی بڑے اذہان نے جلا بخشی ہے زبان کی حرمت، الفاظ کا وقار اور تخیل کی تازگی ان کا تعارف ہیں ایسی ہی فکری وابستگی اور جمالی حساسیت انہیں منفرد سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

اسد رضا سحر کے ہاں مضامین کی ندرت، عقیدت اور ادبی رکھ رکھاؤ کے تمام ممکنہ قرینے ایک جگہ پر موجود ہیں آپ کی شاعری آپ کی ذات کا شاندار حوالہ ہے ان کی شاعری پر

طاہر عباس ملک

تبصرہ کرنے کے لیے، میں اسد رضا سحر کی شاعری کو ایک مثال کے طور پر لیتا ہوں۔

"اسد رضا سحر کی شاعری میں ایک انوکھا پن ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں محبت، درد، اور جدوجہد کے موضوعات کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کا لہجہ دھیما اور نرم ہے، جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

ان کی شاعری میں الفاظ کا چناؤ اور تراکیب کا استعمال قابل تعریف ہے۔ وہ اپنے خیالات کو بڑی خوب صورتی سے پیش کرتے ہیں اور قاری کو ایک نئی سوچ کی طرف لے جاتے ہیں۔

ان کی شاعری ہر دل کو چھو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ ایک ممتاز شاعر ہیں جو اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ اسد رضا سحر کا نمونہ کلام پیش خدمت ہے:

جیسے دستک پہ کسی گھر کا فسوں ٹوٹتا ہے
آئینہ روز مرے سامنے یوں ٹوٹتا ہے

سانس لیتا ہوں تو شریانیں سنبھل جاتی ہیں
آہ بھرتا ہوں تو کچھ دل کے دروں ٹوٹتا ہے

قابو اعصاب پہ رکھ ہجر کا رونا مت رو
آنکھ بہتی ہے تو پھر شوقِ جنوں ٹوٹتا ہے

کوزہ گر کھول گرہ تاکہ سبھی جان سکیں
دستِ حیرت سے جو بنتا ہے وہ کیوں ٹوٹتا ہے

تیرے آنے پہ نکھرتے ہیں رخِ برگ و گلاب
تیرے جانے پہ رگ و پے کا سکوں ٹوٹتا ہے

چاند تاروں کے یہ نزدیک نہیں ہوتی تھی
رات پھر بھی مری تاریک نہیں ہوتی تھی

آدھے تو مانتے تھے مجھ کو مسیحا اپنا
اور آدھوں کو یہ توفیق نہیں ہوتی تھی

کیسے منزل پہ پہنچتا مرے سالار بتا
جن دنوں سمت مری ٹھیک نہیں ہوتی

ایسا بھی وقت ہوا کرتا تھا پہلے پہلے
مانگی جاتی تھی مدد بھیک نہیں ہوتی تھی

کامیابی کے لیے لوگ دعا کرتے تھے
کوئی جلسہ کوئی تحریک نہیں ہوتی تھی

....

آنکھوں پہ بھروسہ تو بہر طور کریں گے
ہم گریہ ابھی اور ابھی اور کریں گے

ورنہ تو کبھی منہ نہ لگاتے تمہیں پاگل
اب دل نے کہا ہے تو کبھی غور کریں گے

ہم اتنا سمجھتے ہیں تمہیں یار مقدم
تم کچھ بھی کہو ہم اُسے فی الفور کریں گے

چاہو تو ملاقات بھی ہو سکتی ہے اپنی
ہم اگلا پڑاؤ ترے لاہور کریں گے

جینے کا ہنر کس سے بھلا کیسے ملے گا
یہ اپنی مدد گزرے ہوئے دور کریں گے

☆☆☆☆☆

سبطین شاہجہانی کی شاعری ___ ایک مطالعہ

ساجد فراز شاہجہانی

اُردو شاعری کی روایت میں ہر عہد اپنے مخصوص لہجے، مسائل اور حساسیت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ محترم سبطین شاہجہانی کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جن کی شاعری معاصر انسانی تجربے، داخلی کرب اور سماجی شعور کی آئینہ دار ہے۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی اردو روایت کی خوشبو بھی ملتی ہے اور جدید حساسیت کی تازہ ہوا بھی، جو انہیں اپنے ہم عصروں سے منفرد بناتی ہے۔ جیسا کہ:

مہ و نجوم سے کب دور تیرگی ہو گی
جگر کے داغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

....

حضرت سبطین شاہجہانی کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا فکری تنوع ہے۔ وہ محض ذاتی جذبات کے شاعر نہیں بل کہ اپنے گرد و پیش کے سماجی، تہذیبی اور اخلاقی مسائل کو بھی گہرے شعور کے ساتھ شعر میں ڈھالتے ہیں۔ انسان کی تنہائی، شناخت کا بحران، وقت کی بے رحمی، اور اقدار کی شکست و ریخت ان کے ہاں بار بار سامنے آتی ہے۔ ان کا لہجہ احتجاجی کم اور سوالیہ زیادہ ہے، جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ جس کی غمازی اس شعر سے ہوتی ہے:

سبطین بے سبب نہ تھی بے تاب آبشار
دیکھا تو ایک بزم تماشا تھی سنگ میں

....

ان کی شاعری میں چند اہم موضوعات نمایاں طور پر ملتے ہیں:

جدید انسان کی بے سمتی اور داخلی اضطراب کو وہ نہایت سادہ مگر اثر انگیز انداز میں بیان کرتے ہیں، سبطین شاہجہانی صاحب کے ہاں محبت محض رومان نہیں بل کہ ایک اخلاقی

اور روحانی قدر ہے، جو انسان کو انسان سے جوڑتی ہے۔

سنبھل کہ کوچہء جاناں میں رکھ قدم سبطین
یہاں متاعِ خرد تجھ کو بیچنی ہو گی

....

وقت کی گردش، لمحوں کی ناپائیداری اور یادوں کا بوجھ ان کی شاعری میں علامتی انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ سماج کی ناہمواریوں، ناانصافیوں اور طبقاتی فاصلے کو براہِ راست نعرے بازی کے بغیر، علامت اور استعارے کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔

ماحولِ شہرِ یوسفِ کنعاں اداس ہے
رعنائیاں تو مصر کا بازار لے گیا

....

قبلہ سبطین شاہجہانی کی زبان سادہ، شفاف اور بامعنی ہے۔ وہ مشکل الفاظ یا غیر ضروری صنعتوں کے بجائے خیال کی گہرائی پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ ان کے اشعار میں علامت اور استعارہ فطری انداز میں آتا ہے، جو قاری پر بوجھ نہیں بنتا بلکہ معنی کے نئے در وا کرتا ہے۔ ان کا اسلوب نہ مکمل طور پر کلاسیکی ہے اور نہ ہی محض جدید؛ بل کہ یہ دونوں کے امتزاج سے تشکیل پاتا ہے۔ جیسا کہ:

دیکھیے کوئی بلائے ستم اب لگا کے ہاتھ
سایہ فگن ہیں مجھ پہ میرے مصطفٰے کے ہاتھ

ظاہر ہے ما رمیت کے ارشادِ پاک سے
میرے نبی کے ہاتھ ہیں میرے خدا کے ہاتھ

....

فنی اعتبار سے حضرت سبطین شاہجہانی کی شاعری میں توازن پایا جاتا ہے۔ بحر، ردیف اور قافیہ کی پابندی ہو یا آزاد نظم کا انتخاب، وہ ہر جگہ فنی شعور کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کے اشعار میں داخلی آہنگ اور معنوی ربط نمایاں ہے، جو شعر کو دیرپا اثر عطا کرتا ہے۔ جیسا کہ:

جب سے رنگا گیا ہوں محبت کے رنگ میں
رہتا ہوں صبح شام تمھاری ترنگ میں

جوشِ بہار کیا ہے حسرت کا ہے سماں
کانٹے بھی باغ باغ ہیں پھولوں کے رنگ میں

....

محترم سبطین شاہجہانی کی شاعری قاری کو محض جمالیاتی لطف نہیں دیتی بل کہ فکری سطح پر بھی متحرک کرتی ہے۔ ان کا کلام ہمیں اپنے باطن میں جھانکنے، اپنے سماج کو سمجھنے اور اپنے وقت سے مکالمہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہی وصف کسی بھی سنجیدہ شاعر کی پہچان ہوتا ہے۔ نتیجتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ قبلہ سبطین شاہجہانی اردو شاعری میں ایک معتبر اور بامعنی آواز ہیں، جن کی شاعری موجودہ عہد کے انسان کی داخلی و خارجی کیفیات کو نہایت سلیقے اور وقار کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

دوپہر کا چاند [نذیر قیصر کی شاعری میں تہذیبی مکالمہ]

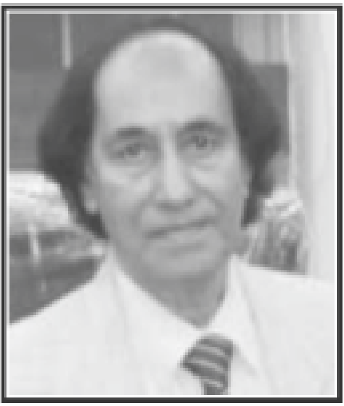

نذیر قیصر کی شاعری پڑھتے ہوئے سب سے پہلا تاثر یہ بنتا ہے کہ یہ شاعری کسی ایک لمحے یا ایک تجربے تک محدود نہیں۔ یہ ایک ایسی آواز ہے جو فرد کی ذات سے نکل کر آہستہ آہستہ تہذیب کے وسیع دائرے میں پھیل جاتی ہے۔ شاعر اپنی ذات بیان کرتا ہے، مگر یہ ذات تنہا نہیں رہتی۔۔۔ اس میں شہر بھی شامل ہو جاتا ہے، مٹی بھی، بچپن بھی، اور وہ تاریخ بھی جو ہمارے بولنے سے پہلے بول چکی ہے۔ یہ شاعری فرد کے تجربے کو اجتماعی یادداشت سے جوڑ دیتی ہے۔ اسی لیے نذیر قیصر کی غزل کو محض داخلی واردات کہنا، جیسا کہ اکثر لوگ کہتے لکھتے رہتے ہیں، اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔۔۔ یہ دراصل ایک تہذیبی مکالمہ ہے، جس میں شاعر بولتا ہے، قاری سنتا ہے، اور جس میں تہذیب خود سوال کرتی ہے۔۔۔ خاموش مگر مسلسل۔

ایڈورڈ شلز (Edward Shils) نے کہا تھا:

Civilization is not only lived, It is articulated through language, symbols, and inherited meanings.

نذیر قیصر اس عہد کے تخلیقی بانجھ پن پر نہایت خاموش مگر معنی خیز انداز میں انگلی رکھتے ہیں۔۔۔ ایک ایسا عہد جہاں انسان کو سب کچھ بنا بنایا مل رہا ہے، حتیٰ کہ اپنی شناخت بھی۔ شناخت جو کبھی سوال، جستجو اور داخلی کشمکش سے

نوید صادق

جنم لیتی تھی، اب سہولت کے خانے میں رکھ دی گئی ہے۔ نذیر قیصر کسی فرد یا کسی مخصوص طبقے کو براہ راست ہدف نہیں بناتے۔۔۔ پورے زمانے کے مجموعی مزاج کو سوالیہ نشان بنا دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں مسئلہ کسی ایک شخص کا نہیں۔۔۔ اس اجتماعی رویّے کا ہے جو آہستہ آہستہ پورے سماج میں سرایت کر چکا ہے۔

یہ وہ لمحہ ہے جہاں تخلیق کی جگہ قبولیت نے لے لی ہے، اور سوال کی جگہ سہولت نے۔ انسان اب چیزوں کو بنانے کے بجائے اختیار کرنے پر اکتفا کرتا ہے، معنی پیدا کرنے کے بجائے دستیاب معنوں پر گزارا کرنے لگتا ہے، اور اپنی صورت خود تراشنے کے بجائے پہلے سے بنی ہوئی شکلوں میں خود کو ڈھال لیتا ہے۔ نذیر قیصر اس صورتِ حال پر نہ تو کوئی خطیبانہ ردِعمل ظاہر کرتے ہیں، نہ کسی فکری فیصلے کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ ہمیں چونکاتے نہیں۔۔۔ خاموشی سے ایک آئینہ ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں۔۔۔ ایسا آئینہ جس میں ہم اپنے عہد کا چہرہ خود دیکھ سکیں۔

نذیر قیصر کسی مذہبی یا نظریاتی موقف کی تبلیغ نہیں کرتے۔۔۔ تہذیب کے اس رویّے کو بے نقاب کرتے ہیں جہاں سوال آہستہ آہستہ ختم ہو گئے ہیں۔ دیواروں اور دروازوں میں جو شور سنائی دیتا ہے، وہ باہر کا شور نہیں، ہماری اپنی آوازوں کی بازگشت ہے۔ ہم نے بہت کچھ کہا، بہت کچھ دہرایا، مگر اس پر کبھی ٹھہر کر غور نہیں کیا۔ گفتگو بڑھتی چلی گئی، مگر سوچ پیچھے رہ گئی۔

اسی کیفیت کو ہنا آرنٹ (Hannah Arendt) نے thought lessness کا نام دیا تھا۔۔۔ یعنی وہ حالت جہاں انسان سوچنے کی زحمت ترک کر دیتا ہے، حالانکہ وہ بولتا بہت ہے۔ ان کے بقول، سوچ کی عدم موجودی انسانی رویّے کی سب سے خطرناک صورتوں میں سے ایک ہے۔

نذیر قیصر کی شاعری اسی سوچ سے دستبرداری کے رجحان کے خلاف ایک نرم مگر مستقل احتجاج معلوم ہوتی ہے۔ یہ احتجاج شور نہیں مچاتا، نعرہ نہیں لگاتا۔۔۔ آہستہ آہستہ قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور شاید یہی اس شاعری کی سب سے بڑی تہذیبی معنویت ہے کہ یہ ہمیں جواب نہیں دیتی۔۔۔ دوبارہ سوال کرنے کی طرف لے آتی ہے۔

وہ اپنی کوئی نئی شکل کیا تراشیں گے
جنھیں خدا بھی ملا ہے بنا بنایا ہوا

....

یہ جو دیوار و در میں شور سا ہے
سب ہمارا کہا سنا ہوا ہے

....

خامشی اپنی اپنی ہوتی ہے
شور مل کر مچانا پڑتا ہے

سیڑھیوں میں بڑا اندھیرا تھا
وہ مجھے راستہ دکھانے لگی

....

مسلسل دستکیں ہوتی ہیں در پر
مری جانب سے غفلت ہو رہی ہے

....

رات بھر جاگنا پڑا قیصر
اک دیے کو دیا بناتے ہوئے

....

نذیر قیصر کے ہاں وقت ایک سیدھی لکیر نہیں، بل کہ ایک دائرہ ہے --- ایسا دائرہ جس میں آغاز اور انجام بار بار ایک دوسرے سے آملتے ہیں- وہ ابتدا کو یاد ضرور کرتے ہیں، مگر یہ یاد کسی ناسٹلجیا یا رومانوی حسرت کے تحت نہیں ہوتی- یہ واپسی اس لیے ہے کہ وہ دیکھ سکیں کہ ہم کہاں سے چلے تھے اور اب کہاں آ کھڑے ہوئے ہیں- یوں یاد محض ماضی کی بازیافت نہیں رہتی--- بل کہ حال سے سوال کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ بن جاتی ہے- نذیر قیصر کے یہاں ماضی کو پناہ گاہ نہیں بنایا جاتا--- آئینہ بنا کر حال کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے-

اسی لیے ان کے اشعار میں جو مکالمہ چلتا ہے، وہ صرف محبوب سے نہیں، بل کہ کائنات، وقت اور وجود سے ہوتا ہے- یہ وہی قدیم انسانی مکالمہ ہے جس سے تہذیب نے جنم لیا تھا--- جب انسان نے پہلی بار سوال کیا، حیران ہوا، اور آسمان کی طرف دیکھ کر اپنی حیثیت جاننے کی کوشش کی- نذیر قیصر اس بنیادی سوال کی کیفیت کو دوبارہ زندہ کرتے ہیں، تاکہ ہم اپنی موجودہ حالت کو ماضی کی روشنی میں دیکھ سکیں-

اسی نوع کے تجربے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے والٹر بنجمن (Walter Benjamin) لکھتا ہے کہ ماضی اپنے اندر ایک زمانی اشارہ رکھتا ہے، جو اسے نجات کے امکان سے جوڑ دیتا ہے- نذیر قیصر کے ہاں یہی ماضی بار بار حال میں داخل ہو کر ہمیں چونکاتا ہے--- کبھی سوال کی صورت، کبھی یاد کی شکل میں، اور کبھی ایک ایسی خاموش تنبیہ کے طور پر جو ہمیں اپنے زمانے کے بیچ کھڑا کر دیتی ہے:

اولیں صبح تھی ستاروں کی
میرا تجھ سے مکالمہ ہوا تھا

رات کا پھول ، صبح کا تارا
میرے سامان میں پڑا ہوا تھا

....

میں پہلے بھی یہاں آیا ہوا ہوں
مگر اس بار حیرت ہو رہی ہے

....

اب مجھے یاد کیوں نہیں آتا
اس نے جو راستہ بتایا تھا

مڑ کے دیکھا نہیں گیا ہم سے
اس نے تو ہاتھ بھی ہلایا تھا

....

مرے موسم بدلتے جا رہے ہیں
میں سبزہ تھا، سنہرا ہو گیا ہوں

....

نذیر قیصر کے ہاں شہر محض ایک جغرافیائی مقام نہیں--- ایک مکمل تہذیبی تجربہ ہے--- ایسا تجربہ جس میں خوب صورتی اور بربادی ایک ساتھ سانس لیتے ہیں۔ یہ شہر شاعر کی تربیت گاہ بھی ہے اور اس کی آزمائش گاہ بھی--- وہیں اس کی آنکھ کھلتی ہے اور وہیں اس کی آنکھ آزمائی جاتی ہے۔ یہاں دھول بھی ہے اور دھنک بھی، روشنی بھی ہے اور ویرانی بھی۔ یہی تضاد جدید شہری تہذیب کا بنیادی وصف بن چکا ہے، جہاں رنگ اور گرد، خواب اور شکست ایک ہی منظر میں جمع ہو جاتے ہیں۔

نذیر قیصر کے یہاں شہر کی تصویریں محض منظر نگاری نہیں کرتیں--- جدید تہذیب کے اندرونی تضادات کو بے نقاب کرتی ہیں۔ ستاروں کا فٹ پاتھ پر پڑا ہونا اور خالی گھر میں چراغ کا جلنا--- اس الٹ پھیر کی علامت ہے جہاں قدریں اپنی جگہ بدل چکی ہیں اور انسان اس تبدیلی کا عادی ہو گیا ہے۔ یہ شہر ہمیں چونکاتا نہیں--- آہستہ آہستہ یہ احساس دلاتا ہے کہ ہم کس طرح اس بے ترتیبی کے ساتھ جینا سیکھ چکے ہیں۔

اسی تناظر میں ہنری لیفے بر (Henri Lefebvre) کی یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ: The city is a projection of society on the ground? نذیر قیصر کا شہر اسی projection کی شاعرانہ مگر اداس تصویر بن جاتا ہے--- ایسی تصویر جس میں سماج کے خواب بھی نظر آتے ہیں اور اس کی تھکن بھی، اس کی روشنی بھی اور اس کے زخم بھی:

دھول اُڑاتا، دھنک بناتا ہوا
میں اسی شہر میں پڑا ہوا تھا

تارے فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے تھے
خالی گھر میں دیا جلا ہوا تھا

....

یہ شہر سو رہا ہے پرندوں کے شور میں
اس شہر میں ہیں خوب سہانے پڑے ہوئے

....

ایک مسمار شہر ہے جس میں
اپنے لوگوں کو ڈھونڈتا ہوا میں

....

صبح اس شہر کے دروازے پہ
اپنے سائے سے ڈری آتی ہے

....

دونوں جانب سرخ گلاب کی بیلیں ہیں
کہیں کہیں بیلوں میں قبریں ملتی ہیں

یہاں سونے کے پیڑ ہوتے تھے
ایک چڑیا ہمیں بتاتی ہے

کبوتر طاقچوں میں اڑ رہے ہیں
شجر گنبد سے اونچا ہو رہا ہے

نذیر قیصر کے ہاں بچپن محض ایک یاد یا گزرا ہوا زمانہ نہیں --- ایک اخلاقی حوالہ بن کر سامنے آتا ہے۔ وہ بچوں کی آنکھ سے دنیا دیکھنے کی بات اس لیے کرتے ہیں کہ وہاں ابھی مفاد، چالاکی اور حساب کتاب کی وہ تہیں شامل نہیں ہوئیں جو بعد میں انسان کے دیکھنے اور سمجھنے کے عمل کو مسخ کر دیتی ہیں۔ یہ معصوم نظر تہذیب کے لیے ایک پیمانہ بن جاتی ہے --- ایک ایسا پیمانہ جس پر یہ پرکھا جا سکتا ہے کہ ہم کہاں تک بھٹک چکے ہیں اور کس مقام پر سادگی، شفافیت اور سچائی کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

نذیر قیصر کے اشعار میں بچوں کی قطاریں، ان کے سبز بستے اور روشن راستے محض تصویری علامتیں نہیں --- تہذیب کے مستقبل کی طرف اشارے ہیں۔ اگر اس بکھرتے ہوئے منظرنامے میں کہیں کوئی امید باقی ہے تو وہ یہی سبز بستے ہیں اور یہی روشن قطاریں ہیں، جن میں ابھی سوال زندہ ہیں اور نظر دھندلائی نہیں۔

کلفرڈ گیرٹز (Clifford Geertz) کے بقول Culture is a web of meanings that humans themselves have spun نذیر قیصر بچوں کو اس لیے اہم سمجھتے ہیں کہ اس تہذیبی معنوی نقشے میں ابھی گرہیں کم ہیں۔ ان کی دنیا میں معنی ابھی بوجھ نہیں بنے اور شاید اسی لیے شاعر بچوں کی آنکھ کو آئینہ بنا کر ہمیں اپنی تہذیبی صورت دکھاتا ہے:

میں نے بچوں کی آنکھوں سے دنیا دیکھی ہے
قیصر میرے جیسے شاعر بچے ہوتے ہیں

صبح سی روشن ہے بچوں کی قطار
ان کے رستے ان کے بستے سبز ہیں

دیے کی لو میں بچے پڑھ رہے ہیں
مرے گھر میں عبادت ہو رہی ہے

ایک بچے نے جلتی انگلی سے
خاک پر آسمان بنایا تھا

پانی پڑا ہوا کہیں دانے پڑے ہوئے
مٹی کے برتنوں میں خزانے پڑے ہوئے

میرے بچپن کا دوست تھا قیصر
جو شجر راہ میں کھڑا ہوا تھا

خوش ہیں ہم گھاس پہ سونے والے
نیند آنکھوں میں ہری آتی ہے

نذیر قیصر کی شاعری میں چراغ محض روشنی کا استعارہ نہیں رہتا--- رفتہ رفتہ مزاحمت، شعور اور بیداری کی علامت بن جاتا ہے۔ وہ بار بار چراغ کی طرف لوٹتے ہیں، جیسے ہمیں یاد دلا رہے ہوں کہ اصل جنگ طاقت کے ایوانوں، بلند منبروں یا بڑے نعروں میں نہیں لڑی جاتی--- روشنی کے انھی چھوٹے چھوٹے دائروں میں لڑی جاتی ہے جہاں انسان اپنی بصیرت کو زندہ رکھتا ہے۔ یہ چراغ کسی ایک فرد کا نہیں--- اس اجتماعی احساس کا نشان ہے جو اندھیرے کے دباؤ کے باوجود بجھنے سے انکار کرتا ہے۔

اسی لیے نذیر قیصر کے یہاں عبادت کا تصور محض مذہبی رسم یا ظاہری عمل تک محدود نہیں رہتا--- ایک تہذیبی عمل میں ڈھل جاتا ہے--- روشنی کو بچانے کا عمل، شعور کو محفوظ رکھنے کی جدوجہد، اور اندھیرے کے بیچ سوچ کی لو کو قائم رکھنے کی کوشش۔ چراغ جلانا یہاں کسی ایک لمحے کا عمل نہیں--- ایک مسلسل اخلاقی ذمہ داری ہے۔ اسی باطنی کیفیت کو گاستوں باشلار (Gaston Bachelard) یوں بیان کرتا ہے:

A lamp is not merely an object, it is a centre of reverie.

نذیر قیصر کے ہاں بھی reverie فرد کے باطن تک محدود نہیں رہتی--- آہستہ آہستہ اجتماعی شعور میں ڈھل جاتی ہے۔ چراغ ایک فرد کی تنہائی سے نکل کر تہذیب کے اجتماعی ضمیر کا حصہ بن جاتا ہے--- ایسا ضمیر جو اندھیرے کو مکمل غلبہ حاصل نہیں کرنے دیتا۔ اسی مفہوم کو فیض احمد فیض نے نہایت سادگی اور تہذیبی وقار کے ساتھ یوں کہا تھا:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

....

نذیر قیصر کی شاعری میں چراغ بھی اسی ضد، اسی حوصلے اور اسی تخلیقی مزاحمت کا استعارہ بن جاتا ہے--- جہاں روشنی چھن جائے تو اسے پھر سے اپنے ہی اندر پیدا کیا جاتا ہے یا کرنا پڑتا ہے:

رات جب فیصلہ سناتی ہے
سب سے پہلے دیا بجھاتی ہے

....

رات بھر جاگنا پڑا قیصر
اک دیے کو دیا بناتے ہوئے

....

ہمارے ساتھ چراغوں کا دل دھڑکتا ہوا
ہمارے ساتھ ستاروں کو نیند آتی ہوئی

....

میں اک چراغ کسی غار میں بجھایا ہوا
وہ میری سمت چراغوں پہ چل کے آتی ہوئی

سو رہا ہوں کہ جاگتا ہوں میں
جانتے ہیں چراغ حال مرا

....

پانچ دروازوں میں جلتے ہیں چراغ
بیچ میں بارہ دری آتی ہے

....

پھول کھلتے تھے ، رات ہوتی تھی
باغ تھا اور چراغ تھا مجھ میں

....

نذیر قیصر روایت کے ساتھ ایک متوازن اور بالغ نظر رشتہ رکھتے ہیں۔ وہ نہ روایت کے اسیر ہیں، نہ اس کے منکر--- ان کے نزدیک روایت کوئی جامد ورثہ نہیں جسے محض اٹھا کر ڈھویا جائے--- ایک ایسا راستہ ہے جس پر چلتے ہوئے سوال بھی کیے جا سکتے ہیں۔ یہ راستہ ماضی سے کٹنے کا نہیں، بلکہ ماضی کے ساتھ مکالمہ قائم رکھنے کا ہے۔ نذیر قیصر کی شاعری میں روایت احترام کے ساتھ موجود ہے، مگر یہ احترام خاموش اطاعت میں نہیں ڈھلتا--- یہاں روایت کو پرکھا جاتا ہے، اس سے بات کی جاتی ہے، اور اس کے اندر چھپے ہوئے معنی دوبارہ دریافت کیے جاتے ہیں۔

اسی لیے نذیر قیصر کے ہاں مٹی محض زمین نہیں رہتی--- خود ایک تہذیبی متن بن جاتی ہے--- ایسا متن جس میں نسلوں کی آمد و رفت، خوابوں کی روشنی اور شکستوں کی دراڑیں سب ثبت ہیں۔ یہ مٹی گواہ بھی ہے اور حافظ بھی، جس کے اندر تہذیب کے تمام تجربے محفوظ ہیں۔ نذیر قیصر اس مٹی کو پڑھتے ہیں، اس سے سوال کرتے ہیں، اور اسی عمل میں روایت کو زندہ رکھتے ہیں۔

اسی تصور کو پال ریکور (Paul Ricoeur) کی نظر سے دیکھیے:

Tradition is not what silences, but what speaks when questioned.

نذیر قیصر کی شاعری اسی مکالماتی روایت کی توسیع بن جاتی ہے--- ایسی روایت جو خاموش نہیں کراتی--- بولنے پر آمادہ کرتی ہے اور جس کے ذریعے ماضی حال کے ساتھ ہم کلام رہتا ہے:

پرانے عہد کا سکہ یہاں نہیں چلتا
کسی پرانے زمانے میں جانا پڑتا ہے

....

جس مٹی سے کچے گھروندے بنتے تھے
اس مٹی میں اب تہذیبیں ملتی ہیں

....

آدم کے شجرے سے مجھ تک آنے میں
کتنے زمانے ، کتنی نسلیں ملتی ہیں

....

پوچھتی ہے ہوا درختوں سے
یہ سڑک کس طرف کو جاتی ہے

....

برسوں کے بعد ایک حویلی کے در کھلے
روشن ہوئے چراغ پرانے پڑے ہوئے

....

میں نے اپنا قصہ خود ترتیب دیا
ایک کہانی سنی سنائی بھول گیا

....

ساتواں آسماں نہیں آیا
تھک گئے سیڑھیاں بناتے ہوئے

....

نذیر قیصر اپنی ذات کو محض ایک فرد کی سطح پر نہیں رکھتے--- اس میں پورے عہد کی شکست و ریخت سمو لیتے ہیں۔ ان کے یہاں ذات ایک علامت بن جاتی ہے--- ایسی علامت جس میں انسان، شہر اور تہذیب سب اپنی بکھری ہوئی صورت کے ساتھ جھلکتے ہیں۔ یہ بکھراؤ کسی ایک داخلی کرب کا نتیجہ نہیں--- اس اجتماعی حالت کا اظہار ہے جس سے جدید انسان گزر رہا ہے۔ فرد اپنی جگہ ٹوٹا ہوا ہے، شہر اپنی معنویت کھو رہا ہے، اور تہذیب اپنے مرکز سے ہٹتی جا رہی ہے--- ان سب کا عکس نذیر قیصر کی شاعری میں ایک ہی وقت میں اُبھرتا ہے۔

نذیر قیصر کے ہاں ذات آئینہ بن جاتی ہے--- ایسا آئینہ جس میں پورا زمانہ اپنی دراڑوں، اپنی تھکن اور اپنی بے سمتی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یہ شاعری کسی ذاتی اعتراف تک محدود نہیں رہتی--- جدید انسان کی اجتماعی بے چینی اور تہذیبی اضطراب کی نمائندہ بن جاتی ہے:

آنکھیں کہیں ہیں، چہرہ کہیں، ہاتھ ہیں کہیں
ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں کسی شاہکار کے

آیا نہ اپنا نام کسی بھی شمار میں
ہم آدمی نہیں تھے کسی بھی قطار کے

....

یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر خاموش ہو جاتا ہے اور قاری بولنے لگتا ہے۔

تھیوڈور ڈبلیو آدورنو (Theodor W Adorno) نے جدید وجود کے بارے میں کہا تھا:

The whole is the untrue

نذیر قیصر کی شاعری اس بکھرے ہوئے whole کو کسی فلسفیانہ اعلان کے بغیر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے۔

اور شاید یہی نذیر قیصر کی شاعری کا سب سے بڑا کمال ہے کہ وہ ہمیں پڑھنے کے بعد خاموش نہیں رہنے دیتی۔

☆☆☆☆☆

”ایک گداگر کا انٹرویو“

قارئین کرام ! اس وقت ہم ایک ایسی شخصیت کے پاس موجود ہیں جنھوں نے اپنی شبانہ روز محنت اور دلی لگن سے خود کو مٹا کر خاندان بھر کو اونچے مقام پہ پہنچایا ہے؛ آیئے آج ان سے گفتگو کر لیتے ہیں

• اچھا آپ سب سے پہلے تو یہ بتایئے کہ آپ کہاں پیدا ہوئے؟

•• کہاں پیدا ہونا تھا جی؛ میں کون سا کسی وزیر یا جاگیردار کا بیٹا ہوں جو فائیو سٹار ہسپتالوں میں پیدا ہوتا جہاں سب لوگ پیدا ہوتے ہیں وہیں پر میں بھی پیدا ہوا!؛ اپنے گھر ہی میں پیدا ہوا جی؛ اپنی شادمان گلی میں:

پیدا ہوا شکیل تو شیطان نے کہا
لو آج ہم بھی صاحب اولاد ہو گئے

....

• خاصے باذوق آدمی معلوم ہوتے ہیں آپ؛ یہ شوق کب سے پالا؟

•• اپنے پیشے میں سُر اور ترنم کی ضرورت کچھ زیادہ ہی پڑتی ہے حضور؛ مانگتے وقت کبھی کبھی اقبال کو گانا پڑ جاتا ہے اور فیض کے ترانے بھی یاد رکھنے پڑتے ہیں ہمارے ہاں بے سُرے فقیر کو کوئی پوچھتا تک نہیں؛ کوئی کچھ دیتا ہی نہیں اسے؛ سو اسی پیشہ ورانہ اہمیت کے پیشِ نظر نغمہ و سُر اور شاعری وغیرہ سے دل لگانا ہی پڑا؛

دے بابا اللہ کے نام پہ-----

جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا-----

• اچھا یہ بتاؤ کبھی کسی سکول یا مدرسے بھی گئے یا نہیں؟ آپ کی تعلیم کتنی ہے؟

•• تعلیم کا کیا کرنا تھا جی، ہم نے کون سی نوکری ڈھونڈنی تھی؛ ویسے جنھوں نے پڑھ پڑھ کر ڈگریاں حاصل کیں انھیں کیا ملا؟ وہ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ:

اور بھی غم ہیں زمانے میں جہالت کے سوا----

....

ہاں والد محترم کی خواہش تھی کہ میں پڑھ کر بڑا آدمی بن جاؤں اور اس نے کئی بار اس غرض سے سکول بھیجا بھی مگر جانے کیوں؟ اپنی طبیعت وہاں لگی ہی نہیں؛

نور کمال شاہ

کچھ پلے ہی جو نہیں پڑتا تھا؛ استاد سے بھی کوئی مناسبت نہ بن سکی اور نہ ہی کتابوں سے اس لئے شکر ہے وقت پر اچھا فیصلہ کیا اور سکول کو شروع ہی میں خیر باد کہہ کر کاروبار شروع کیا

• کاروبار؟ کیا مطلب آپ کاروبار بھی کر چکے ہیں؟

•• بڑے بھولے ہیں آپ سائیں؛ یہ مانگنے کا پیشہ ہی اپنے ہاں کاروبار کہلاتا ہے؛ سب کی خیر ہو-----

• تو والد کی خواہش؟ کیا اس نے کچھ نہیں کہا؟

• اسے بھلا کیا کہنا تھا جی؛ میں نے ان کی خواہش جو پوری کر دی تھی اور لکھے پڑھے بغیر ہی بڑا آدمی بن گیا

• کتنی آمدن ہو جاتی ہے دن کی؛ کبھی حساب لگایا آپ نے؟

•• اب راز کی باتیں تو نہ ہی پوچھیں جی تو بہتر رہے گا بس گذارہ ہو جاتا ہے آپس کی بات بتاؤں آپ کو؛ وہ پروفیسر صاحب کی حکایت تو سنی ہوگی آپ نے جو ایک کمسن بھکارن کا عاشق بن کر اس کا ہاتھ مانگ رہا تھا بھکارن کے والد نے انکار کر دیا مگر جب دیکھا کہ پروفیسر صاحب اپنی بات سے کسی طور پیچھے ہی نہیں ہٹ رہے تو انھوں نے اپنے حساب سے کڑی شرط رکھ دی کہ ٹھیک ہے؛ بیٹی تو میں تمھیں دے دوں گا مگر تمھیں ایک سال کے لئے پروفیسری چھوڑ کر بھیک مانگنی ہوگی تا کہ کل میری بیٹی کو طعنے تو نہ سننے پڑیں پروفیسر صاحب راضی ہو گئے اور شرط کے مطابق بھیک مانگنا شروع کیا سال مکمل ہونے پر بھکارن کے باپ نے اسے بلایا اور خوش خبری دیتے ہوئے کہا کہ مبارک ہو؛ تم نے ہماری شرط پوری کر دی ہے؛ تم اب بارات لے ہی آؤ پروفیسر صاحب حیرت سے بولے؛ کیسی بارات؟ بھاڑ میں گئی بارات؛ مجھے کوئی شادی وادی نہیں کرنی؛ میں تو اس پورے سال میں اس بات پہ خود کو کوستا رہا ہوں کہ یہ کام پہلے سے کیوں شروع نہیں کیا عبث میں اتنا وقت برباد کیا-

• مطلب یہ کہ اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے؟

•• شکر ہے جی مالک کا، وقت گزر رہا ہے؛ خرچے بھی تو بہت بڑھ گئے ہیں آج کل؛ مہنگائی بھی آپ دیکھ ہی رہے ہیں؛ اوور ٹائم لگانا پڑتا ہے جی؛ اب کبھی کبھی شام کے بعد بھی دھندہ کرتا ہوں بچوں

کے سکولوں کے خرچے بھی نکالنے ہوتے ہیں ؛ منجھلے بیٹے نے بڑے کے دیکھا دیکھی نئی گاڑی بھی خرید لی ہے تو یہ سب دیکھنا پڑتا ہے۔

• جس طرح ہر شخص اپنی زندگی میں آگے بڑھنا چاہتا ہے ؛ آپ کے دل میں کبھی کوئی امنگ پیدا نہیں ہوتی ؟

•• سنا ہے عرب امارات اور سعودیہ میں کام آج کل بہت اچھا چل رہا ہے ؛ ان کا پیسہ بھی بھاری ہے اور وہ شیخ لوگ دیتے بھی زیادہ ہی ہیں ، اس لیے ارادہ ہے کہ آئندہ وقت میں وہاں روزگار جمایا جائے ؛ بچوں کے لیے بھی تو کچھ کرنا ہے تا جی گداگری کا کیا مستقبل دیکھ رہے ہیں آپ ؟

•• ہمارے ہاں اس کاروبار کا مستقبل کافی روشن ہے ہر سال نئے نئے لوگ آرہے ہیں اس شعبے کی طرف اب تو ہم خیر سے ہر سال اس شعبے سے متعلقہ ہزاروں افراد باہر دنیا کو برآمد بھی کر رہے ہیں۔

• عوام کے نام کیا پیغام دینا چاہتے ہو؟

•• عوام سے بس یہی درخواست ہے کہ ہماری جو ادائیگی ان کے ذمے باقی ہے ؛ جلدی ادا کر دیں تو ہمارا بھی کچھ بھلا ہو جائے کھلے پیسے نہ ہونے کے بہانے پر روزانہ بیسیوں بندے اگلے دن کے وعدے پر ہمارے قرض دار رہ جاتے ہیں یہ اگلا دن جانے کب آئے گا کسی کو معلوم نہیں اس نامناسب فعل کے باعث ہمارے لاکھوں روپے پھنسے ہوئے ہیں۔

• حکومت وقت سے کیا مطالبہ کرتے ہو؟

•• حکومت کو چاہیے سیاسی لڑائیاں چھوڑ کر اس پسے ہوئے بدحال طبقے کی جانب بھی توجہ دے شہروں میں ہمارے لیے پوائنٹس مقرر کر کے مناسب کیبن فراہم کرے جس میں کرسی ، پانی اور دیگر بنیادی ضروریات مہیا ہوں ؛ پولیس کو ہمیں بے جا تنگ کرنے سے روکا جائے اور ہماری حفاظت کا بھی مناسب بندوبست ہو۔

• شکریہ ؛ آپ کے مطالبے اس انٹرویو کی وساطت سے حکومت وقت تک پہنچ جائیں گے امید ہے وہ ضرور اس طرف توجہ دیں گے انٹرویو کے لیے وقت دینے کا ایک بار پھر شکریہ----

•• آپ کا بھی بہت شکریہ ؛ رب سکھی رکھے ، تیرے بال بچے خوشحال رہیں جی ؛ خالی ہاتھ مت جائیے گا ؛ جاتے جاتے اس فقیر کو بھی کچھ دیتے جانا ؛ رب راکھا---------!!!!

☆☆☆☆☆

''اور آنا گھر میں بلیوں کا''

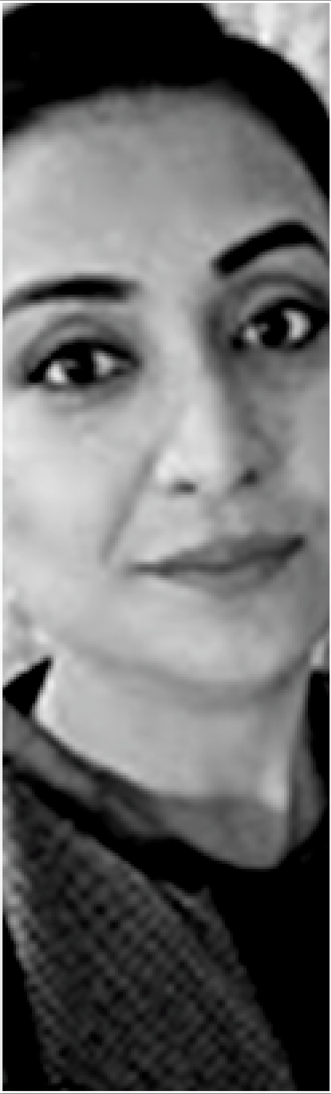

سیدہ آمنہ ریاض

یہ ڈیڑھ مہینے کا واقعہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔

مجھے کبھی بھی بلیوں سے والہانہ عشق نہیں ہوا۔ ہاں البتہ دور دور سے ان کی معصوم صورت دل کو لبھاتی رہی ہے۔

لیکن مستقبل قریب میں ایسا خطرناک سابقہ بلیوں سے پیش آئے گا جو میرے سابقہ رہے سہے ہوش اڑا دے گا۔ ''سوچا نہ تھا کبھی ہم نے یہ سماں''

ایک دن صبح سویرے ہم نے باتھ روم کا رخ کیا تو گلی کی جانب جالی والی کھڑکی کی جالی ٹوٹی دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا کہ یا اللہ یہ کون ہوسکتا ہے جس نے جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے کھڑکی کی جالی بھی توڑ دی اور کسی کو کان وکان خبر نہ ہوئی۔

میرا بھوت پریت وغیرہ پر بالکل یقین نہیں ہے البتہ چوروں ڈاکوؤں کو دل سے مانتی ہوں ۔ عقل کے گھوڑے چاروں سمت دوڑائے گئے، پر چور کا سراغ نہ ملنا تھا، نہ ملا۔ پھر خیال آیا کہ جس گلی میں کھڑکی ہے اسی گلی میں ہمسائیوں نے سی سی ٹی وی کیمرہ بھی لگا رکھا ہے ۔یوں ہم فوری

ہمسائیوں کے گھر جا پہنچے اور تمام قصہ ان کے گوش گزار کیا۔

انھوں نے ہمیں حوصلہ دیتے ہوئے پچھلی رات کی ریکارڈنگ آن کی ۔ریکارڈنگ میں عین رات پونے چار بجے ایک بلی محترمہ دندناتی ہوئی بلکہ چھلانگیں مارتی ہوئی کھڑکی پر جا پہنچیں اور یہ منظر ہماری گنہگار آنکھوں نے دیکھا کہ اچانک دائیں ہاتھ سے مکا بنا کر جالی پر مارا گیا۔ جس کے نتیجے میں جالی ٹوٹ گئی اور بلی محترمہ کی آنیوں جانیوں کے لیے راستہ ہموار ہوگیا۔

خدا کی قسم! اگر کوئی اور یہ قصہ بتاتا تو میں کبھی بھی یقین نہ کرتی۔ ہمسائی نے ہی بتایا کہ یہ جالی ایک مرتبہ کے وار سے نہیں کھلی یہ بلی محترمہ کی شبانہ روز محنتوں کا نتیجہ ہے۔ جس کا ثمر اسے آج مل گیا ہے۔

اس کے بعد پورا ہفتہ بلیوں کی دھما چوکڑی سے میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میری بہت ہی پیاری شیلف بلی کی چھلانگانہ حرکات سے چاروں شانے چت گر پڑی بلکہ چکنا چور ہوگئی۔ اس کے علاوہ جو لوازمات بناؤ سنگھار کے اس شیلف پر دھرے تھے وہ بھی زمیں بوس ہو گئے۔

اگلے ہی دن جالی ٹھیک کرنے والے کو بلایا گیا جس نے بڑی محنت کے بعد دوسری جالی لگا دی۔ یوں سکون ہو گیا اور ہم سمجھے کہ بلا ٹل گئی۔

تھوڑے ہی دنوں بعد آدھی رات کو عجیب شور کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ تو کیا دیکھتی ہوں کہ تین عدد بلیاں میرے پلنگ کے نیچے میاوں میاوں کی صدا بلند کر رہی ہیں ۔ایک کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ بولی ”میاوں“، دوسری کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ بولی ”میاوں میاوں“، تیسری کی جانب غصے سے دیکھا تو وہ باآواز بلند چلائی ”میاوں، میاوں، میاوں“ _ جس کا مطلب میں نے سمجھا ”تسی جو مرضی کر لوو، اسی میاوں ہی میاوں“ _

اب تینوں بلیوں کو کمرے سے نکالنے کی کوشش کی جانے لگی۔ جس میں بلیوں کی رضامندی ہرگز شامل نہ تھی۔ قصہ مختصر بڑی ہی مشکل سے بلیوں کو باہر نکالا گیا۔ جس کے بعد میری نیند کا پنچھی کہیں دور پرواز کر گیا۔

اب کیا دیکھتی ہوں کہ باتھ روم کی جالی تو اپنی جگہ صحیح سلامت موجود ہے لیکن بلیوں نے کمال مہارت سے کھڑکی کی سلائیڈنگ کو کھسکا کر کھول لیا اور چھلانگیں مارتی، باتھ روم کی تباہی و بربادی مچاتی میرے کمرے میں گھس جاتیں۔

جس کے کارن روز رات کو تماشا لگتا اور اب

کہ یہ بلیاں اکٹھی نہیں آتی تھیں بلکہ انھوں نے رات کے مختلف اوقات میں اپنی آمدورفت جاری رکھی۔ جس سے میری نیند کا بھلت کا رہو گیا اور میں ٹپٹا کر رہ گئی۔

اگلے دن میں نے اپنے ڈرائیور کو غصے سے فون لگایا اور کہا کہ ''یہ بلیاں پرلے درجے کی گھٹیا کی بچیاں ہیں۔۔۔انھوں نے میرا جینا عذاب کر رکھا ہے۔۔۔ کسی کارپینٹر کو جلد از جلد بلاو اور یہ کھڑکی کا مسئلہ حل کرواو۔''

ڈرائیور فوری بولا ''پہلے یہ بتائیں کہ یہ بلیاں ہیں یا کتیاں؟''

میں نے کہا۔۔ ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ

It is continously raining cats and dogs in my room.

اور تمھیں سوال سوجھ رہے ہیں۔ کتی ہو یا بلی۔۔۔میرا سکون برباد ہو کر رہ گیا ہے۔۔''

جس پر اس نے کہا کہ ''جی ٹھیک ہے_میں کچھ بندوبست کرتا ہوں۔''

شام کو ڈرائیور کا فون آگیا کہ ''باجی کھڑکیوں کی مرمت کرنے والا شخص دو ہفتے بعد آ سکتا ہے وہ کسی ضروری کام سے کاموں کی گیا ہوا ہے۔''

میں نے تنگ آ کر کہا'' اور جو بلیوں کے ناجائز'' کاموں کی'' وجہ سے ہمارا جینا حرام ہو چکا ہے ان کا کیا؟''

خیر بلیوں کی اچانک اور ہنگامی اینٹری دھڑلے سے جاری تھی جس پر فی الحال میں بے بس تھی۔ رات کو اگر باتھ روم کا دروازہ کس کے مضبوطی کے ساتھ بند کر دیا جاتا تو یہ بلیاں باتھ روم میں اس قدر زور سے چلانے لگاتیں کہ اللہ کی پناہ۔ باتھ روم میں ویسے ہی میں آواز بہت زیادہ گونجتی ہے۔ جس کی وجہ سے لگتا کہ لاوڈ سپیکر پہ بیک وقت کئی بلیاں چلا رہی ہیں اور جب تک باتھ روم کا دروازہ کھول کر ان کو نہ نکالا جاتا یہ طوفان بے حد بدتمیزی جاری و ساری رہتا۔

ایک دن والد صاحب نے ایک موٹے تازے بلے کو باہر باغ میں دیکھا تو برجستہ کہا کہ ''اے ساریاں دا پیو اے۔''

علاوہ ازیں میں نے باغ میں ایک انتہائی غمگین شکل کا بلا دیکھا۔ اس کی شکل پر مایوسی و اداسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ تھوڑی تحقیق کی تو پتہ چلا کہ اس کی منکوحہ بلی کسی دوسرے بلے کے ساتھ فرار ہو چکی ہے۔ یقین کریں مجھے اس فرار پر کوئی افسوس نہیں تھا۔ لیکن جو آٹھ بلیاں ہمارے گھر

چھوڑ گئی اس پر میرا غم وغصہ دیدنی تھا۔ مجھے رہ رہ کر بلیانہ محاورے اور ضرب الامثال ''بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنا، دل بلیوں اچھلنے لگا، بھیگی بلی بننا، نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی، کھسیانی بلی کھمباں نوچے'' وغیرہ وغیرہ رہ رہ کر یاد آنے لگے-- لیکن مجال ہے ان بلیوں نے بھی ان محاوروں اور ضرب الامثال سے اثر قبول کرنے کی گستاخی رندانہ کی ہو۔

ابھی آٹھ بلیوں نے رات کے آٹھویں پہر ہمارا ناک میں دم کرر کھا تھا۔ جبکہ میری ذاتی بچیاں بلیوں کی انٹری سے بے حد خوش تھیں اور بارہا مجھے کہتی رہیں کہ ''ماما آپ پریشان نہ ہوں بلیوں پر کی گئی ایک تحقیق کا نتیجہ ہے کہ وہ ٹینشن ریلیز کرتی ہیں''۔

جس پر میں نے کہا کہ ''اور جو میری ٹینشن میں اضافہ ہو چکا ہے اس کی کسی کو کوئی پرواہ نہیں''۔

بالآخر خدا خدا کر کے کارپینٹر صاحب تشریف لائے انھوں نے آکر کھڑکی کا سائز لیا اور دو دن کا وقت مانگ لیا کیونکہ دو دن میں کھڑکی تیار ہو جائے گی اور مطلوبہ جگہ پر فٹ ہو جائے گی۔ یہ دو دن دو سال کی طرح گزرے اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا دو دن بعد بھی کارپینٹر نہ پہنچ سکا اور فون پر کوئی بہانہ کر دیا۔

پانچ دن بعد کارپینٹر پہنچا اور اس نے مضبوط کنڈیوں والی کھڑکی باتھ روم میں فٹ کر دی۔ جس پر مجھے قوی امید تھی کہ اب سکون کا سانس آجائے گا۔

لیکن یہ کیا؟؟؟؟ جیسے ہی رات ہوئی بلیوں نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ شکر ہے کہ کھڑکی نہ کھلی مگر بلیوں نے اس قدر زور سے چلانا شروع کیا کہ خدا کی پناہ---ان کی آواز میں بلا کا غصہ شامل تھا۔

اب پھر میری نیند کی دھجیاں بکھر گئیں اور میں نے باتھ روم میں جا کر زور زور سے کھڑکی بجا کر کسی طرح انھیں بھگا دیا۔

میرا تمام پڑھنے والوں کو یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ بے شک بلی محض شکلاً ہی معصوم ہے۔ ''ان کی معصومیت پر نہ جانا، ان کے دھوکے میں ہرگز نہ آنا''

مشتاق احمد یوسفی کے مزاحیہ مضمون ''اور آنا گھر میں مرغیوں کا'' سے میں نے اتنا اثر قبول نہیں کیا جتنا شدت سے مصنف کا درد محسوس کیا ہے---

آخر میں مرزا غالب کی روح سے معذرت کرتے ہوئے بس اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
اور آنا گھر میں بلیوں کا مسلسل عذاب ہے

☆☆☆☆☆

نیم عدیم نیم ہاشمی گویا عدیم ہاشمی

محترم عدیم ہاشمی سے پہلی ملاقات ''فنون'' کے دفتر میں ہوئی وہ دو بڑے سائز کے اٹیچی ہاتھ سے دھکیلتے ہوئے دفتر میں داخل ہوئے پھر باقاعدہ چھٹکنے کے انداز میں اٹیچی سے جان چھڑانے کے بعد بغل میں دبائے ہوئے بریف کیس کو صوفے پر رکھتے ہوئے، مخاطب ہوئے او یار میں پریشان حال عدیم ہاشمی، تے توں اعجاز رضوی میں نے کہا جی، عدیم ہاشمی بولے یار خالد احمد نے دسیا سی کے کوئی ہووے نہ ہووے او ضرور ہووے گا یار میں نے مرگیا واں، میں نے انھیں پانی پیش کیا، حال چال پوچھا کچھ ادھر اُدھر کی گفتگو ہوئی انھوں نے دوبار بتایا کہ وہ امریکہ سے آرہے ہیں، اتنی دیر میں خالد احمد، ضیا بٹ اور نجیب احمد دفتر میں داخل ہوئے اور ایک بھرپور اور پُرجوش انداز میں بڑی بے تکلفی تقریباً گالم گلوچ کے انداز میں ایک دوسرے سے ملے کچھ دیر بعد کے احمد ندیم قاسمی اور منصورہ احمد بھی تشریف لے آئے۔ عدیم ہاشمی نے پُرجوش انداز میں عادت کے مطابق، میں میں کرتے ہوئے کہا کہ میں ''فنون'' کے دفتر سے ہی امریکہ گیا تھا اور واپس بھی ''فنون'' کے دفتر میں ہی آیا ہوں پھر بے تکلفی سے فرش پر بیٹھ کر بریف کیس سے چابی نکالی پھر اس سے بڑی اٹیچی کھولی پھر اس میں نے ایک چابی نکال کر چھوٹی اٹیچی کھولی پھر اس میں سے بہت سارے ڈن ہل سگریٹ کے پیکٹ نکال کر سب کو دیے میں نے اور منصورہ احمد نے اپنے پیکٹ شکریے کے ساتھ خالد احمد کو پیش کر دیے۔

ہماری مشترکہ غریب پروری نے قاسمی

اعجاز رضوی

صاحب کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے بھی اپنا پیکٹ خالد احمد کو پیش کر دیا، چار پیکٹ ڈن ہل ملنے کی خوشی میں خالد صاحب نے عدیم ہاشمی کو اتنا چھیڑا اتنا چھیڑا کے عدیم صاحب کو کہنا پڑا کہ خالد اب بس بھی کرو، عدیم صاحب اتنے لمبے سفر سے آ رہے ہیں، تو خالد احمد نے جواب دیا، عدیم بھائی یہ کون سا پیدل آ رہا ہے عدیم ہاشمی نے جواب دیا، پھر میں پی آئی اے تے آیا واں تے توں مینوں پیدل ای سمجھ۔

عدیم ہاشمی بولتے تو لگتا جیسے منہ میں کچھ رکھ کر بول رہے ہیں۔ اُن کا قد تقریباً پانچ فٹ سے دو تین انچ زیادہ تھا بازو ذرا کھول کر چلتے قدم اُٹھاتے ہوئے بدن کو ذرا ڈھیلا چھوڑ دیتے۔ انھیں دیکھ کر لگتا جیسے ابھی آئیں گے اور ہتھی پے جائیں گے، مگر وہ ایسے نہیں تھے وہ سامنے والے کو ہمیشہ بہت خوشی سے اوے اوے اوے کہہ کر ملتے اور ہاتھ سے پکڑ کر گلے لگا لیتے۔

خوش جذبہ یا سیت اور غصہ اُن کی شخصیت کا حصہ تھا، وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے کندھے ذرا جھکا لیتے اور ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھتے ہوئے یہ عمل بار بار دہراتے ایک بار بہت سے شعرا خالد احمد کی قیادت میں ایک بڑے ہوٹل میں بیٹھے تھے اور عدیم ہاشمی کی شاعری سن رہے تھے میں عدیم صاحب کی کرسی سے پیچھے دونوں ہاتھ کرسی سے ٹیک لگا کر شاعری سن رہا تھا اور داد دے رہا تھا، کہ اچانک عدیم ہاشمی پیچھے مڑے اور مخاطب ہوئے، یارتوں کی میرے سر تے سوار ہیں۔ میں نے جواب دیا، اے دُنیا اے تسی آخرت وچ میرے منڈھے تے سوار ہونا اے، میرا یہ کہنا تھا کے عدیم ہاشمی نے باقاعدہ زانوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ہائے ہائے، شاہ جی اے وی ٹھیک ہے پھر ایک قہقہہ بلند ہوا اور عدیم ہاشمی ہنستے ہنستے پھر شعر سنانے لگے۔

1970 میں عدیم ہاشمی کا بہت نام تھا، پھر اسی نام وری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے انھوں نے ایک بھرپور عشق کیا جب خفیہ عشق کا شور شرابا زیادہ بڑھا تو انھوں نے پی ٹی وی کی معرفت ویزہ لیا اور امریکہ چلے گئے۔

کچھ عرصہ غائب رہے پھر پتہ چلا کہ وہ الاسکا میں رہائش پذیر ہیں اس حوالے سے خالد احمد کہا کرتے تھے کہ عدیم ہاشمی ایک امیر شاعر ہے یہ الاسکا میں برف کے گولے بیچتا ہے، حالانکہ وہ وہاں فلم کے حوالے سے کچھ کام کرتے تھے اور اسی چکر میں اُن پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا، بقول ان کے وہ بدقسمتی سے بچ گئے، اُن کا دعویٰ تھا

کہ انھوں نے کئی امریکی ٹی وی سیریز میں کام کیا ہے اور فلموں میں بھی کردار ادا کرتے رہے ہیں، دوستوں نے ان کے بیان کو صحیح مانا تو میں نے مذاقاً کہا کہ ہاں اُنھیں نے کئی سیریز میں کام کیا ہے اور سب میں لاش کا کردار ادا کیا تھا، عدیم ہاشمی کا یہ سننا تھا تو فوراً غصہ کا اظہار کیا اور کہا اے بکواس اے، اور پھر خود کو برا بھلا کہنے لگے، اس پر خالد احمد نے کہا یار توں اینا سچ نہ بولیا کر، عدیم ہاشمی کی عادت تھی گفتگو کے دوران کوئی واقعہ گھڑ کر سنا دیتے تھے۔ جب کوئی اعتراض کرتا یا مذاق کرتا، تو کہتے یار میں دل دا مریض آں کجھ خیال کر، وہ اکثر گلہ کرتے کہ میری قدر نہیں ہوئی، حالانکہ میں نے بہت مشہور شعر کہے ہیں جیسے کہ:

بچھڑ کے تجھ سے کسی کا ملن نہ دیکھا گیا
اڑا دیے ہیں پرندے شجر میں بیٹھے ہوئے

....

یہ وہی شعر ہے جس کو ترمیم واضافے کے ساتھ میں نے ندیم صاحب خالد صاحب، نجیب صاحب اور بہت سے شعرا سے سنا ہوا تھا، اور کئی بار کہہ بھی چکا تھا کہ شعر اچھا ہے، مگر رویہ غلط ہے عدیم صاحب کو جب اس بات کا پتہ چلا تو بولے یار میں دل دا مریض آں کجھ خیال کر وہ بہت حساس طبیعت کے مالک تھے، ذرا ذرا سی بات کو بہت دیر تک اور بہت دور تک سوچتے ایک بار وہ مجلس ترقی ادب کے آفس میں بہت پر جوش انداز میں داخل ہوئے ابھی بیٹھے ہی تھے کہ منصورہ احمد کا رویہ دیکھ کر جلد ہی قاسمی صاحب سے اجازت چاہی پھر باہر نکلتے نکلتے منصورہ احمد کا یہ فقرہ ان کے کانوں تک پہنچ گیا کہ آ جاتے ہیں کالے پیلے لوگ...... عدیم ہاشمی فقرہ سن کر رکے مگر پھر باہر آ گئے اور بولے یار مینوں الحمرا چھڈ دے میرا دل بند ہون والا، میں نے مذاقاً کہا، تسی اُتھے جا کے کیڑا دل دا پلک بدلنا اے، انھوں نے غور سے فقرہ سنا پھر ذرا نارمل ہو کر بڑی سنجیدگی سے بولے یار منصورہ دی گل سمجھ تو بار اے، کے آ جاتے ہیں کالے پیلے لوگ......

میں نے حوصلہ دیا اور کہا کہ چھڈو اس گل نوں، بولے نیں تیں یار چھڈن والی گل نہیں، بولے ٹھیک اے کہ منصورہ نے مینوں کالا کہہ دتا، پر یار یہ پیلا بندہ کیہڑا اے، پھر عدیم ہاشمی جتنے دن بھی لاہور میں رہے وہ پیلے بندے کو ہی تلاش کرتے رہے۔

ایک بار محترمہ شبنم شکیل صاحبہ کی جانب سے احمد ندیم قاسمی صاحب کے اعزاز میں ایک

دعوت کا اہتمام کیا گیا، اور فہرست بنا کر لوگوں کو فون کیے گئے اس مہم کا پہلا فون افتخار عارف کو کیا گیا تو انھوں نے فرمایا اگر احمد فراز آئے گا تو میں نہیں آؤں گا، پھر فراز صاحب نے فرمایا اگر افتخار عارف ہوا تو میں نہیں بیٹھوں گا جبکہ عدیم ہاشمی نے خود فون کیا اور کہا اگر احمد فراز اور افتخار عارف ہوئے تو میں نہیں آؤں گا۔

محترمہ شبنم شکیل صاحبہ نے اس کا ذکر قاسمی صاحب سے کیا تو انھوں نے فرمایا مگر فہرست میں تو عدیم ہاشمی کا نام ہی شامل نہیں، پھر بھی پوچھ لیتے ہیں، ندیم صاحب نے ڈائری نکالی عدیم ہاشمی کا نمبر دیا، میں نے بات کی تو انھوں نے کہا یار میں ان وائٹ نہیں۔ میں نے رعب پان واسطے فون کیتا سی، عدیم ہاشمی کو رعب ڈالنے کا بہت شوق تھا، جب کوئی ان کے رعب میں نہیں آتا تو پھر یہ ترلا ڈال دیتے۔ ان کی موجودگی میں جب کوئی شخص ان کے قصے سناتا تو وہ بہت خوش ہوتے، اور ہنستے ہنستے کہتے او یار میتوں یاد آیا، اور سنا، او او حفیظ والا قصہ پھر کہتے ایک بار میں احمد ندیم قاسمی صاحب کے کہنے پر حفیظ سے ملنے ان کی کوٹھی پر گیا اور کوٹھی کے دروازے کو زور زور سے کھڑکایا تو اوپر والی منزل سے حفیظ صاحب نے جھانکا اور ناگواری سے مخاطب ہوئے کون اے میں نے کہا میں عدیم ہاشمی، احمد ندیم قاسمی نے بھیجا ہے، حفیظ صاحب نے فرمایا فوراً آجاواں پھر کچھ دیر بعد نیم عریاں حالت میں دروازے پر آگئے اور فرمایا حیران نہ ہو، میتوں کوئی نوجوان جلدی دا کہہ دے تے میں کپڑے نہیں پاندا، تینوں ویکھ کے لکدا اے، میتوں کپڑے پا لینے چاہیدے سن پھر عدیم قصہ سنا کر ہنستے ہوئے کہتے، یار دسو حفیظ صاحب دی نظر ٹھیک نہیں تے میرا کی قصور اے۔

عدیم ہاشمی کی حس مزاح ان کی حساس طبیعت کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی، وہ اپنے بارے میں اپنی شاعری کے بارے میں ہمیشہ فکرمند رہتے، اور اکثر کہا کرتے یار بارہ پندرہ سال گزر گئے نیں پر پاکستان دا ادبی ماحول ذرا نہیں بدل سکیا۔ پاکستانی ادبی ماحول کو بدلنے کے لیے انھوں نے کئی بار امریکہ سے پاکستان کا سفر کیا، اور آخر اسی تبدیلی کی خواہش کے ساتھ 2001 میں انتقال کر گئے، ان کی غزلیں مکالماتی شاعری، اور ادب سے وابستگی ہی ان کی پہچان تھی۔ اور وہ پہچان موجود ہے۔

سو عدیم ہاشمی بھی موجود ہے۔

☆☆☆☆☆

لحد تیار ہے

مری بہنو!
مرے سینے میں تو دل کی جگہ پتھر دھڑکتا ہے
مرے حصے کے آنسو بھی، تمہارے نام
نکلے ہیں
مری بہنو!
اسی انداز سے روؤ، مگر کچھ زور سے روؤ
کہ اس ماتم کی آوازیں، مرے پتھرائے کانوں کو
نہ جانے کیوں بھلی معلوم دیتی ہیں
کوئی بتلائے، اس سینہ زنی، اس سینہ کوبی سے
مجھے کس نوع کی تسکین ملتی ہے
مرے سینے میں تو دل کی جگہ پتھر دھڑکتا ہے
تمہارے آنسوؤں کے ساتھ یہ دل بھی نہ بہہ جائے
لحد تیار ہے لیکن، ابھی کچھ دیر میرے گھر میں
بوڑھی برکتوں کا ابر رہنے دو
لحد تیار ہے، بیٹوں کی آنکھیں خشک ہیں،
لوگوں کو جلدی ہے
کہ میرے غم گسار اپنے بہت سے کام
ادھورے چھوڑ آئے ہیں

تمھی سوچو! جنازے کون تنہا لے کے
قبرستان پہنچا ہے
مری بہنو!
تم اپنے سر، مرے سینے سے ٹکراؤ
کہ اس سینے میں بھی دل کی جگہ پتھر دھڑکتا ہے
مرے آقا!
مری ماں نے اذانوں کے جلو میں مجھ کو چھوڑا ہے
مرے آقا!
مری ماں مغربوں کے پالنے والے کا
شفقت ریز سایہ تھی
مرے آقا!
یہ بوڑھی ہڈیاں اولاد کی چاہت کی چکی میں بڑی محنت
سے پس کر بھربھری ٹھہریں
مرے آقا!
یہ بوڑھی انگلیاں راتوں کو سپنے کاڑھتی تھیں
تا کہ دن نکلے تو ان کے رنگ
میرے روپ میں تعبیر ہو پائیں

مرے آقا!

یہ آنکھیں صرف میری راہ تکتی تھیں

سبھی گلیاں مرے گھر کی طرف آتی تھیں

لیکن میں نہ آتا تھا

مرے آقا!

بھرے گھر میں، فقط یہ بوڑھی آنکھیں

میری آنکھیں تھیں

کفن کی سرسراہٹ تک پپوٹے کھول دیتی ہے

یہ آنکھیں بار بار اس طرح کھلتی ہیں

کہ گویا ان میں اب تک نور باقی ہے، یہ مجھ کو دیکھ

سکتی ہیں

مرے آقا!

یہ لب وہ پھول سے لب ہیں

کہ جو اپنی دعاؤں کی مہک کو روز اک بالکل نئی

لیکن سبق فرما کہانی کے بدن میں یوں بسا دیتے

کہ یہ خوشبو مرے کانوں کے رستے

جان و تن کے آخری تاریک گوشے تک پہنچ جاتی،

مرا ہر موئے تن یکسر معطر کر کے سو جاتی

کہ میں جب صبح دم اُٹھوں

تو یہ خوشبو مرے دل کی مہک بن کر

مجھے مہکائے رکھے اور دن

نیکی بدی کے درمیاں باریک سے خط پر

بہت ہموار قدموں سے گزر جائے

مرے آقا!

یہ پھولوں سے بھی نازک ہاتھ میری ڈھال تھے

ان میں دعا کے رنگ کھلتے تھے،

یہ رنگ ان بوڑھے ہاتھوں سے دعا بن کے

اڑتے تھے

مرے آقا!

یہ خالی ہاتھ اک اللہ پر کامل توکل کی توانائی سے

اُٹھتے تھے

مرے آقا!

میں جو کچھ ہوں، مرے مولا کی رحمت، آپ کی الفت

اور اس کے بعد میری ماں کی محنت

اور شفقت کا نتیجہ ہے

مرے آقا!

مجھے رب دو عالم پر توکل،

آپ کے کردار کے سائے میں رہنے کی تمنا

اور انسانوں کی عزت اور دنیا میں فقط

محنت کے رستے آگے بڑھنے کے سبق،

مجھ تک مری ماں کے وسیلے سے ہی پہنچے ہیں

خالد احمد

مرے آقا!

میں اپنے پالنے والے سے پہلے، آپ کے
بابِ شفاعت پر یہ بوڑھی ہڈیاں لے کر کھڑا ہوں
تاکہ میں اپنے وسیلے کے لیے اکمل شفاعت کی ضمانت
مانگ لوں
اور آپ کی اکمل شفاعت کے بھروسے پر
میں اپنے پالنے والے سے اپنی ماں کی خاطر جنّت
الفردوس کا طالب بنوں
اپنے وسیلے کے لیے
ربِّ محبت سے مکمل مغفرت چاہوں

مرے آقا!

اجازت دیں، لحد تیار ہے، لوگوں کو جلدی ہے
کہ میرے غم گسار اپنے بہت سے کام ادھورے
چھوڑ آئے ہیں

مرے آقا!

اجازت دیں، میں اپنی ماں کو مٹی میں ملا دوں
آپ کو اپنے بہت پیارے چچا کا واسطہ ہے
حضرت حمزہؓ کی بے پایاں وفا کا واسطہ ہے
میرے آقا! مجھ کو مت دیکھیں کہ میں نے
اپنی بوڑھی ماں کی بوڑھی چھاتیوں سے خوں نچوڑا ہے
مگر مجھ کو اذانوں کے جلو میں اس نے چھوڑا ہے

بے حسی کے بیابان میں اذان

گھروں کے
ملبے پہ بیٹھے ہیں
ایسے اہلِ غزہ
کٹے درختوں
کے ڈھیروں پہ
جس طرح پنچھی
زماں مکاں بے خجل
اپنی سائبانی پر
ہوا ملال کی ماری
بنی ہوئی ہے دھواں
غبارِ یاس نہیں ہے مگر
کسی رُخ پر
جبیں جبیں پہ
عجب عکسِ سرفرازی ہے
کہ سانس سانس
خدا کی رضا پہ راضی ہے
کہ آنکھ آنکھ میں
اک شانِ بے نیازی ہے
نہ کوئی نالہ وشیون
نہ کوئی آہ وفغاں
نظر نظر میں فروزاں ہے
ایک اور جہاں
میانِ قہر وقیامت بھی
حوصلے ہیں جواں
کیے ہوئے ہیں
فراعینِ عصر کو حیراں
کہ دے رہے ہیں
بیابانِ بے حسی میں اذاں

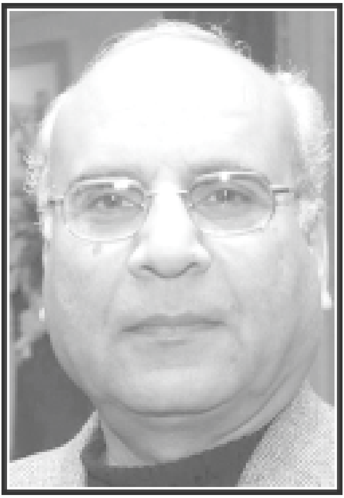

جلیل عالی

اور دسمبر چلا گیا (عرش صدیقی کی نذر)

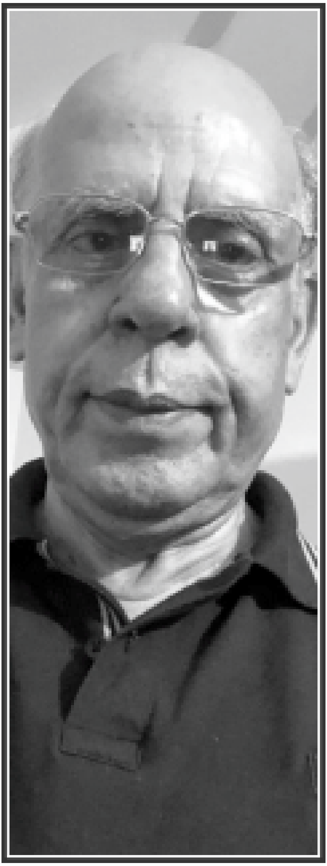

سیّد افسر ساجد

"اُسے کہنا دسمبر آ گیا ہے"

دسمبر نام ہے سوئی ہوئی خواہش کی حُرمت کا

دسمبر نام ہے اُلجھی ہوئی سوچوں کی غربت کا

دسمبر درد کے بیدار ہونے کا مہینہ ہے

دسمبر منتشر ہو کے بکھرنے کا قرینہ ہے

دسمبر میں ہمارے خواب بھی روئی کے گالوں کی طرح

اُڑ کے فضا میں پھیل جاتے ہیں

دسمبر میں زمانے کے گزرنے کا

لہو کے سرد ہونے کا

اُسے کہنا دسمبر جا چکا ہے، تم نہیں آئے

اُسے کہنا دسمبر جا چکا تو پھر نیا اک سال آئے گا

کسے معلوم اس میں کون جیتا ہے؟

اے دستِ ہُنر، تُو نے فقط لفظ جڑے ہیں
سو پھول پسِ حرف، تہِ سطر پڑے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غرور

مہ و سال پر نہ غرور کر
تجھے اصلیت کا پتا نہیں
تجھے زندگی جو عطا ہوئی
وہ محیط تین دنوں پہ ہے
ترا عہدِ رفتہ ہے ایک دن
جو گزر گیا
کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا
ترا آنے والا جو کل ہے
وہ بھی ہے ایک دن
اسے عمر میں نہ شمار کر
کہ وہ آئے بھی تو یقیں نہیں
تجھے ذی حیات ہی پائے گا
ترے پاس ایک ہی روز ہے
جسے آج کہتے ہے نکتہ داں
تری دسترس میں
کچھ اور اس کے سوا نہیں
ترا کُل اثاثہ ہے ایک دن
اسے غفلتوں میں گنوا نہیں
مہ و سال پر نہ غرور کر
تجھے اصلیت کا پتہ نہیں

گلزار بخاری

میں کسی دن بھی لوٹ آؤں گا

میں کسی دن بھی لوٹ آؤں گا
دُوریوں کی اُداس راتوں میں
جاں گسل یاسیت کی گھاتوں میں
اِک نویدِ نشاطِ وصل کے ساتھ
موسمِ گُل کی تازہ فصل کے ساتھ
دوپہر کی خنک ہوا کی طرح
جُھومتی جھامتی گھٹا کی طرح
دِل سے اُٹھتی ہوئی صدا کی طرح
رَب سے مانگی گئی دُعا، کی طرح
آج کے دِن سے، میرے آنے تک
نئی دنیا، نئے زمانے تک
خواب گہ کا چراغ جلتا رہے
آرزو کا خُمار پلتا رہے
مجھ سے مِلنے کو دل مچلتا رہے
وقت کی گرم و سرد راہوں میں
اپنے قول و قرار میں رہنا
عمر بھر میرے پیار میں رہنا
آہن و سنگ سے تراشے ہوئے
بازوؤں کے حصار میں رہنا
میرے ہی انتظار میں رہنا
میں کسی دن بھی لوٹ آؤں گا

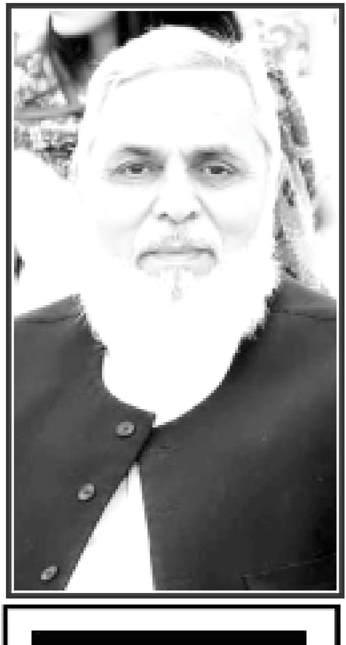

محمد انیس انصاری

کہرے کے سکے

دُھند کا کارواں
رات کو پار کرتا ہوا
صبح کی چوٹیوں پر اترنے لگا
آبشاری جنوں
گھورتا ہے مری اَن تھکی بارشوں کو
جو برسی نہیں ہیں
کوئی زنگ سا گفتگو میں چمکتا
کہ بادل بھی سہما ہوا
بادباں سے لپٹنے لگا ہے
ہوا اس پہ ناراض ہے
رات، دن، خواب کیوں کشتیوں میں اُترنے لگے!
دیکھتے دیکھتے
اک خمار آفریں رنگ ہر سو بکھرنے لگا
اور ستارے کہ گرنے لگے پھر
بھکاری کے کشکول میں
کھنکھناتے ہوئے
بھیگے بھیگے دسمبر کی جیبوں میں
کہرے کے سکے
کسی دھوپ کو گنگناتے ہوئے

حامد یزدانی

نظم

ہمارے سامنے حدِ نظر تک ریت پھیلی ہے
سرابوں کا سمندر ہے
سراسیمہ نگاہوں سے
جدھر بھی دور سے دیکھیں
ادھر پانی ہی پانی ہے
اگر نزدیک جائیں تو سراسر آنکھ کا دھوکا
ہمارے پاس جینے کو
لہو کے گھونٹ پینے کے سوا کچھ بھی نہیں باقی
عجب بیم و رجا کی کیفیت نے گھیر رکھا ہے
کہاں وہ چاہِ یوسف ہے
کہ جس کی جستجو میں ہم نے اتنی خاک چھانی ہے
ہمیں اس ریت پر اب اور اتنی دیر چلنا ہے
کہ جب تک مر نہیں جاتے
زمیں میں گڑ نہیں جاتے
ہمارے پاؤں پیاگوں سے بالکل جھڑ نہیں جاتے
ہمارے ہر طرف وحشت
وہی خوئے بیابانی
لق و دق پیاس کے صحرا میں کوئی ابر کا ٹکڑا
دکھائی کیوں نہیں دیتا
ہماری چشمِ نم سے ریت کے ذروں نے لگتا ہے
مزہ پانی کا اس دنیا میں پہلی بار چکھا ہے
ہمیں کیوں ایسا لگتا ہے
جہاں پر خاک اڑتی ہے
وہاں بادل نہیں آتے
ہمارے پاؤں سے لے کر فلک تک خاک اڑتی ہے
یہاں بادل نہیں آتے
مرے مالک
تمہاری ریت پر تو، ایڑیاں ہم نے بھی رگڑی ہیں
رگڑ کر ایڑیاں ہم نے بھی، اپنی، جان دے دی ہے
پیمبر تو نہیں تھے ہم جنھیں زندہ اٹھاتا تو
ہماری گریہ زاری سے
ہماری آہ و زاری سے
کوئی چشمہ نہیں پھوٹا
یہ چشمہ پھوٹتا کیسے
ہمارے قبضۂ قدرت میں کوئی معجزہ کب ہے

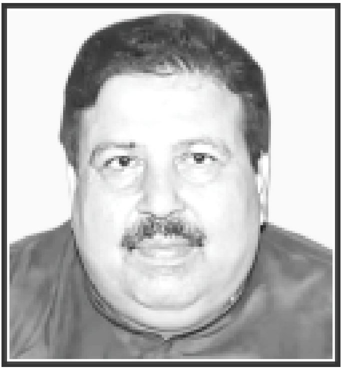

مسعود احمد

گمانوں کے گرداب میں راستی

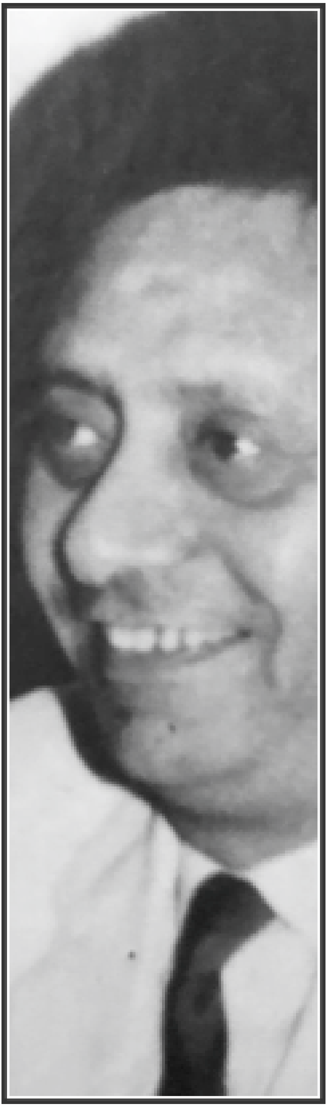

فیاض تحسین

علم کے راستوں پر بکھرتے ہوئے
حرف پڑھتے ہوئے
لفظ لکھتے ہوئے
وہم کی وادیوں میں اُترتے ہوئے
جب لیا نام اس کا یقیں آ گیا
سامنے احمدِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مُرسلیں آ گیا

میں کہ اپنے مراسم کے صحرا میں تھا
آبلہ پا
گمانوں کے گرداب میں
رقص بے سود تھا
ہر شجر، ہر حجر میرا معبود تھا
ہر سفر بے یقینی کا مقصود تھا
تب زباں پر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام آ گیا
اُس پہ ایمان یوں میرے کام آ گیا
سب خُداؤں کی یلغار سے بچ گیا
اک خُدا کا مجھے جب پیام آ گیا

سامنے کون ہے؟

کچھ نہیں جانتا
سامنے کون ہے؟
صرف اتنا بتایا گیا ہے مجھے
کوئی ہے اور بس
لوگ کہتے ہیں ساری دعاؤں صداؤں کو سنتا ہے وہ
اس سا کوئی نہیں
وہ اکیلا ہے، تنہا ہے، بے مثل ہے
گویا اس کی شباہت بھی کوئی نہیں
سوا سے کیسے دل میں بسائے کوئی
اپنے خوابوں میں کس طرح لائے کوئی
نیتیں ہوں، ارادے ہوں یا اور کچھ
اس کو معلوم ہے
اس کو معلوم ہے؟
پھر دعاؤں، صداؤں کا کیا فائدہ
جو دلوں میں ہے گر اس کو معلوم ہے
ہاں دعاؤں صداؤں کا ہے فائدہ
مشکلوں میں اسے جب بلائیں گے ہم
کچھ نہ کچھ تو اسے جان پائیں گے ہم
ورنہ جو کچھ ہے اس کو تو معلوم ہے
ویسے محسوس میں نے بھی اکثر کیا ہے کہ "وہ" ہے نہ جو
جانتا ہے سبھی
پھر بھی خاموش ہے
سو بڑی بات ہے
صبر کی انتہا!
ضبط کی انتہا!
اس کو معلوم ہے!
پھر بھی خاموش ہے!
گو وہ ہم سا نہیں
ہم تو تھوڑے سے معلوم پر ہاؤ ہُو کا وہ طوفان
برپا کریں گے کہ بس
پر وہ خاموش ہے
تالیاں، تالیاں
روز جاتا ہوں میں اس کی دہلیز پر
کچھ دعائیں لیے
کچھ صدائیں لیے
کچھ بلائیں لیے
نامناسب، مناسب سی کچھ خواہشیں
التجائیں لیے
کہتا رہتا ہوں میں
سنتا رہتا ہے وہ
میری تکرار کو
ٹوکتا ہی نہیں
روکتا ہی نہیں
کہتا رہتا ہوں میں
دل کی باتیں سبھی
وارداتیں سبھی
اور گھاتیں سبھی
جانے بوجھے بنا
سوچے سمجھے بنا
سامنے کون ہے؟
سامنے کون ہے؟

علمدار حسین

''سڑک کنارے لگا خیمہ'' (نثری نظم)

میں
کسی کی کہانی میں
ہمیشہ کے لیے ٹھہرنے والا نام نہیں ہوں
میں وہ حاشیہ ہوں
جسے کتاب بند کرتے وقت
کوئی انگلی روک کر دوبارہ پڑھ لے
میں ریت پر لکھی تحریر ہوں
جسے وقت کی موج مٹا تو دیتی ہے
مگر نمی دیر تک
قدموں میں باقی رہتی ہے
میں کسی کے آسمان پر
ہمیشہ چمکنے والا ستارہ نہیں
میں وہ شہاب ہوں
جو جل کر گزر جائے
مگر اندھیرے کو
یہ احساس دے جائے
کہ روشنی ممکن ہے
میں عارضی ہوں
جیسے سفر میں
سڑک کنارے لگا خیمہ
جہاں مسافر
تھکن اتارتا ہے
سانس بحال کرتا ہے
اور پھر
نئے حوصلے کے ساتھ
آگے بڑھ جاتا ہے
میں وعدۂ ہمیشگی نہیں
میں حسنِ موجودگی ہوں
میں ٹھہراؤ نہیں
میں معنی خیز ملاقات ہوں
اگر میں کسی کی زندگی میں
زیادہ دیر نہیں ٹھہرا
تو اس کا دکھ نہ کرنا
میں وہ موسم ہوں
جو پورا سال نہیں رہتا
مگر
زمین کو یاد دلا جاتا ہے
کہ خوشبو کیا ہوتی ہے
اور ہاں
جب تم اپنی راہ پر آگے بڑھو
اور پیچھے مڑ کر دیکھو
تو مجھے مت ڈھونڈنا
میں وہاں نہیں ہوں گا
لیکن تمہاری رفتار میں
میری دی ہوئی ہمت ضرور ہوگی

سید فرخ رضا ترمذی

ہونٹ دیکھ سکتے ہیں

لفظوں کو بے لباس مت کرو
ورنہ یہ تمھیں ننگا کر دیں گے
اور تم پھر
اپنا آپ بھی نہ پہن سکو گے
بہتر ہے اندر کی آنکھیں
اندھی کودو
اور باہر کی آنکھیں
رنگین چشموں کے پیچھے گروی رکھ دو
بچو ان لوگوں سے
جو اندر کی جنت، دوزخ تک دیکھ سکتے ہیں
نیکیوں کی فصل
بدی کے پانیوں سے
خوشبودار پھول نہیں کھلا سکتی
مگر
قبرستانوں میں بھی تو پھول کھلتے ہیں
اداس اور اجڑے ہوئے لوگوں کے پاس
معطر لفظوں کے گلدستے ہوتے ہیں
مگر ہم ان کے پرانے کوٹ کے کالر میں
بسی ہوئی خوشبو محسوس نہیں کر سکتے
ہنسنے والے ہونٹوں پر بھی
پپڑیوں کی تحریریں
ہونٹ ہی پڑھ سکتے ہیں
مگر تلخ زبانیں
کڑے لفظ اگلتی ہیں
ان کو سننے والے کان بہرے ہو جاتے ہیں
تمھیں کیا خبر
ہونٹ وہ کچھ دیکھ سکتے ہیں
جو آنکھیں پڑھ نہیں سکتیں

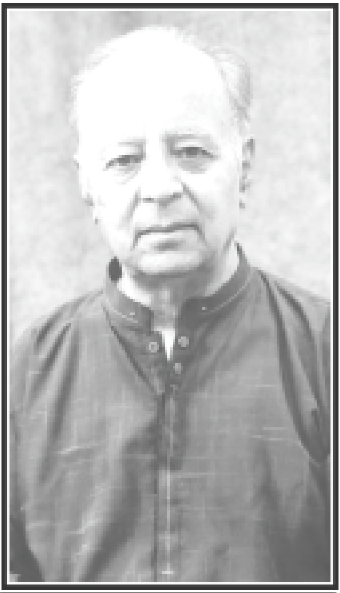

سمیع اللہ عرفی

امن [نثری نظم]

خالق آرزو

امن وہ معصوم بچہ ہے جسے
متحدہ اقوام کے کچھ تجربوں نے
بوڑھا کر دیا ہے
اب یہ ننھا پیارا بچہ اپنے جسمِ ناتواں کو ساتھ لے کر
سہما سہما
چھپا پھرتا ہے
بے آباد شہروں، بستیوں میں
جنگلوں میں
کوہساروں کی پُرپیچ راہوں میں
کہیں ایورسٹ کی چوٹیوں پر
کہیں سمندر میں
یہ درندوں سے نہیں ڈرتا
اس نحیف و ناتواں کو آدمی کا خوف ہے

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

چاک داماں کیا ہوا؟ وہ حشر ساماں کیا ہوا؟
اے بیاباں! وہ غبارِ کوئے جاناں کیا ہوا؟

ڈیجیٹل ایج کے دکھ

تمہاری سوچ کی فریکوئنسی مجھ سے نہیں ملتی
تمہارے دل میں میری بابت
منفی سوچوں نے یوں گھر کر لیا ہے کہ
میری ہر مثبت بات بھی تمہیں تلخ لگتی ہے
تمہارے رویے کو کیا نام دوں؟
حیرت زدہ ہوں
محبت نہ تو ریاضی کا کوئی سوال ہے
اور نہ ہی الجبرا کی اکویشن
جسکا فارمولا ہندسوں میں سمجھایا جا سکے
اسکو سمجھنے کے لیے جو دل اور احساسات
چاہئیں شاید
اس ڈیجیٹل دور میں ناپید ہیں
ہوسکتا ہے آرٹیفیشل انٹیلیجنس جلد اسکا بھی
حل ڈھونڈ نکالے
لگتا ہے جلد یا بدیر
دل بھی ایک کلک سے آباد ہو پائیں گے
خواب ناممکنات میں نہ رہیں گے اور
زندگی کو مصنوعی سہاروں کے ساتھ جیا جا سکے گا
جب انتظار کی مدت کو ہم خود طے کر پائیں گے
چلتے پھرتے مشینی پتلے
احساسات سے عاری دل لیے
یونہی ابد کی طرف رواں رہیں گے
اور انکی زندگی ایک کلک میں قید

نائلہ راٹھور

شام

شام اتر رہی تھی
میں دیکھ رہی تھی
اپنی سنہری رنگت پہ شام
کیسری رنگ مل رہی تھی
سب لڑکیاں جو ساتھ کھیل رہی تھیں
کھلونے اٹھائے
اپنے گھروں کو جا چکی تھیں
میں کیکروں کے بیچ کھڑی
شام کو اُترتے دیکھ رہی تھی
خوف گلے میں آ کے ٹھہر گیا تھا
میرے گھر کو کون سا رستہ جا رہا تھا
میری گلی کس موڑ سے نکل رہی تھی
میں تنہا کھڑی سہیلیوں کے پیروں کے نشان
دیکھ رہی تھی
میرے گھر کو جانے والی گلی نہیں مل رہی تھی

بشریٰ شیریں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گوہرِ معنی کہاں ؟ تُو کس لیے خالد
بحرِ سخن لہر لہر چھان رہا ہے

''ہم دلبری کرتے رہے''

وقت ہے کہ تھمتا ہی نہیں
عروج وزوال کا لامتناہی سلسلہ
فلسفہ ہو کہ نفسیاتِ انسانی
گنجلک دھاگوں کی بوسیدہ سویٹر

خود پسندی کا بھاری طوق
گلے کی رگوں کو لہولہان کر گیا۔۔۔

اور۔۔۔
آج ہم اس سے ہم کلام ہوئے
سہمے سہمے انداز میں
پریشانی کے عالم میں
جانے انجانے اس سے کیا کہہ گئے......

حسنِ جاناں، رشکِ قمر
سیاہ، دراز زلفیں
پلکوں کے نیچے
شرم وحیا میں لپٹی آنکھیں

ہم اس سے نظر نہ ملا سکے
نظر جمائے دیر تک اسے تکتا رہے
اور خالق کی تخلیق کے گن گاتا رہے
مگر یہاں معاملہ کچھ مختلف تھا۔۔۔

ہم ٹھہرے حسن کے پجاری
وہ فلسفے کی شیدائی
ہونے اور نہ ہونے کی بحث
آزادی کی تمنا
اور
بند دروازوں کو کھولنے کی جستجو

اک نظر لبوں پہ ٹھہرتی
دوسری چاہِ زنخدان میں غوطہ کھاتی
کبھی تنہائی پر سوال
کبھی نظر اندازی پر انگلی اٹھتی
کبھی یہ دنیا چھوڑ جانے کا افسوس۔۔۔

ہم بتِ طناز کا عکس تراشتے ہوئے
جسم وجاں کے خدوخال
درست کرنے میں الجھے رہے
انہیں کچھ کر گزرنے کی خواہش تھی
ہم عبث دلبری کرتے رہے
وہ خود کو تلاش کرتے رہے۔

شبیر آکاش

دن کا آنسو

انوار انجم

حیران ہوں رات کی سیاہی
نے کیسے حواس اُڑا دیے تھے
انجام سے آشنا تھے دونوں
ہر بھید نگاہ میں تھا لیکن
احساس کی سطحِ صاف پر بھی
ہر سمت نشان پڑ گئے تھے

اس زیست کے مُختصر سفر میں
جو پاؤں بھی نارِوا پڑا ہے
ہر اک کے لیے بصد ندامت
خاموش ہوں اور اپنے دل میں
بخشش کی طلب لیے ہوئے ہوں
لیکن یہ گناہ سحر آثار
اس کی بھی اگر کوئی سزا ہے
تو ایسے نشے میں وحشتِ بدن کو
یا رب وہ سزا ضرور دینا

صدائے لایقینی

میں اک گم گشتہ دستک
اک صدا
جو ہے پہاڑوں کی سیہ لب بستگی کے غار میں محبوس
اک ایسی تگ و دو کے سفر میں
جس کا کوئی موڑ ہے، منزل نہ رستہ ہے
جو اک فانی لہر بن کر پٹختی ہے سرِ ساحل
زمانوں کی تہوں میں قید
ان یادوں کے ملبے سے
ابھرتی ہے مری آواز
اور ہر گونج کے اندر
تمھارے نام کی اک بازگشتِ لایقینی ہے

کہ جیسے خواب کی تعبیر
اپنے ہی تذبذب میں
کوئی پرہول سناٹا
سلگتی ریت پر ٹھہری ہوئی اک پیاس کی صورت
اسی منبع کی جانب لوٹ جانے کی تمنا میں
جہاں وہ گم شدہ دستک
پہاڑوں کی سیہ لب بستگی کے غار میں اب تک
کسی پیاسے تذبذب کی طرح سکتہ
بداماں ہے

ایم اے کاظم

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

کیا کہوں شہرِ غزالاں کبھی دیکھا ہی نہ تھا
جانِ جاں، میں نے یہ زنداں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

تزئین و آرائش [نثری نظم]

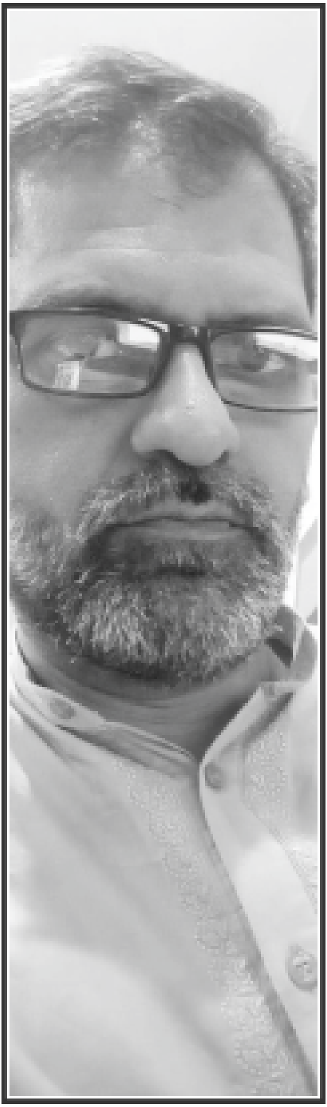

یوں منہ نہ موڑو
واہموں سے باہر نکلو
سبز رُتوں کی
رکھوالی کے لیے
دل کے مکان میں
گمان کو پلنے سے روکو
آنکھیں کھولو

گلشن کی آبیاری کے لیے
تعلقات کی مضبوطی کے لیے
بے مقصد سی بات کو،
ترتیب کے ساتھ
مانوس الفاظ میں بولو

شرم و حیا کے پیکرو!
نیکی کو راز بناؤ
بدی کو نہ پالو
حقیقت کو ہرگز نہ جھٹلاؤ
نفس کی سرکشی
میدانِ عمل میں سرخروئی کے لیے
صالحین کے نقشِ قدم پہ چلتے جاؤ
آنکھیں کھولو
آئینے کے سامنے بولو!

محمد عبداللہ

تنہا سڑک

تنہا سڑک پر چلتے ہوئے
میرے ساتھ کوئی شرکت نہیں تھی
اور نہ کوئی راہ نما
صرف ایک خلا تھی
جس نے کاروباری لباس پہنا ہوا تھا
ایک اور سرگوشی، شاید وضاحت کا حصہ
جو مجھے سانس لینے دے رہی تھی
پچتا ہوا، یا شاید صرف ٹھہرا ہوا۔

مجھے یاد آیا ایک دن
کہ کسی نے کہا تھا
تاریخ میں رہنے کے لیے
کسی کو کسی نہ کسی وقت
اپنا حصہ دینا پڑتا ہے
اور میں نے سوچا
کہ شاید یہ تنہا سڑک بھی تاریخ کا حصہ ہے
کیونکہ ہر قدم ایک حرف بن جاتا ہے
اور ہر حرف ایک جادو۔

سڑک کے کنارے ایک پرانا پل
جو کسی وقت اپنے اندر پلٹتا تھا
اور وہ چیزیں جو پل سے گزر کر
ہوا میں تحلیل ہو جاتی تھیں
اب نظریں جمع کرتی ہیں
اور مجھے دیکھتی ہیں
جیسے میں کوئی پرندہ ہوں
جو کبھی واپس نہیں آتا

میں اس تنہا سڑک پر
اپنے بارے میں سوچتا
مجھے خوف بھی لگتا اور امید بھی
کیا میرا راستہ اسی طرح
موسم کے ساتھ بدل جائے گا
یا میں خود راستہ بدل دوں
اور سڑک مجھے نہیں چھوڑے گی؟

سڑک کی لپیٹی ہوئی گلیاں
مجھے اپنی لپیٹی ہوئی یادیں دے دیتی

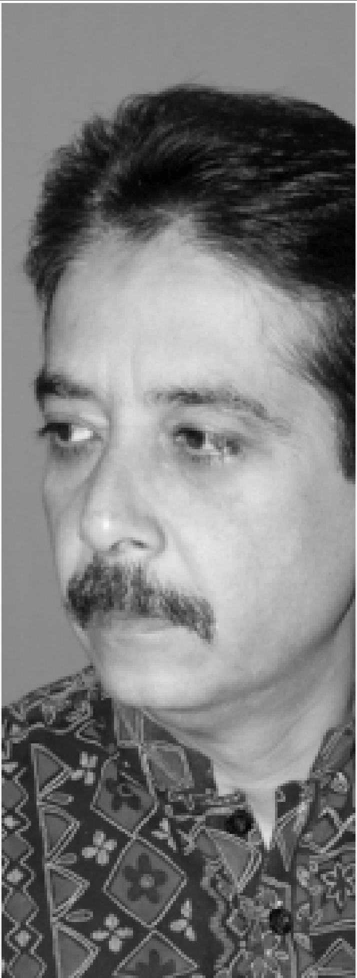

نعمان منظور

ایک ایک لمحہ، ایک ایک پُرانی گواہی
اور میں انھیں اپنے اندر رکھ کر
ایک نئی سڑک کھینچتا ہوں
جس کا نقش اس سے بھی زیادہ لامحدود ہو۔

آخر، تنہا سڑک مجھے بتاتی ہے
کہ ہر انسان کی زندگی
ایک ایسی سڑک ہے
جو نہ کبھی مکمل ہوتی ہے
نہ کبھی ختم ہوتی ہے
بلکہ ہمیشہ سفر کی طرح
اپنے اندر نئی تصویریں رکھتی پھیلاتی ہے
اور ہم، قدم قدم پر
ان کے اندر خود کو ڈھونڈتے

یہی سڑک، یہی سفر
یہی تنہا دنیا
اور یہی میرے اندر کا باغ۔

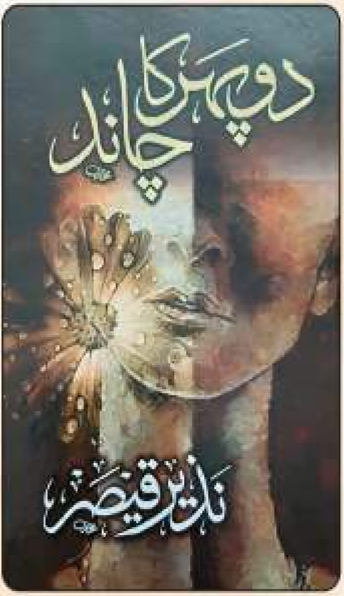
دوپہر کا چاند
نذیر قیصر

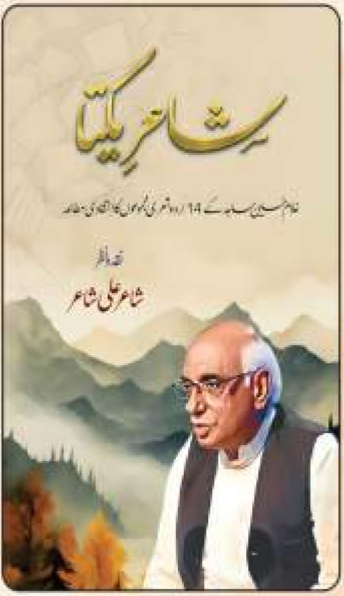
شاعرِ یکتا
نقد و نظر
شاعر علی شاعر

میلانات
مضامین
ڈاکٹر شاہد اشرف

کوئی دیکھتا

تشبیب
خالد احمد
ایک مٹھی ہوا
خالد احمد
جدید تر پاکستانی ادب
خالد احمد
پہلی صدا پرندے کی
خالد احمد
خالد احمد
دراز پلکوں کے سائے سائے
خالد احمد
خالد احمد